اقبالیات

کوڈ نمبر 303   انٹر میڈیٹ   یونٹ 18-1

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔ اسلام آباد

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ایڈیشن .... چہارم

اشاعت بارہ 2017ء

تعداد اشاعت 6000

قیمت 215روپے

نگران طباعت .... مینجمنٹ کمیٹی برائے پی پی یو

طابع .... 786.COM پرنٹر اسلام آباد

ناشر .... علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

کورس ٹیم

چیئرمین　　پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض

تحریر

پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	ریٹائرڈ پروفیسر شعبہ اردو، اورینٹل کالج، لاہور
پروفیسر ڈاکٹر صدیق جاوید	ریٹائرڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور
پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم	ریٹائرڈ پروفیسر گورڈن کالج، راولپنڈی
پروفیسر ڈاکٹر انور محمود خالد	ریٹائرڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج، فیصل آباد
پروفیسر مرزا رفیق بیگ	ریٹائرڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج اصغر مال، راولپنڈی
پروفیسر محمد جہانگیر عالم	ریٹائرڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج، جھنگ
پروفیسر حسن سجاد سید	ریٹائرڈ پروفیسر فیڈرل گورنمنٹ کالج نمبر 1، اسلام آباد

پروفیسر نظیر صدیق شبلی	ریٹائرڈ پروفیسر شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
پروفیسر نظیر صدیقی	ریٹائرڈ پروفیسر شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض	سابق پروفیسر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر رحیم بخش شاہین	سابق پروفیسر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

نظر ثانی ایڈیشن اول	پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض
	پروفیسر ڈاکٹر رحیم بخش شاہین
نظر ثانی ایڈیشن چہارم	ڈاکٹر محمد اکرم شعبہ اقبالیات
تدوین	بشیر محمود اختر
	سلیمان مسعود اختر
ٹی وی پروگرام	امر جلیل قاضی
ریڈیو پروگرام	خلیل انصاری
کورس رابطہ کار	ڈاکٹر محمد اکرم شعبہ اقبالیات

فہرست

کورس کا تعارف

یونٹ نمبر 2-1 سوانح اقبال 13

یونٹ نمبر 3 تصانیف اقبال 79

یونٹ نمبر 5-4 خطوط اقبال بنام قائداعظم 149

یونٹ نمبر 6 منظوم مکالمے 209
(ایک پرندہ اور جگنو۔ چاند تارے)

یونٹ نمبر 7 اقبال اور نئی نسل 227
(خطاب بہ جوانانِ اسلام۔ ایک نوجوان کے نام)

یونٹ نمبر 8 عشق رسول ﷺ (بلالؓ۔ صدیقؓ) 257

یونٹ نمبر 9 اسلام، ماضی اور مستقبل
(صقلیہ۔ فاطمہ بنت عبداللہ)

یونٹ نمبر10	فرد اور ملت (بزم انجم۔ پیوستہ رہ شجر سے)	311
یونٹ نمبر12-11	نثر اقبال	345
یونٹ نمبر13	ترانہ ہندی اور ترانہ ملی	389
یونٹ نمبر14	شکوہ	419
یونٹ15	جواب شکوہ	461
یونٹ نمبر16	غزلیات اقبال	515
یونٹ نمبر18-17	افکار اقبال	547

کورس کا تعارف

عزیز طلباء طالبات

آپ نے اپنے فارغ اوقات کو حصول تعلیم میں صرف کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ اس نیک مقصد کے لئے اقبالیات کے کورس کا انتخاب حضرتِ علامہ اقبال کے افکار کے ساتھ آپ کی وابستگی کا واضح ثبوت ہے۔ ہم انتہائی نیک تمناؤں کے ساتھ اس کورس میں آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں اور آپ کی کامیابی کے دعا گو ہیں۔

علامہ اقبال اس عہد کے ممتاز اسلامی مفکر اور عظیم شاعر تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت یعنی پاکستان کا تصور ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ علامہ اقبال کی یہ ساری حیثیتیں اپنی جگہ اہم ہیں۔ لیکن کی ایک کورس میں ان سب کو جامعیت سے پیش کرنا ممکن ہے نہ مناسب۔ اقبالیات کے موجودہ کورس میں انٹرمیڈیٹ کا خیال رکھتے ہوئے اقبال کے سوانح حیات اور ان کے فکر و فن کے اہم پہلوؤں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح مطالعہ اقبال کے لئے ایک مستحکم بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یونیورسٹی کا تدریسی نظام

آپ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے طالب علم ہیں۔ جس کا ایک خاص تدریسی نظام ہے۔ اس نظام سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے اس کی خصوصیات کو سمجھنا ضروری ہے۔ آئندہ سطور میں آپ کو اس کورس اور اوپن یونیورسٹی کے نظام کے بارے میں چند مفید باتیں بتائی جا رہی ہیں تا کہ آپ ان کی روشنی میں اپنے مطالعے کا پروگرام مرتب کر سکیں اور اپنے وقت کو بہتر طور پر صرف کر سکیں کیونکہ آپ میں سے اکثر لوگ ملازمت، کاروبار یا دوسری مصروفیات کے باعث سارا وقت تعلیم کو نہیں دے سکتے۔ اس لئے جو وقت آپ نے تعلیم کے لئے نکالا ہے

اس کا استعمال احتیاط اور سلیقے سے ہونا چاہیئے۔

کورس اور اس کی تفصیل

اقبالیات کا یہ کورس علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کے دوسرے کورسوں کی طرح مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے۔

الف۔ درسی مواد

ب۔ ٹیلی ویژن / ریڈیو پروگرام

ج۔ مطالعاتی مرکز

(الف) درسی مواد

اس کورس کے درسی مواد میں 18 یونٹ شامل ہیں۔

یونٹوں میں کورس کے مندرجات حسب ذیل ہیں:

سوانح اقبال	یونٹ 2
تصانیف اقبال	یونٹ 1
افکار اقبال	یونٹ 2
خطوط اقبال	یونٹ 2

نثر اقبال	یونٹ 2
منظومات اقبال	یونٹ 9
کل	18 یونٹ

(1) یونٹ

ایک یونٹ میں عام طور پر اتنا درسی مواد ہوتا ہے کہ طالب علم اسے تقریباً ایک ہفتے میں آسانی سے ختم کرسکتا ہے۔ لیکن تمام یونٹوں کی ضخامت ایک جیسی نہیں، اس لئے بعض یونٹ ایک ہفتے سے بھی کم مدت میں ختم کئے جاسکتے ہیں۔

یونٹ لکھنے میں یہ ترتیب رکھی گئی ہے کہ سب سے پہلے یونٹ کا تعارف اور مقاصد دیئے گئے ہیں اس کے بعد یونٹ کے موضوع کو پیش کیا گیا ہے۔ طویل یونٹوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے تاکہ ان کی طوالت آپ کے لئے دشواری اور اکتاہٹ کا باعث نہ بنے۔ یونٹوں میں جہاں تک ممکن ہوا آسان زبان استعمال کی گئی ہے۔ اگر کسی یونٹ میں زبان ذرا مشکل ہوگئی ہو تو اس کے شروع میں حاشیے میں مشکل الفاظ کے معانی کو اچھی طرح دیکھ لیں، پھر یونٹ سمجھنے میں آپ کو دقت پیش نہیں آئے گی۔

(2) خود آزمائی

ہر یونٹ کے آخر میں خود آزمائی (اپنا امتحان آپ) کے سوالات دیئے گئے ہیں، خود آزمائی کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ آپ اپنا جائزہ خود لے سکیں کہ آپ اس یونٹ کو کہاں تک سمجھتے ہیں اور اس طرح اپنی رفتار ترقی کا اندازہ کر سکیں۔ اگر آپ یونٹ کے 80 فیصد سوالات کے صحیح جوابات دے سکتے ہوں تو ٹھیک ہے، اس سے کم ہونے کی صورت میں یونٹ کا مطالعہ دوبارہ کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ آپ کو کورس کے آخری امتحان کے لئے تیار کیا جائے۔

آپ کی سہولت کے لئے ایک اوقات نامہ دیا جارہا ہے تاکہ آپ اقبالیات کے یونٹوں کا مطالعہ اس کے مطابق کرسکیں۔

(ب) ریڈیو/ٹیلی ویژن پروگرام

اس کورس کے لئے 9 ریڈیو اور 4 ٹیلی ویژن پروگرام رکھے گئے ہیں۔ان پروگراموں کا مقصد یونٹوں کے درسی مواد کو تقویت دینا ہے۔ ہر پروگرام کسی نہ کسی یونٹ پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ پروگرام آپ کے لئے اسی صورت میں مفید ہوسکتے ہیں کہ آپ پروگرام سے پہلے متعلقہ یونٹوں کا مطالعہ ضرور کریں اور پروگرام سنتے وقت یونٹ اپنے سامنے اور کاغذ پنسل ساتھ رکھیں تاکہ آپ ضروری باتیں نوٹ بھی کرسکیں۔

(ج) مطالعاتی مرکز

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے مطالعاتی مرکز ملک کے مختلف مقامات پر کام کررہے ہیں۔وہاں کورس کے جزوقتی اساتذہ طلباء کی رہنمائی کے لئے مقررہ پروگرام کے مطابق تشریف لاتے ہیں۔طلبہ کو مرکز، استاد کے نام اور دیگر پروگرام کی اطلاع پہلے سے دی جاتی ہے۔آپ مرکز میں جاکر اپنی درسی مشکلات میں استاد سے مدد لے سکتے ہیں اور وہاں آپ کو اپنے ساتھی طلبہ سے ملاقات اور تبادلہ خیال کا موقع بھی ملے گا۔ان مرکزوں میں ریڈیو پروگراموں کی کیسٹ رکھنے کی کوشش بھی کی جارہی ہے اگر آپ کی وجہ سے کوئی ریڈیو پروگرام نہ سن سکے ہوں تو وہاں جاکر سن لیں۔ مذکورہ سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے مطالعاتی مرکز میں جانا آپ کے لئے مفید ہوگا۔یونیورسٹی کی یہ کوشش ہے کہ ملک میں زیادہ سے زیادہ مطالعاتی مراکز قائم کئے جائیں تاکہ اس کے سبب طالب علم ان مرکزوں سے فائدہ اٹھاسکیں لیکن کسی علاقے میں کورس کے طلبہ کی تعداد اگر بہت کم ہو تو وہاں کے طلبہ کو مواصلاتی ٹیوٹر کی خدمات مہیا کی جائیں گی اور

طلبہ ڈاک کے ذریعے اس ٹیوٹر سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

امتحان

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے نظامِ تعلیم میں امتحان مندرجہ ذیل حصوں میں لیا جاتا ہے ۔

1۔ امتحانی مشقیں 2۔ آخری امتحان

1۔ امتحانی مشقیں

طلبہ کو کورس کے دوران میں چار امتحانی مشقیں مقررہ تاریخ تک حل کر کے مطالعاتی مرکز کے استاد کے حوالے کریں گے یا ڈاک کے ذریعے سے اس کو بھیجیں گے۔ استاد ہر مشق کو دیکھ کر اپنی رائے اور آپ کے حاصل کردہ نمبروں کے ساتھ مقررہ مدت کے اندر اندر آپ کو لوٹا دیں گے۔ استاد کے رائے سے آپ کو اپنی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ ہوگا اور آپ اپنی حالت بہتر بنا سکیں گے۔ اس طرح استاد کی رائے سے آپ رہنمائی حاصل کریں گے اور امتحانی مشقوں کے نمبر آخری امتحان میں شامل کر کے آپ کا نتیجہ مرتب کیا جائے گا۔ چار امتحانی مشقوں کا حل کرنا آپ کے لئے لازمی ہے۔

2۔ آخری امتحان

کورس کے خاتمہ پر آپ آخری امتحان میں شرکت کریں گے۔ امتحانی مرکز اور اس کے اوقات نامے کی اطلاع آپ کو مناسب وقت پر دی جائے گی۔ اس کورس میں کامیاب ہونے کے لئے امتحانی مشقوں اور آخری امتحان دونوں میں الگ الگ پاس ہونا ضروری ہے۔

امتحانی مشقوں اور آخری امتحان کے نمبروں کی تقسیم حسب ذیل ہے:

امتحانی مشقوں کے مجموعی نمبر	:	30 فیصد
آخری امتحان کے نمبر	:	70 فیصد (کامیابی کے نمبر 40 فیصد)
امتحانی مشقوں میں کامیابی کے نمبر	:	40 فیصد

نیز امتحانی مشقوں اور آخری امتحان ہر دو میں کامیابی کے لئے مجموعی طور پر چالیس فیصد نمبر حاصل کرنا ہوں گے بصورت دیگر آخری امتحان دوبارہ دینا ہوگا۔

یونٹ ۱۔۲

سوانحِ اقبال

تحریر: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

فہرست

نمبر شمار عنوانات

یونٹ کے مقاصد

1۔ سوانح اقبال۔ پیدائش سے سفر انگلستان تک

1.1 ولادت، خاندان اور ابتدائی تعلیم و تربیت

1.2 عملی زندگی کی ابتداء

1.3 اہم نکات

1.4 خود آزمائی نمبر 1

2۔ قیام انگلستان

2.1 اہم نکات

2.2 خود آزمائی 2

3۔ انگلستان سے واپسی سے 1918ء تک

3.1 کاروباری زندگی کی مصروفیات

3.2 عائلی زندگی کے مسائل

3.3 نصب العینی زندگی میں پیش رفت

3.4 اہم نکات

3.5 خود آزمائی نمبر 3

4۔ 1918ء سے وفات تک

4.1 اہم نکات

4.2 خود آزمائی نمبر 4

5۔ جوابات

یونٹ کے مقاصد

ان دو یونٹوں کے مطالعے کے بعد آپ کو اس قابل ہو جانا چاہیے کہ آپ:

۱۔ علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی بیان کر سکیں۔
۲۔ ان کی تعلیم و تربیت کے مختلف مرحلوں پر روشنی ڈال سکیں۔
۳۔ اقبال کی شخصیت کی تعمیر اور تکمیل میں جن عوامل نے حصہ لیا ہے انہیں شمار کر سکیں۔
۴۔ ہماری ملی زندگی میں اقبال کو جو مقام حاصل ہے اس پر بحث کر سکیں۔

ا۔ سوانحِ اقبال۔ پیدائش سے سفرِ انگلستان تک

۱.۱۔ ولادت، خاندان اور ابتدائی تعلیم و تربیت

اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد[1] کشمیری پنڈت تھے جن کی گوت[2] سپرو تھی۔ اقبال کے والد شیخ نور محمد ایک صوفی منش، دیندار انسان تھے اور سیالکوٹ میں برقعوں کی ٹوپیاں بنانے کا کاروبار کرتے تھے۔ اقبال کی والدہ نیک سیرت، خوش طینت[3] خاتون تھیں دین سے لگاؤ اقبال کو ورثے اور اپنے ماحول سے ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب انگریزی عملداری[4] کو پنجاب میں قائم ہوئے تقریباً پچیس سال ہوئے تھے۔ پرانا درسی نظام جو زیادہ تر مسجدوں کے ساتھ وابستہ تھا، ابھی عام مسلمان گھرانوں میں مقبول تھا، البتہ نئی عملداری کے قیام کے ساتھ ہی تعلیم کے کچھ سکول اور کالج بھی جاری ہو رہے تھے اور رفتہ رفتہ بچوں کو جدید تعلیم کے لئے ان سکولوں میں بھیجا جانے لگا تھا۔ اقبال کو بھی اپنے بچپن میں ان دونوں تعلیمی سلسلوں سے گزرنا پڑا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''میری تعلیم عربی اور فارسی کے مطالعے سے شروع ہوئی۔ چند سال بعد میں ایک مقامی سکول میں داخل ہوا''۔ یعنی اقبال نے چند سال (چند سے مراد کم از کم تین، چار سال ہو سکتے ہیں) مسجد میر حسام الدین محلہ کشمیریاں کے دینی مدرسے میں عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی اور پھر سکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں داخل ہو کر یہاں سے ۱۸۹۱ء میں اپر مڈل (درجہ ہشتم) کا امتحان پاس کیا (جو اس زمانے میں یونیورسٹی امتحانات کا پہلا زینہ تھا) ۱۸۹۳ء میں اقبال نے سکاچ مشن ہائی سکول سے میٹرک اور ۱۸۹۵ء میں سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کیے ان امتحانات میں اقبال نے وظائف حاصل کیے۔ عربی ان کا اختیاری مضمون رہا۔ تعلیم کے اس مرحلے میں مولوی سید میر حسن کی توجہ اور شفقت نے ان کی تربیت

---

(۱) جمع جد، دادا، باپ دادا (۲) ذات (۳) خوش مزاج (۴) حکومت

میں بڑا حصہ تھا۔ شعر وسخن کا سلسلہ بھی اس دور میں شروع ہوا۔ سیالکوٹ کے مشاعروں میں غزلیں پڑھی جانے لگیں۔ دہلی کے ایک ادبی رسالے ''گلدستہ زبان'' میں ان کا کلام چھپنے لگا۔ نواب مرزا داغ دہلوی سے خط وکتابت کے ذریعے سے کلام پر اصلاح بھی لی جانے لگی۔

میٹرک کا امتحان اقبال نے گجرات کے امتحانی مرکز سے دیا تھا اس امتحان کے چند ماہ بعد ۱۸۹۳ء میں گجرات ہی میں ان کی پہلی شادی خان بہادر عطا محمد سول سرجن کی دختر سے ہوئی۔ اس بیوی سے اقبال کے دو بچے (آفتاب اقبال اور معراج بی بی) ہوئے۔

سیالکوٹ میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم کا انتظام تھا چنانچہ اقبال انٹرمیڈیٹ کر کے لاہور آگئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے شروع میں بھاٹی گیٹ کے اندر شیخ گلاب دین کے مکان میں قیام کیا پھر گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں آگئے (اب اس کا نام اقبال ہوسٹل ہے) اقبال نے طالب علمی کے زمانہ اسی ہوسٹل میں گزارا۔ بی۔ اے میں ان کے مضامین انگریزی، فلسفہ اور عربی تھے، ۱۸۹۷ء میں انہوں نے بی۔ اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور عربی میں اول رہے۔ بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے فلسفہ میں داخلہ لیا۔ اسی دوران ۱۸۹۸ء میں طامس آرنلڈ فلسفے کے پروفیسر بن کر گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے اور اقبال کا ان سے رابطہ ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں اقبال نے قانون کے لیکچروں کو کورس پورا کر کے بی۔ ای۔ ایل کا امتحان دیا لیکن اصول قانون کے پرچے میں ناکام رہے ۱۸۹۹ء میں انہوں نے ایم۔ اے فلسفہ کا امتحان پاس کیا۔

گورنمنٹ کالج کے طالب علمی کے زمانے میں بھی شعر وسخن کا مشغلہ جاری رہا۔ اندرون بھاٹی دروازہ کے مشاعروں میں وہ اپنا کلام سناتے۔ انہی مشاعروں میں مرزا ارشد گورگانی سے انہیں اس شعر پر بڑی داد ملی۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے میرے عرق انفعال (۱) کے

---

(۱) ندامت کا پسینہ

۱۸۹۶ء میں اقبال نے انجمن کشمیری مسلمانان کے جلسے میں ''فلاح قوم'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔ طالب علمی کے اس زمانے کے ایک ساتھی سید غلام بھیک نیرنگ بیان فرماتے ہیں کہ اس دوران میں اقبال اکثر اس خیال کا اظہار کرتے کہ واقعات کربلا کو ایسے رنگ میں کروں گا کہ ملٹن [۱] کی نظم Paradise Regained کا جواب ہو جائے۔ نیز اردو شاعری کی اصلاح و ترقی کا اور اس میں مغربی شاعری کا رنگ پیدا کرنے کا ذکر بھی وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ شعروسخن سے دلچسپی کے علاوہ اقبال کو ورزش کا بھی شوق تھا۔

۱.۲۔ عملی زندگی کی ابتداء

طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا تو عملی زندگی کے میدان میں جدوجہد کا دور شروع ہوا۔ اقبال کی زندگی کا یہ حصہ بہت اہم ہے لیکن اس پر سوانح نگاروں نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی حالانکہ انسانی زندگی کا یہی وہ دور ہوتا ہے جب آئندہ کی راہیں متعین ہوتی ہیں اور ایک خاص زاویے پر آ کر مرتکز [۲] ہو جاتی ہیں۔ اقبال کو اس زمانے میں اپنی نجی زندگی کی تعمیر کے لئے بڑی کشمکش میں سے گزرنا پڑا۔ آشیاں بندی کے ساتھ ساتھ جو آرزوئیں دل میں پرورش پا رہی تھیں، ان کی پیش رفت کی فکر بھی رہی، مثلاً مشہور انگریزی شاعر ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ کے جواب میں اردو میں کوئی طویل نظم لکھنے کا خیال انہیں گورنمنٹ کالج کے زمانہ طالب علمی ہی سے تھا۔ یہ خیال انہیں کئی سال تک بے چین کرتا رہا۔ چنانچہ ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء کے ایک مکتوب (بنام منشی سراج الدین میر منشی ریذیڈنسی کشمیر) میں لکھتے ہیں۔ ''ملٹن کی تقلید [۳] میں کچھ لکھنے کا ارادہ مدت سے ہے اور وہ اب وقت قریب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان دنوں وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا جس میں اس کی فکر نہ ہو۔ پانچ چھ سال سے اس آرزو کو دل میں پرورش کر رہا ہوں مگر جتنی کاوش آج کل محسوس ہوتی ہے اس قدر کبھی نہیں ہوئی۔ فکر روزگار سے نجات ملتی ہے تو اس کام کو باقاعدہ شروع کروں گا''۔

---

(۱) مشہور انگریزی شاعر (۲) مل جاتی ہیں، ایک مرکز پر آ جاتی ہیں (۳) پیروی میں

ملازمت

علامہ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں ایم۔اے فلسفہ کا امتحان پاس کیا اور اس سے پہلے وہ بی۔اے کی بنیاد پر میکلوڈ پنجاب عربیک ریڈر کی اسامی کے لئے درخواست دے چکے تھے۔اس کی ماہانہ تنخواہ تقریباً تہتر ۷۳ روپے تھی اور اس کے لئے بی اے اور عربی میں امتیازی پوزیشن کا ہونا ضروری تھا۔اس کے فرائض میں علمی وادبی کام کے علاوہ اورینٹل کالج میں لیکچر دینا بھی شامل تھا۔مدت ملازمت تین سال تھی۔علامہ اقبال ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اس اسامی پر تعینات ہوئے اس زمانہ میں پروفیسر آرنلڈ اورینٹل کالج میں عارضی طور پر (۱) کام کر رہے تھے۔قیاس ہے اقبال کے اس تقرر میں ان کی مدد بھی شامل ہوگی۔اس ریڈرشپ کے دوران انہوں نے رخصت بلا تنخواہ لے کر اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیئے۔

۴ جنوری ۱۹۰۱ء سے ۳۱ جنوری ۱۹۰۱ء تک وہ گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر کام کرتے رہے۔اس کے بعد چند ماہ تک انہوں نے شیخ عبدالقادر کی جگہ اسلامیہ کالج کے انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کو انگریزی پڑھائی۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۲ کو وہ گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی مقرر ہوئے اور یکم اپریل ۱۹۰۳ء کو واپس اورینٹل کالج آگئے جہاں وہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء تک خدمات انجام دیتے رہے، ۳ جون ۱۹۰۳ء کو دوبارہ گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی کے طور پر ان کا تقرر ہوگیا۔

ملازمت کی اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال ریڈرشپ کے منصب سے مطمئن نہیں تھے ایک تو اس لئے کہ یہ منصب عارضی تھا اور دوسرے اس لئے کہ اس کی تنخواہ بھی کم تھی، اس بنا پر وہ بہتر مواقع کی تلاش میں تھے۔ ۱۸۹۸ء میں انہوں نے قانون کا ابتدائی امتحان دیا تھا لیکن جورس پروڈنس (اصول قانون) کے پرچے میں ناکام رہے۔جون ۱۹۰۰ء میں انہوں نے سابقہ لیکچروں کی بنیاد

---

(۱) بعد ہو پرنسپل

پر امتحان میں دوبارہ شرکت کی اجازت چاہی لیکن چیف کورٹ لاہور کے جسٹس چیٹر جی نے درخواست مسترد کر دی۔ ۱۹۰۱ء میں اقبال نے ای اے سی (ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) کے مقابلے میں شریک ہونا چاہا لیکن میڈیکل بورڈ نے انہیں ناموزوں قرار دے دیا ان ناکامیوں سے اقبال بددل نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے معلومات بھی جمع کرنا شروع کر دی تھیں جیسا کہ ان کے ایک تعزیتی خط سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر اے ڈبلیو سٹریٹن کی وفات (گلمرگ ۲۳ اگست ۱۹۰۲ء) پر ان کی بیوہ کو لکھا تھا۔ ڈاکٹر سٹریٹن کینیڈین تھے اور اقبال ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر امریکی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے لئے جانے کے خواہشمند تھے۔ مسز سٹریٹن کا کہنا ہے کہ اقبال نے ان سے امریکی یونیورسٹیوں کے کوائف بھی معلوم کئے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض وجوہ کی بناء پر اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک جانے کی خواہش تین سال تک پوری نہ ہو سکی اور جب انہیں موقع ملا تو وہ امریکہ کی بجائے انگلستان اور جرمنی چلے گئے۔

اورینٹل کالج میں علامہ اقبال کی مدت ملازمت تقریباً تین سال بنتی ہے۔ یہاں وہ تاریخ، معاشیات اور فلسفہ کا درس دیتے تھے۔

اس ملازمت کے دوران میں اقبال نے درس و تدریس کے علاوہ بعض ٹھوس علمی کام کئے۔ بعض انگریزی مضامین کے ترجموں کے علاوہ ایک کتاب بھی لکھی۔ اس کتاب کا نام "علم الاقتصاد" ہے یہ کتاب کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ کئے گئے ہیں اور بعض جگہ اقبال نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ معاشیات پر اردو میں یہ ایک اہم کتاب ہے جو بیسویں صدی کے شروع میں لکھی گئی اور ۱۹۰۴ء میں پہلی بار چھپی یہ اقبال کی پہلی نثری تصنیف ہے جو ایک ٹھوس علمی موضوع پر ہے۔

اس کے علاوہ مخزن (۱) میں بھی ان کے نثری مضامین چھپتے تھے جو زیادہ تر تعلیم اور زبان کے مسائل پر ہوتے تھے مثلاً بچوں کی تعلیم و تربیت (جنوری ۱۹۰۲ء) اردو زبان پر ڈاکٹر وائٹ برجنٹ کے انگریزی مضمون کا ترجمہ (ستمبر ۱۹۰۲ء) اردو زبان پنجاب میں (اکتوبر ۱۹۰۲ء) وغیرہ۔

اس زمانے میں علمی، تصنیفی اور تدریسی کام کے علاوہ شعروسخن کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ زمانہ طالب علمی کے بعد ہوسٹل سے بھاٹی دروازے کے اندر آ گئے تھے اس زمانے میں بازار حکیماں اندرون بھاٹی دروازہ شعروادب کی مجلسوں کے لئے لاہور میں مشہور تھا اور اقبال ان مجلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے۔ انجمن حمایت اسلام سے بھی ان کا تعلق ہو گیا تھا اور وہ انجمن کے سالانہ جلسوں میں باقاعدگی سے قومی مسائل پر نظمیں پڑھنے لگے تھے۔ "نالہ یتیم" انجمن حمایت اسلام کے پندرھویں سالانہ اجلاس میں ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو زیر صدارت ڈپٹی مولوی نذیر احمد، پڑھی گئی"۔ یتیم کا خطاب ہلال عید سے" انجمن کے سولہویں اجلاس میں "خیر مقدم" "دین و دنیا" اور "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے" "انجمن کے ستر ہویں سالانہ جلسے میں اور "فریاد اُمت" یا "ابر گوہر بار" اٹھارہویں سالانہ اجلاس میں پڑھی گئیں۔ اقبال نے اس زمانے میں اور بھی بہت سی نظمیں کہیں جن میں قومی، وطنی مسائل اور مناظر فطرت سے دلچسپی نمایاں ہے ان کی نظم "ہمالیہ" بھی اسی زمانے میں تخلیق ہوئی اور مخزن کے پہلے شمارے اپریل ۱۹۰۱ میں چھپی اور برصغیر کے ادبی حلقوں میں اقبال کی شہرت کا آغاز ہوا مخزن میں دوسری چھپنے والی نظمیں یہ ہیں "مرزا غالب" (ستمبر ۱۹۰۱ء) "ابر کوہسار" (نومبر ۱۹۰۱ء) "آفتاب" (۱۹۰۲ء) "پرندے کی فریاد"، "خفتگان خاک سے استفسار" (فروری ۱۹۰۲ء) "شمع"، "ایک آرزو" (دسمبر ۱۹۰۲ء)۔

۳ جون ۱۹۰۳ء سے اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج کی ملازمت کے دوران پروفیسر طامس آرنلڈ سے اقبال کا گہرا رابطہ رہا۔ موصوف ایم۔ اے کے دوران ان کے فلسفے کے استاد تھے پھر کچھ عرصے کے لئے اورینٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل

(۱) اردو کا مشہور رسالہ جو سر عبدالقادر کی ادارت میں لاہور سے نکلتا تھا۔

اور مشرقی زبانوں کے سربراہ بھی رہے۔ ۲۶ فروری ۱۹۰۴ء کو پروفیسر آرنلڈ گورنمنٹ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر عازم انگلستان ہوئے تو اقبال نے اپنے استاد کی جدائی ''پر نالہ فراق'' لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس نظم میں حصول تعلیم کے لئے انگلستان جانے کی پُر زور خواہش موجود ہے:

''توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو''

اسی سال مدیر مخزن شیخ عبدالقادر بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہوئے۔ اقبال کا شوق سفر اور تیز ہوا۔ شیخ سے اثنائے سفر[1] کے مشاہدات کے بارے میں استفسار[2] کیا۔ مخزن میں ایک مضمون کی صورت میں جواب ملا:

''پیارے اقبال! آپ گزشتہ خط میں مجھ سے سمندر کی کیفیت پوچھتے ہیں، متحیر[3] ہوں کہ کیا لکھوں.....'' ظاہر ہے کہ تعلیمی سفر کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری اور زادِ راہ کی فراہمی کی کوشش زور وشور سے جاری رہی ہوگی۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے جو اس زمانے میں ایس۔ ڈی۔ او ایبٹ آباد تھے، تعلیمی اخراجات پورے کرنے کی حامی بھری تو اقبال کا یہ مسئلہ بڑی حد تک آسان ہوگیا۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے گورنمنٹ کالج سے تین سال کی رخصت مل گئی اور وہ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو لاہور سے براستہ دہلی، بمبئی ٹرین پر اور آگے بحری جہاز پر انگلستان روانہ ہوئے۔

گورنمنٹ کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری کے اس زمانے (۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء) میں اقبال کی شعری تخلیقات کا سلسلہ جاری رہا۔ ایمرسن، لانگ فیلو، ٹینی سن، ولیم کوپر کی بعض نظموں کے تراجم کے علاوہ کئی طبع زاد[4] نظمیں اور غزلیں اس عرصے میں کہی گئیں جن میں مناظر قدرت سے گہرا لگاؤ، حسن، عشق اور موت و حیات کے تصورات سے دلچسپی، حب الوطنی اور ہندی قومیت[5] کا احساس قابل ذکر موضوعات ہیں۔

---

(۱) دورانِ سفر (۲) سوال (۳) حیران (۴) وہ نظم جو شاعر اپنی طبیعت سے کہے، ترجمہ وغیرہ نہ ہو۔ (۵) یہ احساس کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگ ہندو ہوں یا مسلمان ایک قوم ہیں

یہ زمانہ جذباتی لحاظ سے برصغیر کے حساس تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے بڑا ہیجان انگیز [1] تھا حریت و آزادی کے رومانی آدرش [2] انہیں مغربی ادبیات کے مطالعے سے ملے تھے اور سیاسی تجھومی انہیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی۔ فکر و عمل کے اس تصادم میں انڈین نیشنل کانگریس کا لبرل [3] رجحان جس کے نمائندے اس زمانے میں گوکھلے تھے۔ اس نوجوان طبقے کو خاصا متاثر کر رہا تھا۔ حب الوطنی اور ہندی قومیت کا احساس اسی رجحان کی پیداوار تھا۔ اگرچہ ہندو قوم کا تعصب پنجاب میں آریہ سماجی تحریک اور یو۔ پی (بہار) میں اردو ہندی تنازعے [4] کی صورت میں برصغیر کی دو بڑی اقوام (مسلمان اور ہندو) میں زہرناک تلخی پیدا کر چکا تھا لیکن ان نوجوانوں کے نزدیک یہ ایک طرح کا فرقہ وارانہ رجحان تھا اور وہ اپنی آزاد خیالی میں اس رجحان کے خلاف بھی نبرد آزما [5] ہو رہے تھے۔ اقبال کا شمار اس زمانے میں نیشنلسٹ [6] خیال کے انہی نوجوانوں میں ہوتا تھا (اور اتفاق سے قائداعظم محمد علی جناح اس زمانے میں گوکھلے کے زبردست حامی اور انڈین نیشنل کانگریس کے پیروکار تھے) اقبال اس دور کے شعری افق پر ایک تابناک ستارے کی طرح چمکنے لگے تھے۔ انہیں اپنے شعری فریضے اور فنی مرتبے کا بھی احساس ہو چکا تھا۔

شاعر رنگین نوا ہے دیدہ بینائے قوم [7]

یہ اسی زمانے کے احساس کا اظہار ہے۔ ادبی اور قومی حلقے بھی ان کا اعتراف کرنے لگے تھے۔ اسی زمانے میں ان کی نظم ''تصویر درد'' تخلیق ہوئی اور انجمن حمایت اسلام کے انیسویں سالانہ اجلاس (اپریل ۱۹۰۴ء) میں پیش کی گئی۔

---

(۱) طوفانی (۲) جذباتی نصب العین (۳) آزاد خیالی (۴) ہندو کہتے تھے اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے (۵) جنگ کرنے والا (۶) ہندو اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم سمجھنے والے (۷) دلکش آواز والا شاعر قوم کو دیکھنے والی آنکھ

''تصویرِ درد میں برصغیر کی محکومی و بدبختی کا جو رقت انگیز نقشہ کھینچا گیا ہے اور اہل وطن سے جس طرح دردمندانہ فریاد کی گئی ہے، اس سے اقبال کے اس زمانے کے جذبات و تصورات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔'' ''ہمارا دیس'' بھی اسی سال تخلیق ہوئی اور مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی، یہ وہی مشہور نظم ہے جو بانگ درا میں ''ترانہ ہندی'' کے عنوان سے صفحہ ۸۲ پر درج ہے اور جس کا مطلع یہ ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور اس میں وطنی قومیت (۱) کا یہ تصور دیا گیا ہے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

''ہمارا دیس'' کے بعد ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' اور ''نیا شوالہ'' میں بھی وطنی قومیت کا یہی تصور اور حب الوطنی کے فطری جذبات کارفرما ہیں۔ ہندی قومیت کے اس تصور کے ساتھ ساتھ دینی جذبے اور ملی احساس کی ایک داخلی رو بھی ہے جو کبھی کبھی ''بلال'' ایسی نظم میں یا کہیں کہیں غزل کے کسی شعر میں جھلک دکھا جاتی ہے۔

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہ حجاز کرے

یہی (۲) رومانی تخیل تھا جو برصغیر کے عام مسلمان کی طرح اقبال کے قلب و ذہن میں بھی چٹکیاں لے رہا تھا۔ آخر یہی تخیل اقبال کو نئی حقیقتوں کی طرف لایا۔ اس ذہنی انقلاب میں یورپ کے تعلیمی سفر نے نمایاں کیا۔ اس لحاظ سے یہ سفر اقبال کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ (۳) کے لئے بھی فیصلہ کن ثابت ہوا۔

---

(۱) جس قومیت کی بنیاد مذہب کی بجائے وطن پر ہو (۲) جو تخیل مذہبی جذبات کی بنیاد پر پیدا ہوا ہو یعنی اس احساس کی ... ہم مسلمان ... (۳) دوبارہ زندگی پانا اور ترقی کرنا

۲.۱۔ اہم نکات

یونٹ کے پہلے حصے کا آپ نے مطالعہ کرلیا اب آیئے اس حصے کی اہم باتوں کا جائزہ لیں۔

۱۔ علامہ اقبال صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ مفکر بھی تھے اور زندگی کے رازوں سے واقف بھی تھے اس لئے ان کے سوانح کا مطالعہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

۲۔ انہوں نے محض شاعر ہونے سے اس لئے انکار کیا کہ لوگ شعر کے ظاہری حسن اور خوبیوں میں کھو کر ان کے پیغام سے غافل نہ ہو جائیں یا ممکن ہے اس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

۳۔ ان کا نظریہ حیات صدیوں کی اسلامی فکر کا نچوڑ ہے۔ مشرق و مغرب کے علوم کا گہرا مطالعہ کرنے کے باوجود ان کے افکار کی بنیاد دینی ہے۔

۴۔ ان کے افکار میں درجہ بدرجہ ترقی ہوتی رہی۔

اس حصے میں آپ نے علامہ اقبال کی پیدائش، خاندانی پس منظر اور ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں بھی پڑھا۔ آیئے دیکھیں کتنی باتیں قابل ذکر ہیں۔

پیدائش : سیالکوٹ میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو ہوئی۔

خاندانی پس منظر: آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ ماں باپ دونوں دیندار اور پرہیز گار تھے، دین سے لگاؤ علامہ اقبال کو ورثے میں ملا تھا۔

تعلیم و تربیت: ۱۔ ابتدائی تعلیم مسجد کے دینی مدرسے سے حاصل کی، سیالکوٹ میں انہوں نے ایف۔ اے تک پڑھا، مڈل ۱۸۹۱ء میں، اپر مڈل ۱۸۹۳ء میں، میٹرک اور ۱۸۹۵ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔

۲۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۸۹۷ء میں بی اے اور ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے فلسفہ کا امتحان پاس کیا۔

اساتذہ : علامہ میر حسن عربی کے استاد۔ پروفیسر طامس آرنلڈ فلسفہ کے استاد۔ نواب مرزا داغ، شاعری کے استاد (بذریعہ خط و کتابت)۔

ملازمت : ا۔ میکلوڈ عربیک ریڈر پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۳ مئی ۱۸۹۹ء سے مئی ۱۹۰۳ء تک)

۲۔ اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور (۱۹۰۳ء سے اگست ۱۹۰۵ء تک)

تصانیف : ا۔ نثر میں معاشیات (Economics) کے موضوع پر ''علم الاقتصاد'' کے نام سے کتاب لکھی۔ کچھ مضامین انگریزی سے ترجمہ کئے۔

۲۔ شاعری میں جن نظموں کے نام اس یونٹ کے حصہ میں آئے ہیں یہ ہیں ''نالہ یتیم، یتیم کا خطاب ہلال عید سے، خیر مقدم، دین و دنیا، اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے''، ''ابر گوہر بار، ہمالہ، مرزا غالب، ابر کوہسار و آفتاب، پرندے کی فریاد، خفتگان خاک سے استفسار، شمع، ایک آرزو، نالہ فراق۔ ایمرسن (ایک پہاڑ اور گلہری، رخصت اے بزم جہاں) لانگ فیلو (پیام صبح) ٹینی سن (عشق اور موت) ولیم کوپر (ہمدردی) کی بعض نظموں کے ترجمے: تصویر درد، ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، بلالؓ

شاعری کے موضوعات: قومی اور وطنی مسائل، مناظر فطرت سے گہرا لگاؤ، حسن، عشق اور زندگی اور موت کے تصورات سے دلچسپی، وطن کی محبت اور ہندی قومیت کا احساس، اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں ایک دینی احساس بھی ملتا ہے۔

۱۱۔ خود آزمائی نمبر ۱

۱۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب تحریر فرمائیں۔

۱۔ اقبال نے اپنی نظم ''نالۂ یتیم'' کہاں پڑھی تھی؟

۲۔ مدیر مخزن سے مُراد کون ہے؟

۳۔ ابتدائی دور میں اقبال نے کن انگریزی شاعروں کی نظموں کے تراجم اردو میں کیے؟

۴۔ نظم ''ترانہ ہندی'' کا پہلا نام کیا تھا؟

۵۔ کیا پہلے دور میں اقبال کے ہاں کوئی ایسی نظم ملتی ہے جس میں دینی احساس بھی پایا جاتا ہو؟

۲۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات ہاں/نہیں کی صورت میں دیجئے:

۱۔ دین سے لگاؤ اقبال کو ورثے اور اپنے ماحول سے ملا تھا۔

۲۔ اقبال کی تعلیم عربی اور فارسی کے مطالعے سے شروع ہوئی۔

۳۔ شعر و سخن کا سلسلہ اقبال نے سیالکوٹ میں شروع کر دیا تھا۔

۴۔ مرزا ارشد گورگانی سے اقبال کی ملاقات سیالکوٹ میں ہوئی تھی۔

۵۔ اقبال ۱۹۰۳ء میں میکلوڈ پنجاب عربک ریڈر مقرر ہوئے۔

۲۔ قیام انگلستان

اقبال کا یہ سفر یکم ستمبر ۱۹۰۵ء سے شروع ہوا اور آغاز سفر ہی سے ہم اقبال کی زندگی میں تبدیلی کے عمل کو کارفرما دیکھنے لگتے ہیں۔ اتفاق سے اقبال نے لاہور سے انگلستان تک سفر کی روداد دو خطوط کی صورت میں 'وطن' مدیر کے نام لکھ بھیجی تھی(۱)۔ اس لئے ہمیں ان کے ابتدائی تاثرات کی ایک جھلک اس میں مل جاتی ہے بعد میں شاید اپنی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے وہ اس طرح کی تفصیلات قلمبند نہ کر سکے تاہم اس دور کے تھوڑے سے کلام اور دوسرے ذرائع سے ان کے سہ سالہ قیام یورپ کی کیفیات کا کچھ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ تبدیلیاں کس نوعیت کی تھیں، ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء کے ایک خط میں اقبال نے اپنے تعلیمی سفر اور قیام یورپ کے بارے میں یہ کہا تھا:

''حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا ہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے، کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلم بند کروں گا جس سے مجھے یقین ہے کہ بہت سے لوگوں کو فائدہ ہوگا''۔

اقبال یہ سرگزشت(۲) تو نہ لکھ سکے لیکن اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں یہ تعلیمی سفر اور قیام یورپ کے مشاہدات و تجربات کتنی اہمیت کے حامل تھے۔

لاہور سے روانہ ہو کر اگلے روز (۲ ستمبر کو) اقبال اسلامی شان و شوکت کے قبرستان ''دہلی'' پہنچے ہیں اور احباب (خواجہ حسن نظامی، میر غلام بھیک نیرنگ) کی معیت میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار اور ان کے قدموں میں مدفون دہلی کی پرانی سوسائٹی کی زیارت کرتے ہیں۔ مرزا غالب کے مزار پر ایک خوش الحان لڑکے نے مرزا کا کلام سنا کر بہت متاثر کیا خصوصاً اس شعر نے:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر(۳) گئی

---

(۱) مثنوی؛ انشاء اللہ خان (۲) آپ بیتی (۳) صبح کی نیند کا لطف

ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور اقبال کی آنکھیں پرنم ہو گئیں، اس طرح دہلی کی عبرتناک سرزمین سے وہ ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوئے جوان کے الفاظ میں "صفحہ دل سے کبھی نہ مٹے گا"۔

اثنائے سفر کی چند کیفیات اقبال ہی کے لفظوں میں ملاحظہ کیجئے اور اندازہ لگایئے کہ وطن سے نکلنے کے بعد وطنی قومیت کا رنگ کس طرح اترنے لگتا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ بمبئی کے ایک ہوٹل میں دو ترک نوجوانوں کو دیکھ کر جذبۂ اخوت ومحبت ان کے دل میں جس طرح مچلنے لگتا تھا اس کا نقشہ دیکھئے:

"ایک شب میں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آ بیٹھے شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یورپین ہیں۔ فرانسیسی میں باتیں کرتے تھے۔ آخر جب کھانا کھا کر اٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی جس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کس طرح اس سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں۔ یورپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا۔ میں نے پوچھا فارسی جانتے ہو؟ بولا۔ بہت کم۔ پھر میں نے فارسی میں اس سے گفتگو شروع کی، لیکن وہ نہ سمجھتا تھا آخر بامجبوری ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں"۔

بحری سفر کے دوران سمندر کا نظارہ قلب وروح کو متاثر کرتا ہے تو حج بیت اللہ کی اہمیت کا ایک نیا رخ نگاہوں کے سامنے آتا ہے:

"جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالٰی کی قوت لامتناہی کا[1] جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے، شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں ان سے قطع نظر کر کے ایک بڑا

---

(۱) جس کی کوئی انتہا نہ ہو

اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعتوں کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض (۱) ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ شارع اسلام کی ہر بات قربان ہو جانے کے قابل ہے۔ بابی انت و امی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۲)"

عدن کے قریب پہنچ کر ساحل عرب کے تصور نے ذوق و شوق کی جو کیفیت ان کے دل میں پیدا کی اسے وہ کتنے دلپذیر پیرائے میں بیان کرتے ہیں:

"اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں (۳) پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا، لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کر باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پرواہ نہ کی۔ مگر اے پاک سرزمین! تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تا کہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود (۴) پنجوں سے آزاد کرے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں۔ اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازت آفتاب (۵) سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ (۶) ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی"۔

---

(۱) حقیر، بے وقعت (۲) یا رسولؐ اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں (۳) جادو (۴) منحوس، نامبارک (۵) دھوپ کی شدت (۶) گناہوں کا بدلہ۔

یہی والہانہ کیفیت اقبال کی نظم "ذوق وشوق" (1) میں ملتی ہے جو چھبیس سال بعد فلسطین کی سیاحت کے دوران تخلیق ہوئی۔

سویز پر پہنچ کر تھوڑی دیر کے لئے مسلمان دکانداروں کے جھرمٹ میں اسلامی بھائی چارے کا احساس ابھر آتا ہے۔ اقبال اس جذبہ احساس کو بھی محفوظ کر لیتے ہیں:

"ایک نوجوان مصری دکاندار سے میں نے سگریٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں میں نے اس سے کہا کہ میں مسلمان ہوں، مگر چونکہ میرے سر پر انگریزی ٹوپی تھی، اس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو؟ تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا۔ جب اس نے میرے اسلام کا قائل ہو کر یہ جملہ بولا: "تم بھی مسلم ہم بھی مسلم" تو مجھے بڑی مسرت ہوئی...... میں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا اور میرے ہاتھ چومنے لگا۔ باقی تمام دکانداروں کو مجھ سے ملایا اور وہ لوگ میرے گرد حلقہ باندھ کر ماشاء اللہ، ماشاء اللہ کہنے لگے اور میری غرض سفر معلوم کر کے دعائیں دینے لگے یا یوں کہئے کہ دو چار منٹ کے لئے وہ تجارت کی پستی سے ابھر کر اسلامی اخوت کی بلندی پر جا پہنچے"۔

اور مناظر بھی اسی جذبے اور احساس کا نقش اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں:

۱۔ "تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوبصورت گروہ جہاز کی سیر کے لئے آیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سیکنڈ کے لئے علی گڑھ کالج کے ایک ڈیپوٹیشن (۲) کا شبہ ہوا۔ یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے اور میں بھی دخل در معقولات (۳) ان میں جا گھسا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں ان میں سے ایک نوجوان ایسی خوبصورت عربی بولتا تھا کہ جیسے حریری کا کوئی مقام (۴) پڑھ رہا ہو"۔

---

(۱) بال جبریل میں اقبال کی مشہور نظم (۲) وفد (۳) کسی معاملے میں خواہ مخواہ دخل دینا، بیچ میں بولنا۔

(۴) مقامات حریری:۔ مقامہ عربی نثر کی ایک پر تکلف صنف ہے اور مقامات حریری ایک مشہور کتاب ہے

۲۔ جہاز سے گزرتے ہوئے ایک اور دلچسپ نظارہ بھی دیکھنے میں آیا اور وہ یہ کہ ہم نے ایک مصری جہاز گزرتے ہوئے دیکھا، جو بالکل ہمارے ہی پاس سے ہو کر گزرا اس پر تمام سپاہی ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور نہایت خوش الحانی سے عربی غزل گاتے جاتے تھے۔ یہ نظارہ ایسا پُر اثر تھا کہ اس کی کیفیت اب تک دل پر باقی ہے''۔

یہ مشاہدات عام سے ہیں لیکن ہم تصور کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کی محدود فضا سے نکل کر اسلامی بھائی چارے کے وسیع ماحول میں سانس لینے سے اقبال کے قلب و ذہن میں کیا کیا اثرات مرتب ہوئے ہوں گے جن کی تھوڑی سی جھلک ہمیں ان سفری خطوط میں ملتی ہے۔ اسے تبدیلی فکر و نظر کی تمہید کہا جا سکتا ہے۔ آئندہ دو تین سال کے مشاہدات و تجربات نے اس ذہنی انقلاب کی تکمیل کر دی اور شاعر مشرق حکیم الامت کے روپ میں جلوہ گر ہوئے۔

۲۴ ستمبر کی شام کو اقبال انگلستان پہنچے۔ شیخ عبدالقادر اور دیگر احباب کو وہاں چشم براہ پایا۔ رات بھر آرام کیا اور دوسری صبح سے ''کام'' شروع ہو گیا یعنی ان تمام فرائض کا مجموعی سلسلہ جن کی انجام دہی نے انہیں وطن سے جدا کیا تھا اور جوان کی نگاہوں میں ایسا ہی مقدس تھا جیسے عبادت: یہ ''کام'' تھا اعلیٰ تعلیم کے حصول کا، جس کی مختصر کیفیت یہ ہے:

سب سے پہلے بی اے کے (Advanced Student) کی حیثیت سے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں داخل ہوئے۔ لنکنز ان لندن میں بار ایٹ کے لئے نام رجسٹر کروایا۔ غالباً اسی زمانے میں انہوں نے میونخ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے رجسٹریشن کروائی تھی۔ کیمبرج میں پروفیسر میک ٹیگرٹ کی نگرانی میں انہوں نے فلسفہ ایران (The Development of Metaphysics in Persia) کے موضوع پر تحقیق کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں حصول تعلیم میں ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ وہ اکثر خاموش رہتے اور تعلیم کے علاوہ کسی کام پر بہت کم توجہ دیتے۔ کانٹ اور ہیگل کے فلسفوں پر پروفیسر میک ٹیگرٹ کے لیکچر باقاعدگی سے سنتے۔ ان کے کمرے میں جا کر فلسفہ کے مختلف مسائل پر ان سے تبادلہ خیال کرتے،

مقالہ کی تکمیل پر انہیں کیمبرج یونیورسٹی سے جون ۱۹۰۷ء میں بی اے کی ڈگری ملی۔ علمی مباحث اور تحقیقی نتائج کے اعتبار سے یہ مقالہ اس قدر عمدہ تھا کہ ان کے فاضل اساتذہ نے انہیں مشورہ دیا کہ اس کو مزید بہتر بنا کر میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے پیش کریں، انہوں نے اپنے اساتذہ کی رہنمائی میں مقالہ میں ضروری اصلاح و ترمیم کی اور میونخ یونیورسٹی میں پیش کیا۔ مقالہ انگریزی میں لکھا گیا تھا لیکن اس کے بارے میں زبانی امتحان جرمن زبان میں ہونا تھا اس لئے اقبال کو جرمن سیکھنی پڑی۔ اقبال جولائی ۱۹۰۷ء کے تیسرے ہفتے میں جرمنی گئے۔ ہائیڈل برگ اور میونخ میں چند ماہ تک جرمن زبان سیکھنے میں مصروف رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے جرمن زبان کے امتحان کے لئے تاریخ عالم پر ایک مقالہ تیار کیا۔ نومبر ۱۹۰۷ء میں انہیں میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔

جرمنی سے واپس آ کر انہوں نے لنکنز ان لندن میں بار ایٹ کی تکمیل کی اور جولائی ۱۹۰۸ء میں وہ بار ایٹ لا ہو گئے اس دوران انہوں نے چند ماہ کے لئے یونیورسٹی کالج لندن میں پروفیسر آرنلڈ کی جگہ عربی زبان کی تدریس کے فرائض انجام بھی دیئے۔ علاوہ ازیں اسلامی تہذیب و تمدن پر انگلستان کی علمی مجلسوں میں کچھ خطبے بھی دیئے۔

یہ تو ہے اقبال کے سہ سالہ قیام یورپ کی تعلیمی کارکردگی کی مختصر روداد جس کو انہوں نے انگلستان پہنچتے ہی عبادت کی طرح مقدس فریضہ سمجھ کر پورے خلوص اور انہماک سے سرانجام دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ سوشل تقریبات اور اجتماعی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے اور مطالعہ تحقیق کے علاوہ امروز و فردا[1] کے احوال[2] کو بھی گہری نظر سے دیکھتے رہے۔ انگلستان کے زمانہ قیام میں ۱۹۰۷ء تک انہیں شیخ عبدالقادر جیسے خوش اطوار دوست کی رفاقت میسر تھی۔ دونوں دوستوں میں جن مسائل پر گفتگو ہوتی ہو گی ان کا اندازہ ہم اقبال کی اس نظم سے لگا سکتے ہیں جو وطن واپس آنے کے بعد ''عبدالقادر'' کے نام سے لکھی گئی

---

(۱) آج اور کل مراد زمانہ (۲) حالات

خصوصاً اس نظم کا شعر، تصور کے لئے بہت کچھ فراہم کر دیتا ہے:

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیِ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشہ کر دیں

۱۹۰۷ء میں مسز بیگ کے توسط سے اقبال کا تعارف مس عطیہ فیضی سے ہوا۔ چند ماہ تک لندن، کیمبرج اور ہائیڈل برگ کی مجلسی زندگی میں ان کا رابطہ رہا (عطیہ فیضی نے بعد میں ان ادبی محفلوں اور سوشل تقریبات کا تذکرہ اپنے نام خطوط اقبال کے دیباچے میں کیا ہے۔

لندن میں اسی زمانے میں عبداللہ المامون سہروردی اور مشیر حسین قدوائی نے پین اسلامک سوسائٹی قائم کی تھی اقبال اس میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔ سید امیر علی کی صدارت میں یہاں مسلم لیگ قائم ہوئی تو اقبال اسکی مجلس عاملہ کے رکن بھی بنے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ ان مجلسوں میں اقبال کی شرکت کا کیا انداز تھا لیکن سوشل تقریبات اور عام نجی محفلوں میں ہم انہیں زیادہ تر ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے ہیں جو کبھی کبھی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی طرف مائل ہوتا اور اپنی زندہ دلی کا ثبوت دیتا ہے۔ عطیہ فیضی اور دوسرے معاصرین کے بیانات یہی ظاہر کرتے ہیں۔ علمی مشاغل میں منہمک رہنے کی وجہ سے شعر گوئی کی مقدار بھی کم ہو کر رہ گئی تھی بلکہ اس دوران میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب بقول شیخ عبدالقادر انہوں نے ترک شعر گوئی کا ارادہ کر لیا تھا شیخ نے اس سے اختلاف کیا اور فیصلہ پروفیسر آرنلڈ پر چھوڑا گیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے بھی شیخ سے اتفاق کرتے ہوئے ترک شعر گوئی کے خلاف رائے دی۔ اس طرح اقبال اس خیال سے باز آئے۔

یورپ کے زمانہ قیام کے مطالعے و مشاہدے سے اقبال کے قلب و ذہن میں جو انقلاب آیا اس کا تجزیہ کیا جائے تو تین خاص باتیں قابل ذکر نظر آتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ اپنے تحقیقی مطالعے کے دوران میں اقبال کے ذہن میں فلسفہ وحدۃ الوجود [۱] کے بارے میں شکوک پیدا ہوئے۔ تصوف پر عجمی اثرات [۲] کے تحت جو منفی رجحانات پیدا

---

(۱) صوفیوں کی اصطلاح میں تمام موجودات کو حقیقی نہ ماننا ہے ان کے نزدیک اصل میں تمام چیزیں خدا ہی ہیں جیسے پانی، موج بھی ہے قطرہ بھی اور سمندر بھی (۲) غیر اسلامی

ہوئے، وہ ان پر منکشف ہوئے اقبال اس وقت تک وحدۃ الوجود کے حامی تھے۔ حافظ شیرازی سے بہت متاثر تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ ان سے گریز کرتے گئے اور چند سال بعد اسرارِ خودی میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۲۔ یورپی ممالک کی سامراجی سیاست کے قریبی مشاہدے نے اقبال پر وطنی قومیت (Territorial Nationalism) کے اثرات بد کو پوری طرح منکشف کر دیا یہاں آنے سے پہلے وہ خود وطنی قومیت کے سحر میں مسحور تھے اور حب الوطنی کو اس تصور کا حاصل سمجھتے تھے اب انہیں احساس ہوا کہ دائرہ بہت ہی تنگ ہے اور مختلف یورپی قوموں کی باہمی رقابت نے اسے انسانیت کے لئے باعث ننگ بنا دیا ہے۔ اقبال وطنی قومیت کے اس سیاسی تصور کے خلاف ہو گئے۔

۳۔ عالم اسلام کیلئے اگرچہ اس زمانہ میں عرصہ حیات تنگ تھا لیکن بعض ممالک میں ایک روح بیداری کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے شاعرانہ تخیل بھی کہا جا سکتا ہے لیکن شمالی افریقہ، مصر، سوڈان اور نجد وغیرہ میں احیائے دین [1] کی تحریکوں کی وجہ سے کچھ آثار ایسے نظر آ رہے تھے کہ ملت اسلامیہ کے تنِ خفتہ میں ابھی جان باقی ہے۔ اتحاد عالم اسلامی کا تصور بھی آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا (اس کی جھلک وہ آغاز سفر میں دیکھ آئے تھے) اتحاد اسلامی سے اتحاد انسانی کا نصب العین اقبال کی نگاہوں کے سامنے واضح ہو گیا اور اب وہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔

اقبال نے جو بعد میں یہ کہا کہ ''یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا ہے''۔ وہ حقیقت میں یہی خاموش انقلاب تھا ورنہ مسلمان تو ماشاء اللہ وہ پہلے بھی تھے لیکن بحیثیت مسلمان مفکران کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا، وہ خود ایک بھٹکے ہوئے راہی تھے، دوسروں کو کیا راستہ دکھاتے۔ اب ان کے قلب و

ذہن روشن ہوئے تو انہیں اپنی منزل بھی نظر آنے لگی۔ وہ دوسروں کی رہنمائی کرنے کی تمنا اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرنے لگے۔ ۱۹۰۷ء کی ایک غزل کے وہ اشعار اسی وجدانی کیفیت کے حامل کہے جا سکتے ہیں:

سنا دیا گوشِ منتظر (۱) کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں (۲) سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

....

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں (۳) سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

....

دیارِ مغرب (۴) کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار (۵) ہوگا

....

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار (۶) ہوگا

....

میں ظلمتِ شب (۷) میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ (۸) کارواں کو
شرر فشاں (۹) ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار (۱۰) ہوگا

---

(۱) کسی بات کو سننے کا انتظار کرنے والا کان (۲) صحرا میں رہنے والے (۳) فرشتوں، نیک آدمیوں (۴) یورپ (۵) کھوٹا سونا (۶) کمزور (۷) رات کی تاریکی (۸) چنگاری بکھیرنے والا (۹) پیچھے رہ جانے والا (۱۰) شعلہ برسانے والا

اقبال پہلے ہندی قومیت کے حامی تھے۔ اب وہ نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کے خیال کو اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے۔ انہیں مسلم قومیت کے تصور میں جس میں کالے، گورے، ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں، عالم اسلامی اور نوع انسانی کی نجات نظر آنے لگی:

نرالہ سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اقبال کی زندگی مین یہ ایک بہت بڑا روحانی وفکری انقلاب تھا جو مغربی تہذیب و سیاست کے مشاہدے سے پیدا ہوا۔ دوسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۱ء کے موقع پر کیمبرج کی ایک تقریب میں اقبال نے اپنے انقلاب ذہنی کے بارے میں فرمایا:

''میں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق بعض پشین گوئیاں کی تھیں اگر چہ میں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ ۱۹۰۷ء کی بات ہے اس سے چھ سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں میری پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوگئیں''۔

کیمبرج اور میونخ سے بی اے اور پی ایچ ڈی، لندن سے بار ایٹ لاء کی ڈگریاں لے کر اور اس تبدیل شدہ قلب وذہن کے ساتھ اقبال نے وطن کی طرف مراجعت[1] فرمائی، واپسی کے سفر کے تاثرات نثر میں قلم بند نہیں ہوئے تاہم بحیرہ روم میں جزیرہ سسلی کے پاس سے گذرتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے عہد رفتہ کے جو تاثرات ذہن میں ابھرے، وہ ان کی نظم ''صقلیہ'' میں محفوظ ہیں۔ اس نظم کا یہ آخری بند خصوصیت سے یہاں قابل ذکر ہے:

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں

---

(۱) واپسی

درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا، میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویر کہن[1] میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایام سلف[2] کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا[3]

---

(۱) پرانی تصویر (۲) پرانا زمانہ (۳) اس نظم کی تشریح آپ یونٹ نمبر ۹ میں پڑھیں گے

۲.۱ ۔اہم نکات

یونٹ کے دوسرے حصے کا بھی آپ نے مطالعہ کرلیا، اس کی اہم باتیں کون کون سی ہیں؟ آیئے ان کا جائزہ لیں۔

۱۔ یورپ کو روانگی: یکم ستمبر ۱۹۰۵ء براستہ دہلی، بمبئی سفر سمندری جہاز سے کیا ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء کو انگلستان پہنچے۔ٹرینٹی کالج کیمبرج سے بی۔اے کیا۔ پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' پروفیسر میک ٹیگر یٹ کی نگرانی میں ۱۹۰۷ء میں مکمل کر کے میونخ (جرمنی) سے پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔لنکنز ان لندن سے ۱۹۰۸ء میں بار ایٹ لاء کیا۔

یونیورسٹی کالج لندن میں پروفیسر آرنلڈ کی جگہ عربی زبان پڑھائی، اسلامی تہذیب وتمدن پر لندن میں چند لیکچر بھی دیئے۔

۲۔ آپ نے پڑھا کہ علامہ نے اسی زمانے میں شاعری ترک کرنے کا ارادہ کیا۔لیکن سر عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔مغربی تہذیب وتمدن اور سیاست کے مطالعے اور مشاہدے سے علامہ اقبال کی فکر ونظر میں بہت بڑا انقلاب آیا جس میں آپ نے پڑھا کہ تین باتیں نمایاں تھیں۔

۱۔ فلسفہ وحدۃ الوجود کے بارے میں شکوک پیدا ہوئے۔

۲۔ وطنی قومیت کے سیاسی تصور کے خلاف ہوگئے۔نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کے خیال کو اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے۔

۳۔ اتحاد اسلامی سے اتحاد انسانی کے نصب العین کی طرف بڑھنے لگے، یورپ سے واپسی ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء۔

تصانیف :نثر میں دو خطوط جس میں انہوں نے سمندری سفر کے تاثرات تحریر کئے، پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ

شاعری :اس دور میں بہت کم کی چند غزلیں اور چند نظمیں، جن میں سے دو کا ذکر یونٹ کے اس حصے میں آیا ہے۔''سر عبدالقادر کے نام'' اور ''صقلیہ'' باقی نظمیں بانگ درا کے صفحہ ۱۱۵ سے ۱۴۲ پر دیکھیے۔

۲.۲۔ خود آزمائی نمبر ۲

مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب لکھیئے:

۱۔ اقبال نے انگلستان جاتے ہوئے دہلی میں کس بزرگ کے مزار پر حاضری دی؟

۲۔ وطن سے نکلنے کے بعد اقبال کی طبیعت میں وطنی قومیت کا رنگ گہرا ہوا یا کم ہوا؟

۳۔ بمبئی کے ہوٹل میں دو ترک نوجوانوں سے مل کر اقبال کو کیا محسوس ہوا؟

۴۔ اقبال کو سمندری سفر میں حج کے اخلاقی فوائد کا خیال کیونکر آیا؟

۵۔ مصری نوجوان نے اقبال کو مسلمان ماننے میں تامل کیوں کیا تھا؟

۲۔ جملوں کے سامنے دیئے گئے لفظوں میں سے موزوں لفظ منتخب کیجئے، اور خالی جگہ پُر کیجئے۔

۱۔ اقبال نے سفر انگلستان کی روداد رسالہ.................. کے مدیر کو بھیجی تھی۔ (وطن۔ مخزن)

۲۔ اقبال نے سفر کے دوران............ کو اسلامی شان و شوکت کا قبرستان قرار دیا تھا۔ (لاہور۔ دہلی)

۳۔ مرزا غالب پر ایک خوش الحان لڑکے نے.......... کی غزل پڑھی تھی (اقبال۔ مرزا غالب)

۴۔ اقبال نے یورپ کا سفر.......... کی غرض سے کیا تھا۔ (سیاحت۔ تعلیم)

۵۔ جرمن زبان کے امتحان کے لئے اقبال نے.......... پر مقالہ تیار کیا۔ (فلسفہ قدیم۔ تاریخ عالم)

۳۔ انگلستان سے واپسی سے ۱۹۱۸ء تک

۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کی شام کو اقبال لاہور پہنچے۔ یہاں احباب نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اگلے روز وہ اپنے والدین کی قدم بوسی کے لئے سیالکوٹ چلے گئے اور وہاں دو ماہ گزار کر لاہور کا رُخ کیا۔

یورپ سے واپسی پر اقبال کی عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ اس دور کے سوانح حیات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اقبال کے ذہن و فکر کا مطالعہ کر سکتے ہیں:

۱۔ کاروباری زندگی کی مصروفیات
۲۔ عائلی زندگی (۱) کے مسائل
۳۔ نصب العینی زندگی میں پیش رفت

۳۔۱ کاروباری زندگی کی مصروفیات

اقبال نے قیام انگلستان کے آخری چند ماہ میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ گورنمنٹ کالج کی ملازمت ترک کر لیں گے۔ لہٰذا انہوں نے اپریل ۱۹۰۸ء میں ہی استعفیٰ دے دیا اور وطن واپس آنے کے بعد انہوں نے اکتوبر ۱۹۰۸ء میں چیف کورٹ لاہور میں وکالت کے لئے اپنا نام رجسٹر کروایا اور بطور وکیل کام شروع کر دیا۔

پہلے موہن لال روڈ (موجودہ اردو بازار) پر مطبع مفید عام کے سامنے ایک مکان کرائے پر لیا پھر دو تین ماہ بعد انارکلی بازار کے ایک چوبارے میں آ گئے جہاں وہ ۱۹۲۲ء تک مقیم رہے۔

پیشہ وکالت میں مقابلے کی صورت لازمی ہے۔ خصوصاً ابتداء میں اپنے آپ کو معروف کرنے کے لئے وکیل کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور جاں گسل (۲) مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اقبال کو بھی ان

---

(۱) گھریلو زندگی (۲) جان لیوا۔ کٹھن مرحلے

معاملات سے دو چار ہونا پڑا۔ ان حالات میں فرصت کاروبار شوق کی گنجائش کہاں؟ ایک خط میں اپنا حال بیان کرتے ہیں؟ ''کچھ دنوں سے بہت عدیم الفرصت ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ قانونی پیشہ میں اس قدر مصروفیت رہے گی''۔

اقبال کو شروع میں علی گڑھ کالج میں فلسفے کی پروفیسری اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کی پروفیسری کی پیش کش ہوئی لیکن انہوں نے وکالت کے آزاد پیشے کو قید ملازمت پر ترجیح دی تاہم یکم مئی ۱۹۰۹ء کو گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ مسٹر آسٹن وائٹ جیمز بی۔اے کا انتقال ہوگیا تو فوری طور پر اس جگہ دوسرے پروفیسر کا انتظام کرنے میں پرنسپل روبسن کو بہت دشواری پیش آئی۔ ڈاکٹر اقبال کو آمادہ کیا گیا اور حکومت کے توسط سے چیف کورٹ میں ان کے مقدمات کی پیشی کا خاص انتظام کرکے انہیں قائم مقام پروفیسر فلسفہ مقرر کیا گیا وہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۰ء تک یہ خدمت انجام دیتے رہے اور وکالت بھی کرتے رہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال سرکاری ملازمت سے برگشتہ تھے اور کاروبار وکالت سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ وہ کسی ایسے آبرومندانہ ذریعہ معاش کی تلاش میں تھے جس میں وہ باعزت زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے فکری وفنی مشاغل کو جاری رکھ سکیں (شاید گوئٹے کی کامیاب زندگی کی مثال ان کے سامنے ہو جو قانون کی ڈگری حاصل کرنے کی بعد ڈیوک آف ویمر کا مشیر بنا اور بقیہ زندگی انتظامی خدمات اور فنی مشاغل میں وہیں گزار دی) اقبال اس جستجو میں حالات کا جائزہ لینے کے لئے مارچ ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد (دکن) بھی گئے وہاں کے اکابر[1] سے ملے۔ بعض امراء نے انہیں اپنے اپنے ہاں مدعو بھی کیا۔ مہاراجہ کشن پرشاد سے ان کے تعلقات استوار ہوئے۔ حیدرآباد کے علاوہ دوسری ریاستوں میں بھی کوشش کی گئی لیکن کوئی موزوں صورت نہ نکل سکی۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد نے ایک معقول رقم بطور وظیفہ مقرر کرنا چاہی لیکن اقبال نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کردی کہ بات مروت اور دیانت سے

---

(۱) بڑے لوگ

دور ہے کہ اقبال آپ سے ایک بیش قرار تنخواہ پائے اور اس کے عوض میں کوئی ایسی خدمت نہ کرے جس کی اہمیت بقدر اس مشاہرے کے ہو۔ خدا کو منظور ہوا تو کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے گی کہ اقبال جو ہمیشہ سے معنوی[(۱)] طور پر آپ کے ساتھ رہا ہے۔ صوری[(۲)] طور پر بھی آپ کے ہمراہ ہو گا۔ ۱۹۱۷ء میں حیدر آباد (ہائی کورٹ کی ایک ججی خالی ہوئی تو بعض احباب نے اس کے لئے اقبال کا نام تجویز کیا۔ اقبال بھی اس سے متفق تھے لیکن یہ تجویز عملی شکل اختیار نہ کر سکی۔ سر اکبر حیدری نے قانون کی پروفیسری پیش کرنی چاہی جسے اقبال نے بوجوہ[(۳)] قبول نہ کیا اور بالآخر راضی برضا ہو کر لاہور ہی میں اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں اور قومی خدمات کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وکالت میں انہیں معقول آمدن (سات آٹھ سو روپے ماہوار) ہو جاتی تھی ممتحنی کا معاوضہ اس کے علاوہ تھا۔ لیکن بڑے بھائی (جنہوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں ان کی مالی امداد کی تھی) کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنے اور لواحقین کے اخراجات کا جو بوجھ انہیں برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اس زمانے میں خاصے متردد[(۴)] تھے۔ دوسری طرف وہ قومی مقاصد تھے جو اس احتیاج[(۵)] کے ساتھ ساتھ جاری رکھنے پر وہ فطرتاً مجبور تھے۔ "اگر لٹریری مشاغل اس ملک میں بطور ایک پیشے کے اختیار کیے جا سکتے تو میں اپنے موجودہ کاروبار کو مع اس کی تمام دلچسپیوں اور امیدوں کے خیر باد کہہ دیتا ہوں"۔

۲.۳۔ عائلی زندگی کے مسائل

معاشی مسائل کے علاوہ ایک دوسری الجھن جس سے اقبال کو اس زمانے میں دوچار ہونا پڑا۔ ان کی عائلی زندگی تھی اس کی وجہ سے وہ چند سال تک خاصے مضطرب و پریشان رہے بعض لوگوں نے حیات اقبال کے اس ہیجانی دور کو ان کے چند خطوط (بنام عطیہ فیضی) اور کلام کے حوالے سے افسانوی رنگ دینے کی کوشش کی ہے لیکن اس افسانے میں حقیقت کا پہلو اتنا ہی ہے کہ اقبال اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں تھے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد بزرگوں نے ان کی شادی گجرات کے ایک معزز خاندان کی

---

(۱) باطنی طور پر (۲) ظاہری طور پر (۳) کئی وجوہات کی بنا پر (۴) پریشان (۵) حاجت محتاجی

ایک شریف خاتون سے کردی تھی۔ ایک سعادت مند خوردکی طرح اقبال بزرگوں کے باندھے ہوئے بندھن سے نباہ کرتے رہے لیکن سعادت مندی اور شرافت ایک طرف اور جذباتی ہم آہنگی اور ذہنی مفاہمت دوسری طرف، یہ دونوں باتیں یکجا نہ ہوں تو ایسی شادیاں بعض اوقات زندگی میں اضطراب و ہیجان کا باعث بن جایا کرتی ہیں۔ یورپ سے واپسی کے بعد یہ جذباتی ہیجان شدید ہوگیا جس نے اقبال کی زندگی کو خاصا تلخ بنا دیا تھا۔ اس ہیجان و اضطراب کا اظہار انہوں نے عطیہ فیضی کے نام خطوط میں کیا۔ غالباً عطیہ فیضی کو اپنا مخلص، ہمدرد اور بے تکلف لٹریری دوست سمجھتے ہوئے ان خطوط کو عطیہ فیضی اور اقبال کے کسی جذباتی لگاؤ کی اساس بنا لینا اور اس بنیاد پر افسانے تراشنا درست نہیں۔ اگر عطیہ اقبال کے مابین ایسا کوئی معاملہ ہوتا تو بعد کے واقعات اس کی کچھ تائید کرتے۔

۱۹۱۱ء میں اندرون موچی دروازہ کے ایک کشمیری خاندان کی ایک دوشیزہ سے اقبال کا دوسرا نکاح ہوا لیکن ابھی رخصتی نہ ہوئی تھی کہ بعض غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں یا پیدا کر دی گئیں۔ اس وجہ سے یہ معاملہ دو تین سال تک التوا میں پڑا رہا۔ اسی اثناء میں ۱۹۱۲ میں اقبال کا تیسرا نکاح لدھیانہ میں ہوا۔ ان کی یہ بیگم لدھیانہ کے مشہور نولکھا خاندان سے تھیں۔ اگلے سال ۱۹۱۳ء میں) دوسری منکوحہ خاتون کے بارے میں پیدا کردہ غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور یہ معاملہ بھی خوش اسلوبی سے نیک انجام کو پہنچا۔ اس طرح اقبال کی نجی زندگی کا یہ پریشان کن مسئلہ اطمینان بخش طور پر حل ہوگیا اور کسی قسم کی کوئی جذباتی الجھن باقی نہ رہی جو موہوم[1] افسانوں کی تائید کر سکے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام مکتوب محررہ[2] ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں اقبال نے اندرون موچی دروازہ والی بیوی سے شادی کا واقعہ جس دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے اس کے بعد مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

"خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں۔ تیسری بیوی آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد کی (یعنی جولائی ۱۹۱۳ء کے بعد) ضرورت نہ تھی مگر یہ عشق و محبت کی

---

(۱) فرضی (۲) تحریر کردہ

یک عجیب وغریب داستان ہے۔ اقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرت ناک ثابت قدمی کے ساتھ تین سال اس کے لئے اس طرح کے مصائب اٹھائے ہوں، اسے اپنی بیوی نہ بنائے، کاش! دوسری بیوی کرنے سے پیشتر یہ حال معلوم ہوتا''۔

۲۔۳۔ نصب العینی زندگی میں پیش رفت

اب ہم تیسرے رُخ یعنی نصب العینی زندگی میں پیش رفت کی طرف آتے ہیں۔ اس اعتبار سے علامہ اقبال کی زندگی کا یہ دوران کے بنیادی افکار کی تعین (۱) تعبیر (۲) کے نقطہ نظر سے از حد اہم ہے۔ اقبال یورپ سے علوم کی ڈگریاں لے کر ہی نہیں آئے تھے، وہ ملی وقومی خدمت کا ایک جذبہ لے کر بھی آئے تھے۔ اگرچہ نصب العین کی طرف پیش رفت کے لئے سمت اور طریق کار کا تعین ابھی نہیں ہوا تھا جب وہ ''عبدالقادر کے نام'' نظم میں یہ کہتے ہیں:

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور (۳) پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانند سپند (۴) اپنی بساط (۵)
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں

مشرق کی تیرہ وتار فضا میں فریاد وفغاں ہے ایک ہنگامے کا تصور تو ان کے ذہن میں تھا لیکن اس فریاد کی کونسی لے ہو، اس نے کوئی واضح شکل ابھی اختیار نہیں کی تھی (واضح رہے کہ یہ نظم نومبر ۱۹۰۸ء کے مخزن میں

---

(۱) متعین کرنا، طے کرنا (۲) سمجھنا (۳) مشرقی افق (۴) ہرمل کا دانہ (۵) حیثیت

شیخ عبدالقادر کے ایک شذرے[1] کے ساتھ چھپی تھی)، پکا ہوا، واحالات کے دھارے کے ساتھ آئندہ چند برسوں میں اپنی سمت متعین کر لیتا ہے تو اقبال کے بنیادی افکار بھی دنیا کے سامنے آجاتے ہیں۔

شروع کے دو ایک سال میں علامہ اقبال نے اسلام کے اخلاقی، عمرانی[2] اور سیاسی پہلوؤں پر انگریزی میں چند آرٹیکل لکھے جو ''ہندوستان ریویو'' میں چھپے۔ ایک خطبہ علی گڑھ کالج میں دیا۔ چند نظمیں بھی کہیں اور (Stray Reflections) آرٹیکل کے طور پر اپنے افکار ذہنی قلمبند کئے۔ اس زمانے میں ملکی حالات (تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کی ایجی ٹیشن، منٹو مارلے ریفارمز اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ) کے علاوہ اسلامی ملکوں میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات نے اقبال کو بہت متاثر کیا، وسط ایشیا کی مسلم ریاستیں زار روس کا نوالہ تر بن چکی تھیں، برطانیہ اور روس نے ایران کا بٹوارہ کر کے وہاں اپنا اپنا سیاسی حلقۂ اثر قائم کر لیا تھا، یورپ کی عیسائی طاقتیں ترکی سلطنت کے حصے بخرے کر کے ان پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھیں۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب (لیبیا) پر حملہ کر کے اس منصوبے کا آغاز کیا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں ریاستہائے بلقان (بلغاریہ، سرویا، مانٹی نیگرو، یونان وغیرہ) نے یورپی ترکی پر ہلہ بول دیا اور بڑھتے بڑھتے ادرنہ پر قابض ہو گئے۔ ان الم انگیز سانحات[3] نے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کو شدید مجروح کیا۔ اس پس منظر میں اقبال کی شاعری نے ایک نئی کروٹ لی۔

اپریل ۱۹۱۱ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اپنی طویل نظم ''شکوہ'' پڑھی۔ ۱۹۱۳ء میں بیرون موچی دروازہ کے ایک جلسۂ عام میں ''جواب شکوہ'' پڑھی گئی، ''غزوہ شوال'' میں زوال ملت پر اظہار غم کیا گیا۔ یہ نظم روزنامہ ''زمیندار'' کے عید نمبر اور مخزن کے شمارہ اکتوبر میں چھپی۔ ''عندلیب حجاز کی نذر'' (حضور رسالت مآب میں) شاہی مسجد لاہور کے ایک جلسے میں ۱۶ اکتوبر کو پڑھی گئی۔ یہ جلسہ طرابلس پر اٹلی کے حملے کے خلاف اظہار رنج و غم کے لئے منعقد ہوا تھا۔ اگلے سال ۱۶ اپریل ۱۹۱۲ء کو انجمن

---

(۱) نوٹ (۲) سماجی (۳) واقعات

حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ''شمع و شاعر'' پڑھی گئی۔ یہ نظم ملت اسلامیہ کی صورت احوال کے فکر انگیز تجزیے، خودشناسی احساس و پیغام اور اپنے رجائی[1] نقطۂ نظر کے اعتبار سے اقبال کے فکر و فن میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سال یہ نظمیں بھی تخلیق ہوئیں: مسلم، نوید صبح، فاطمہ بنت عبداللہ، محاصرہ ادرنہ، مثنوی ''اسرار خودی'' کی تخلیق کا آغاز بھی اسی زمانہ میں ہوا۔

برصغیر میں مسلمانوں کی نئی سیاسی کروٹ کے لحاظ سے ۱۹۱۱ء۔ ۱۹۱۲ء کا زمانہ تاریخ ساز کہا جا سکتا ہے۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں اور تقسیم بنگال کی تنسیخ سے جہاں ہیجان و اضطراب پیدا ہوا، وہاں سوچ کی نئی راہیں اور جہد و عمل کے لئے ولولۂ تازہ بھی پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں مولانا ظفر علی خان ''زمیندار'' مولانا محمد علی نے ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' جاری کر کے صحافت، سیاست اور قیادت کی ایک عہد آفریں روایت قائم کی۔ اقبال کے ان قائدین سے بھی روابط تھے۔ اکبر الہ آبادی سے بھی ان کے مراسم کا سلسلہ انہی ایام میں شروع ہوا۔ گویا اس انجمن میں اب وہ تنہا نہیں تھے، اگرچہ عمل کی راہیں الگ الگ تھیں۔ اکبر اور اقبال فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے جبکہ ظفر علی خان، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد عملی قیادت کے لئے پر تول رہے تھے۔ مثنوی اسرار خودی کا آغاز ۱۹۱۱ء میں ہو چکا تھا، وقفے وقفے سے شعر آتے تھے، اقبال اس تخلیق کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''فارسی مثنوی کے اشعار ساتھ ساتھ ہو رہے ہیں۔ اس مثنوی کو میں اپنی زندگی کا مقصد تصور کرتا ہوں۔ میں مر جاؤں گا یہ زندہ رہنے والی چیز ہے''۔

عالمی منظر پر پہلی جنگ عظیم کے سیاہ بادل چھا رہے تھے۔ اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''یورپ میں ایک خوفناک جنگ ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کیا عجب کہ یہ وہی جنگ ہو جس کا ذکر پرانی کتب مقدسہ میں ہے، اللہ تعالیٰ دنیا کو امن نصیب کرے اور اہل دنیا کو توفیق نصیب کرے کہ وہ مادیات سے مغلوب ہو کر روحانیت سے غافل نہ ہو جائیں''۔

---

(۱) پر امید

۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو اقبال کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا۔ اس صدمے کو انہوں نے خاص طور پر محسوس کیا اور اپنے غم کا اظہار ایک طویل نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' لکھ کر کیا۔ اس کے ساتھ ہی فارسی مثنوی بھی اختتام کو پہنچی۔ ستمبر ۱۹۱۵ء تک مثنوی اسرار خودی کتابت، طباعت کے مرحلے طے کر لیتی ہے۔ اسرار خودی کے بعد اقبال رموز بے خودی کی تخلیق میں مصروف ہو جاتے ہیں لیکن اسی اثناء میں اسرار خودی پر بحث و مباحثے کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں اور تصوف کے مسئلے پر علمی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جو ''وکیل'' امرتسر اور دوسرے رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن میں اقبال نے دیباچہ کے علاوہ متنازع فیہ[1] اشعار حذف کر دیئے اور اس طرح یہ ناخوشگوار بحث ختم ہو گئی لیکن مثنوی کے دوسرے حصے کی تخلیق میں دیر ہو گئی۔ اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرا تو خیال تھا کہ فرصت کا وقت مثنوی کے دوسرے حصے کو دوں گا جو پہلے سے زیادہ ضروری ہے۔ مگر خواجہ حسن نظامی سے بحث چھڑ کر توجہ اور طرف منعطف کر دی ہے۔ تصوف کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ دو باب لکھ چکا ہوں یعنی منصور حلاج تک، پانچ چار باب اور ہوں گے''۔

اس بحث اور کاروباری مصروفیات میں رموز بے خودی کی تخلیق بھی وقفے وقفے سے جاری تھی۔ جنوری ۱۹۱۷ء میں فرماتے ہیں:

''مثنوی اسرار خودی کے دوسرے حصے کا قریب پانچ سو شعر لکھا گیا ہے مگر ہاتف کبھی کبھی دوچار ہوتے ہیں اور مجھے فرصت کم ہے امید ہے کہ رفتہ رفتہ ہو جائیں گے''۔

پھر چند ماہ بعد ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''رموز بے خودی کو میں اپنے خیال میں ختم کر چکا تھا مگر پرسوں معلوم ہوا کہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ترتیب مضامین کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں آئی کہ ابھی دو تین ضروری

---

(۱) اخذ: فی

مضامین باقی ہیں۔ یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم و مقصود حیات ملیۂ اسلامیہ میں کیا ہے۔ ان مضامین کے لکھ چکنے کے بعد اس حصۂ مثنوی کو ختم سمجھنا چاہئے۔ مگر ایسے ایسے مطالب ذہن میں آئے ہیں کہ خود مسلمانوں کے لئے موجب حیرت و مسرت ہوں گے کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے ملت اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے اسکول [۱] کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اصول حقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرور [۲] ایام واعصار [۳] سے متاثر نہیں ہوسکتی''۔

رموز بے خودی ۱۹۱۷ء کے آخر تک ختم ہوگئی اور ۱۹۱۸ء کے شروع میں چھپ کر شائع ہوگئی۔ مثنوی اسرار و رموز فکر اقبال کا مرکز و محور ہے اس کی تخلیقی غایت [۴] و اہمیت کو خود انہوں نے ایک خط میں بڑے خیال افروز پیرائے میں یوں بیان کیا ہے:

''یہ مثنوی جس کا نام ''اسرار خودی'' ہے ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی [۵] و بے خودی کی طرف ہے۔ مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لئے انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہولے گا میری روح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد ہی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی کیونکہ ہم سب

---

(۱) نئے مکتب فکر کے مسلمان (۲) گزرنا (۳) دن اور زمانے (۴) مقصد

انحطاط[۱] کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر واجزاء اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی[۲] تصور کرتا ہے۔ مگر:

من صدائے شاعر فردا ستم[۳]

اور

نا امید ستم ز یاران قدیم
طور من سوزد کہ می آید کلیم[۴]

نہ خواجہ حسن نظامی رہے نہ اقبال۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم[۵] مخالفت بارآور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ الحمدللہ!

(بنام شاد، ۱۴ اپریل ۱۹۱۶ء)

---

(۱) زوال (۲) سرپرست (۳) میں مستقبل کے شاعر کی آواز ہوں (۴) میں یاران قدیم سے مایوس ہوں میرا طور جل رہا ہے اور کلیم آرہا ہوں (۵) برخلاف

۴.۳.۳۔اہم نکات

یونٹ کے تیسرے حصے کے مطالعے کے بعد اس کی اہم باتیں آپ کے ذہن نشین ہوگئی ہوں گی۔ آیئے دیکھیں وہ کون کون سی ہیں، آپ نے اس حصے کو تین عنوانات کے تحت پڑھا:

۱۔ کاروباری زندگی کی مصروفیات: آپ نے پڑھا کہ علامہ اقبال نے یورپ سے واپس آنے کے بعد سرکاری ملازمت کے مقابلے میں وکالت کے آزاد پیشے کو اختیار کیا اور اسسٹنٹ پروفیسر کا عہدہ چھوڑ کر بطور وکیل چیف کورٹ کام شروع کیا۔ دسمبر ۱۹۱۰ء تک قائم مقام پروفیسر فلسفہ کی حیثیت سے بھی گورنمنٹ کالج لاہور میں کام کیا وکالت کے پیشے سے بھی وہ پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ اس میں آمدنی کم ہوتی ہے اس لئے وہ اس زمانے میں معاشی طور پر پریشان رہے۔ وہ کسی باعزت ذریعہ معاش کو اختیار کر کے اطمینان وسکون کے ساتھ اپنے فکری وفنی شغلوں کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ بعض امراء اور روسا نے انہیں اپنے پاس بلایا اور وظیفہ دینا چاہا لیکن اقبال کی خودداراور غیرت مند طبیعت نے اس قسم کی کسی پیش کش کو قبول نہ کیا۔

۲۔ عائلی زندگی کے مسائل: بزرگوں کی کی ہوئی پہلی شادی سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے یورپ سے آنے کے بعد دو شادیاں اور کیں، عطیہ فیضی کے ساتھ ان کے تعلقات صرف دوستانہ تھے۔ اس بارے میں دوسری تمام باتیں محض افسانے ہیں۔

۳۔ نصب العینی زندگی کی پیش رفت: اس حصے میں آپ نے پڑھا کہ ملک کے سیاسی حالات اور بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے مظالم نے اقبال کی شاعری کو ایک نیا رخ دیا۔ یورپ سے وہ قومی وملی خدمت کا جذبہ لے کر آئے تھے، اب اس کی سمت متعین ہو جاتی ہے اور وہ ملت اسلامیہ کی فکری رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کے زوال کا تجزیہ کرتے ہیں اور ان کو بیدار ہونے اور خود کو پہچاننے کا پیغام دیتے ہیں۔

تصانیف: اسلام کے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی پہلوؤں پر انگریزی میں چند مضامین، اردو میں چند انتہائی اہم نظمیں اس دور میں تخلیق ہوئیں۔ مثلاً شکوہ، جواب شکوہ، شمع وشاعر اور والدہ مرحومہ کی یاد میں یونٹ کے اس حصے میں چند اور نظموں کے نام بھی آئے ہیں، وہ یہ ہیں غزوہ شوال، عندلیب حجاز کی نذر (حضور رسالت مآبؐ میں)، مسلم، نوید صبح، فاطمہ بنت عبداللہ اور محاصرہ ادرنہ۔ فارسی میں طویل نظم ''اسرار خودی'' ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔ اسی نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ اس مثنوی کے دیباچہ اور حافظ پر تنقیدی اشعار اعتراضات اور تنقید کا نشانہ بنے۔ علامہ نے انہیں دوسرے ایڈیشن سے حذف کردیا۔ دوسری فارسی نظم رموز بیخودی کے نام سے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔

۳.۵۔ خود آزمائی نمبر ۳

۱۔ سوالات کے جوابات لکھئے:

۱۔ اقبال نے لاہور میں بیرسٹری کی، یا پروفیسری؟

۲۔ اقبال کو ان دونوں میں سے کون سا پیشہ پسند تھا اور وہ کسے جاری رکھنا چاہتے تھے؟

۳۔ حیدرآباد میں اقبال کو کون سی ملازمت پیش کی گئی تھی؟

۴۔ انگلستان سے واپسی پر معاشی مسئلہ کے بعد اقبال اور کس وجہ سے پریشان تھے؟

۵۔ کیا اقبال اپنی شادی سے مطمئن تھے؟

۲۔ مندرجہ ذیل میں سے صرف صحیح جوابات پر نشان لگائیں:

۱۔ اقبال انگلستان سے واپس لاہور پہنچے

(الف) ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو

(ب) ۱۵ فروری ۱۹۰۷ء کو

(ج) ۱۸ ستمبر ۱۹۰۹ء کو

۲۔ اقبال نے لاہور پہنچ کر کام شروع کیا:

(الف) ملازمت کا

(ب) وکالت کا

(ج) تجارت کا

۳۔ اقبال کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا:

(الف) ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو

(ب) ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو

(ج) ۲۰ مارچ ۱۹۱۷ء کو

۴۔ اقبال کی کتاب شائع ہوتے ہی بحث مباحث کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا:

(الف) رموزِ بے خودی

(ب) بالِ جبریل

(ج) اسرارِ خودی

۵۔ مثنوی رموزِ بے خودی شائع ہوئی:

(الف) ۱۹۱۷ء میں

(ب) ۱۹۱۸ء میں

(ج) ۱۹۱۶ء میں

۴۔ ۱۹۱۸ء سے وفات تک

۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ جنگ کے بعد برصغیر میں ہنگامی قوانین (رولٹ ایکٹ) کا نفاذ ہوا جس کے خلاف ملک میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ۱۰ اپریل کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا اور پنجاب میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء نے متحد ہو کر تحریک خلافت اور ترک موالات کا پروگرام بنایا۔ اقبال عملاً کسی تحریک میں شامل نہیں ہوئے لیکن فکری رہنمائی میں وہ قوم کے شریک حال تھے۔ خلافت کمیٹی میں وہ مسئلہ خلافت کی مذہبی حیثیت کی وجہ سے شامل رہے لیکن جن کانگرس کے اجلاس کلکتہ ۱۹۲۰ء کے بعد تحریک نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا تو وہ اس سے الگ ہو گئے۔ اسی سال پروفیسر نکلسن نے ''اسرار خودی'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اہل مغرب کو اقبال کے فلسفہ خودی سے روشناس کرایا۔ مثنوی اسرار ورموز کے بعد اقبال گوئٹے کے ''دیوان'' کے جواب میں ایک دیوان فارسی میں لکھ رہے تھے۔ مغرب کے مادی ماحول کی گھٹن سے تنگ آ کر گوئٹے کی پیاسی روح مشرق کے روحانی سرچشموں کی طرف دیکھتی رہی۔ ایک صدی بعد اسے ''پیام مشرق'' کی صورت میں جواب ملا۔ اقبال کا یہ فارسی مجموعہ کلام ۱۹۲۳ء میں چھپا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس اپریل ۱۹۲۲ء میں اقبال نے اپنی مشہور نظم ''خضر راہ'' اور اگلے سال (۱۹۲۳ء) میں ''طلوع اسلام'' پڑھی۔

۱۹۲۲ء کے آخر میں اقبال نے انارکلی کے چوبارے کی بجائے میکلوڈ روڈ پر ایک کوٹھی کرائے پر لے لی اور وہاں منتقل ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں سال نو کے موقع پر انہیں حکومت کی طرف سے ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ''سر'' کا خطاب عطا ہوا جس پر بعض حلقوں کی طرف سے طنز وتعریض کے تیر بھی چلائے گئے۔ میر غلام بھیک نیرنگ کے نام اقبال کا یہ خط ان کے اپنے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے:

> ''میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا، مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس فروتر ہیں۔ سینکڑوں خطوط اور تار آئے

اور آ رہے ہیں اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے، سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے، اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں۔ دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاء اللہ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے"۔

گاندھی نے چورا چاری کے واقعہ (مارچ ۱۹۲۲ء) کے بعد سول نافرمانی کو ملتوی کیا تو اس کے ساتھ ہی ترک موالات کی تحریک دم توڑ گئی۔ ہندو مسلم اتحاد نے سر پھٹول کی صورت اختیار کر لی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی اجتماعی قربانیوں کا یہ صلہ دیا کہ ان کے خلاف دل آزار تحریکیں شروع کر دیں۔ اقبال کو اس صورت حال سے سخت تشویش تھی:

"افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی رقابت بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے، اگر یہی حالت رہی تو آئندہ تین سال میں دونوں قوموں کے لئے زندگی مشکل ہو جائے گی"۔ (خط مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء) انہی دنوں بعض اشتراکی (کیمونسٹ) حضرات نے "خضر راہ" اور "پیام مشرق" کے بعض اشعار کے حوالے سے اقبال پر اشتراکیت کی تہمت لگائی۔ اقبال نے سختی سے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا "بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے"۔

زمیندار کے نام اپنے طویل مراسلے میں انہوں نے فرمایا:

"میں مسلمان ہوں میرا عقیدہ ہے اور عقیدہ دلائل[1] و براھین[2] پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی

---

(۱) دلیل جمع (۲) برہان کی جمع یعنی دلیلیں

لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانون میراث، حرمت ربا[1] اور زکوۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے، روسی بولشزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بولشوازم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے'' (زمیندار ۲۴ جون ۱۹۲۳ء)۔

۱۹۲۴ء میں پیام مشرق کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اور اس کے بعد اسی سال اقبال کا پہلا اردو مجموعہ کلام ''بانگ درا'' چھپا۔ ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو اقبال کی لاہور والی اہلیہ کے ہاں جاوید اقبال تولد ہوئے اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو لاہور والی بیوی کا زچگی میں انتقال ہو گیا۔ پیام مشرق اور بانگ درا کی طباعت و اشاعت کے بعد اقبال ''زبور عجم'' کے لئے فارسی کلام تخلیق کرتے رہے۔ یہ مجموعہ تین سال بعد ۱۹۲۷ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اسی زمانے میں اقبال اسلام کے فقہی[2] مسائل و معاملات پر غور و فکر کرتے رہے۔ یہ سلسلہ مسئلہ اجتہاد پر ان کے ایک لیکچر سے شروع ہوا جو انہوں نے ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں حبیبیہ حال کے ایک جلسے میں پڑھا اور بعض حلقوں کی طرف سے اس پر سخت نکتہ چینی ہوئی۔ اقبال نے یہ مضمون طباعت سے روک لیا اور اس مسئلے پر مزید توجہ اور سنجیدگی سے غور و فکر کرنے لگے۔ سید سلیمان ندوی اور دوسرے علمائے اسلام سے بھی ان مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہے اور انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں مضمون بھی پڑھتے رہے یہی فقہی مسائل و معاملات چند سال بعد مدراس اور علی گڑھ میں خطبات کی صورت میں پیش کئے گئے۔

---

(۱) سود کا حرام ہونا (۲) قانونی

ملکی حالات کے علاوہ عالم اسلام کے مسائل سے بھی اقبال گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ اسلامی ممالک میں برپا ہونے والے ہر مدوجذر (۱) پر ان کی نظر تھی۔ سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''دنیائے اسلام اس وقت ایک روحانی پیکار (۲) میں مصروف ہے۔ اس پیکار و انقلاب کا رخ متعین کرنے والے قلوب (۳) واذہان (۴) پر شک وناامیدی کی حالت کبھی کبھی پیدا ہو جاتی ہے'' حجاز پر سلطان نجد عبدالعزیز ابن سعود کے قبضے کے بعد صورت حال پر، جس پر برصغیر کے مسلمانوں میں اختلاف ہو رہا تھا، تبصرہ کرتے ہوئے اقبال ایک اخباری بیان میں کہتے ہیں ''میں حجاز کی موجودہ صورت حال سے پورے طور پر مطمئن ہوں اور ابن سعود پر بدون تذبذب (۵) اعتماد رکھتا ہوں۔ میری رائے میں سلطان نجد (۶) ایک روشن خیال آدمی ہے اور جو لوگ سلطان موصوف سے ملے ہیں یا انہوں نے نجد کو دیکھا ہے وہ میری اس رائے کی موید ہیں۔ امریکہ کا ایک مصنف اپنی کتاب ''الاسلام'' میں سلطان نجد کو ایشیاء کا بہترین حاکم اور سرزمین نجد کو زوال آمدہ دنیائے اسلام کی صاف اور پاک ترین جگہ بتاتا ہے''۔

۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء کو ڈاکٹر اقبال حلقہ لاہور سے صوبائی مجلس قانون ساز کے تین سال کے لئے ممبر منتخب ہوئے دستوری طریق سے یہ ان کے عملی سیاست میں حصہ لینے کی ایک صورت تھی۔ آئندہ چند برسوں میں ملکی سیاست میں جو اہم واقعات رونما ہوئے، ان میں اقبال کے فکروعمل نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ برصغیر کے علمی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں اقبال ایک مدت سے معروف ہو چکے تھے۔ اسرار ورموز اور پیام مشرق کے بعد دوسرے ملکوں میں بھی ان کی شہرت پہنچ گئی تھی۔ لاہور میں ان کی ذات مرجع خلائق (۷) تھی۔ شام کو ان کے مکان پر مجلس آراستہ ہوتی۔ شائقین ان کی زیارت کو پہنچتے۔ ۱۹۲۷ء میں سید سلیمان ندوی انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شرکت کے لئے پہلی بار لاہور آئے، واپس جا کر انہوں نے ''معارف'' میں ان محفلوں کا یہ نقشہ پیش کیا:

---

(۱) اتار چڑھاؤ (۲) جنگ (۳) قلب وجمع دل (۴) ذہن کی جمع (۵) تذبذب کے بغیر، پورے اطمینان سے (۶) مراد سلطان عبدالعزیز ابن سعود، جن کا تعلق حجاز کے علاقہ نجد سے تھا (۷) جس کی طرف لوگ رجوع کریں

''ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے انہوں نے تو ''شمع اور شاعر'' لکھا ہے لیکن میں نے لاہور میں خود ''شاعر کو شمع'' دیکھا اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا۔ ان کی صحبت، لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے۔ ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار، شاعرانہ خیالات، ان کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتی ہیں''۔

اس زمانے میں ایک رائل کمیشن سر جان سائمن کی سرکردگی میں برصغیر کے سیاسی مسئلے پر بات چیت کے لئے لندن سے یہاں آ رہا تھا۔ ملکی سیاست انتشار سے دوچار تھی۔ تحریک خلافت کے زوال پر خود مسلمانوں کے کئی گروہ بن چکے تھے۔ چند دستوری تحفظات (۱) کے ساتھ مخلوط انتخاب یا جداگانہ انتخاب کا مسئلہ مسلمان رہنماؤں میں شدید اختلافات کا باعث تھا۔ بیشتر مسلمان رہنما ابھی تک کانگریس کے دامان سیاست سے وابستہ تھے۔
شدھی (۲) اور سنگھٹن (۳) کی مسلم دشمن تحریکوں اور آریہ سماجیوں (۴) کی دریدہ دہنی نے ہندو اکثریت کے عزائم کو بے نقاب کر دیا تھا لیکن برصغیر کے مسلمان رہ منزل سے بیگانہ ایک عجیب ذہنی و جذباتی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اس صورت حال میں اقبال ایک سیاسی مفکر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء لاہور کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''اس وقت مسلمانوں کے سامنے دو مسائل درپیش ہیں ایک حصول سوراج (۵) کا معاملہ اور دوسرا فرقہ وار نیابت (۶) کے قیام کا معاملہ......... بدقسمتی سے ملک کی اکثریت کے طرز عمل نے مسلمانوں کو حصول سوراج کے مسئلہ کی طرف سے بددل کر رکھا ہے۔ اب انہیں اپنے حقوق ملی کے تحفظ کی فکر بھی لاحق ہو رہی ہے اور مسلمانان ہند کی ترقی کا انحصار اسی مسئلہ پر ہے''۔

---

(۱) ضمانتوں (۲) متعصب ہندو رہنما دیانند سرسوتی کی شروع کی ہوئی تحریک جس کا مقصد ہندوستان کے غیر ہندو باشندوں خصوصاً مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا (۳) اس تحریک کا مقصد ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف منظم کرنا تھا (۴) یہ تحریک دیانند سرسوتی نے ۱۸۵۷ء میں بمبئی میں شروع کی تھی۔ اس کا مقصد ہندوستان سے غیر ہندو اقوام کا خاتمہ اور ہندوستان کو خالص ہندو ملک بنانا تھا (۵) آزادی (۶) نمائندگی۔

ان مسائل کے ساتھ ساتھ ''تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' پر خطبات کی تیاری کی جا رہی تھی۔ ۱۹۲۸ء کے اواخر تک تین خطبات لکھے جا چکے تھے۔ اس میں میر غلام بھیک نیرنگ کے نام ایک خط میں ملک کی تازہ صورت حال اور اپنے خطبات کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاست سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں (۱) کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ بات میں علی وجہ البصیرت (۲) کہتا ہوں اور سیاست حاضرہ کے تھوڑے سے تجربے کے بعد ہندوستان کی سیاست کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ خود مذہب اسلام کے لئے ایک خطرہ عظیم ہے۔ میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے، باقی رہا لیکچروں کے ترجمے کا کام، سو یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل اور از بس مشکل ضرور ہے۔ ان لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اس تعمیر میں میں نے فلسفہ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اردو خواں دنیا کو شاید ان سے فائدہ نہ پہنچے کیونکہ بہت سی باتوں کا علم میں نے فرض کر لیا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کو پہلے سے حاصل ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا تین لیکچر امسال لکھے گئے ہیں، تین آئندہ سال لکھوں گا''۔

---

(۱) کانگریسی یا کانگریس کے ہم نوا مسلمان (۲) اپنی بصیرت کی بنیاد پر

دسمبر ۱۹۲۸ء کی آخر میں اقبال خطبات کے سلسلے میں مدراس جاتے ہوئے دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شرکت کرتے ہیں اور وہاں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضرات! آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے تو ان کو جلد از جلد اپنی اصلاح و ترقی کے لئے سعی و کاوش کرنی چاہئے اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض حصے ایسے ہیں، جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں، جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔ آج ہر قوم اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے سعی و کوشش کر رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے سعی و کوشش نہ کریں''۔

جنوری ۱۹۲۹ء کے پہلے ہفتے میں اقبال نے مدراس میں خطبات دیئے۔ اس کے بعد بنگلور، میسور میں ایک ایک اور حیدر آباد میں مدراس والے تینوں خطبات پیش کئے۔ باقی تین خطبات اسی سال لکھے گئے اور نومبر کے آخر میں علی گڑھ یونیورسٹی میں پیش کئے گئے۔ اگلے سال یہ چھ لیکچر مجموعہ کی صورت میں شائع ہوئے۔ یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ انہی دنوں میں ''جاوید نامہ'' کی تخلیق بھی ہو چکی تھی۔ جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔

اقبال نے شفیع مسلم لیگ کے ساتھ مل کر سائمن کمیشن سے تعاون کیا تھا (اوائل ۱۹۲۸ء اور مسلمانوں کے حقوق و مطالبات کے لئے کمیشن کو محضر (۱) پیش کیا تھا لیکن کمیشن کی رپورٹ سامنے آئی تو انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ کمیشن نے انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی واضح اکثریت کو نظر انداز کر کے صریحاً ان سے بے انصافی کی گئی تھی۔ سندھ کی

(۱) عرضداشت

بمبئی سے علیحدگی کے مطالبے کو بھی نظر انداز کیا گیا تھا اور سرحد و بلوچستان میں دوسرے صوبوں کی طرح آئینی حقوق دینے سے انکار کیا گیا تھا۔ کانگریس نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کر کے جو نہرو رپورٹ تیار کروائی تھی وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے قومی وجود ہی سے منکر تھی۔ مسلمانوں کے لئے یہ صورتحال سخت تشویش انگیز تھی۔ ۱۹۳۰ء کے آخر میں لندن میں پہلی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہندو رہنماؤں کا رویہ مسلم مطالبات کے بارے میں سخت معاندانہ[1] تھا اقبال اور ان کے سیاسی رفقاء اس زمانے میں مسلم اکثریتی صوبوں (پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ) کی ایک آل انڈیا مسلم کانفرنس بلانے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۳۰ء کے آخر میں الہ آباد میں منعقد ہوا۔ اقبال اس اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو انہوں نے اپنا تاریخی خطبہ صدارت ارشاد فرمایا جس میں ملک کو درپیش مسائل کا جائزہ لینے کے علاوہ ہندی قومیت کے تصورات کا عالمانہ تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے برصغیر میں مسلم قومیت اور اسلامی تہذیب کو ایک ٹھوس حقیقت قرار دیا اور ہندوستانی مسئلے کے حل کے لئے اپنی اس آرزو کا اظہار کیا جسے عام طور پر پاکستان کا تخیل کہا جاتا ہے۔ اقبال نے فرمایا:

> ''میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے۔ خواہ اس کے باہر، مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منتظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی''۔

۱۹۳۱ء میں ''جاوید نامہ'' کی تکمیل ہوئی تو اگلے سال کے شروع میں یہ مثنوی شائع ہو گئی، دوسری گول میز کانفرنس (اکتوبر ۱۹۳۱ء) میں اقبال کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی۔ وہ ۷ ستمبر کو لاہور سے روانہ ہو کر ۲۷ ستمبر کو لندن پہنچے۔ کانفرنس میں شرکت کے علاوہ اقبال اپنے پرانے تعلیمی مرکز کیمبرج بھی گئے اور مختلف

---

(۱) مخالفانہ

انجمنوں کی تقریبات میں بھی شریک ہوئے۔ان دعوتوں میں ان کی ملاقات بعض اسلامی ممالک (افغانستان، عراق، البانیہ) کے سفیروں اور دوسرے اکابر سے ہوئی جن میں سید ضیاء الدین طباطبائی (سابق وزیراعظم ایران) حلمی پاشا (سابق[1] خدیو مصر)، رؤف بے (حمیدیہ جہاز کے نامور کپتان) سعید شامل (قفقاز کے مجاہد) قابل ذکر ہیں۔انڈین سوسائٹی کی دعوت میں خطاب کرتے ہوئے اقبال نے اپنی شاعری کی غرض و غایت بیان کی۔اپنی چند نظمیں مع انگریزی ترجمہ کے سنائیں اور اپنی نئی تصنیف ''جاوید نامہ'' کا تعارف کرایا۔

اقبال لٹریری سوسائٹی لندن نے اقبال کے اعزاز میں جو دعوت دی اس میں گول میز کانفرنس کے تقریباً سب مندوبین اور دیگر اہل علم وفن شریک ہوئے۔اس تقریب میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے اپنی زندگی اور فن کے چند نشیب وفراز پر روشنی ڈالی:

> ''۱۹۰۵ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور دلکشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں جو انسان کے لئے امید ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے۔جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہئے۔یہاں پہنچ کر یورپی زندگی اور ادبیات پر نظر ڈالی تو وہ اگرچہ ہمت افزاء نظر آئیں لیکن ان کے مقابلے کے لئے سائنس تھی جو ان کو افسردہ بنا رہی تھی۔۱۹۰۸ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی جو مشرقی ادبیات کی تھی۔ان حالات سے میرے دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ ان ادبیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہئے اور ان میں روح پیدا کرنے کے لئے کوئی نیا سرمایہ حیات فراہم کرنا چاہئے۔میں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور میں اس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز

---

(۱) مصر کے حکمران کا لقب

دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینا چاہئیں لیکن اندیشہ تھا کہ ان سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہر حال میں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مدنظر رکھ کر اپنی مثنوی ''اسرار خودی'' لکھنا شروع کی اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے شروع کرنے کے متعلق اب تک مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج میں یہ راز بھی بتا دوں کہ میں نے کیوں فارسی میں شعر کہنے شروع کئے۔ بعض اصحاب خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لئے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا میں نے اپنی مثنوی ''اسرار خودی'' ابتداء میں صرف ہندوستان کے لئے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی یا سمندر کا سینہ چیر کر یہ یورپ پہنچ جائے گی۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی کی دلکشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اسی زبان میں شعر کہتا رہا''۔

دوسری گول میز کانفرنس میں ہندوؤں اور سکھوں کی متحدہ مخالفت کی وجہ سے اقلیتوں کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اقبال ۱۹ نومبر کو مسلمانوں کے وفد علیحدہ ہوئے اور ۲۱ نومبر کو مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ روم کے لئے روانہ ہو کر ۲۲ نومبر کو وہاں پہنچے۔ روضتہ الکبریٰ کے آثار قدیمہ دیکھے ۲۵ نومبر کو سابقہ شاہ افغانستان امیر امان اللہ خان سے ملاقات کی اور تین گھنٹے ان کے ساتھ رہے۔ ۲۶ نومبر کو اکیڈمی میں لیکچر دیا۔ ۲۷ نومبر کو شاہ امان اللہ خان بازدید[1] کے لئے آئے اور دو گھنٹے تک اقبال کے ساتھ رہے۔ اسی روز اقبال اٹلی

(۱) جوابی ملاقات

کے ڈکٹیٹر مسولینی سے ملے اور ۲۹ نومبر کو اٹلی سے روانہ ہو کر یکم دسمبر کو سکندریہ (مصر) پہنچے۔ جمعتہ شعبان المسلمین کے کارکن اور دوسرے مصری رہنما استقبال کے لئے آئے تھے۔ شام کو قاہرہ پہنچے اور ۵ دسمبر تک یہاں مختلف انجمنوں کی دعوتوں میں شریک ہوئے اور مصری اکابر سے ملاقاتیں کرتے رہے پھر قاہرہ سے بذریعہ ٹرین روانہ ہو کر ۶ دسمبر کی صبح کو فلسطین پہنچے جہاں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا یہاں مفتی اعظم السید امین الحسینی اور دیگر فلسطینی زعماء نے اقبال کا استقبال کیا۔ ۷ دسمبر بیت المقدس میں الموتمر العالم الاسلامی کے اجلاس شروع ہوئے ۱۴ دسمبر کو مؤتمر کے جلسے میں الوداعی خطاب کرتے ہوئے اقبال نے کہا:

''افسوس میں موتمر کے اختتام تک نہیں ٹھہر نہیں سکتا اور مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ عربی زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کی سبب مباحث میں بھی زیادہ حصہ نہ لے سکا میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ مقامات مقدسہ اسلامیہ فلسطین کی زیارت کروں جو انبیاء کی سرزمین ہے میں آپ لوگوں کو اس روح اخوت و مودت[1] پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جس کا مظاہر مسلسل ہوتا رہا۔ ہم پر واجب ہے کہ اپنے نوجوانوں کو سلامتی کی راہ پر چلائیں۔ اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے ایک الحاد[2] مادی کی طرف سے اور دوسرا وطنی قومیت کی طرف سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں۔ اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی روح ان دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے۔ وطنی قومیت یا وطنیت بجائے خود بری چیز نہیں لیکن اگر اس میں خاص اعتدال ملحوظ نہ رکھا جائے اور افراط و تفریط ہو جائے تو اس میں دہریت اور مادہ پرستی کے پیدا ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ دل سے مسلمان بنیں۔ مجھے اسلام کے دشمنوں سے اندیشہ نہیں لیکن خود مسلمانوں سے اندیشہ ہے۔

---

(۱) پیار، محبت، دوستی (۲) بے دینی

آنحضرت ﷺ کی ایک نہایت پیاری حدیث یاد آتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''انا حظکم من الانبیاء وانتم حظی من الامم (۱)''

''میں تو جب کبھی سوچتا ہوں شرم وندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر فخر کریں؟ ہاں! جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہو سکیں گے۔ حضورؐ ہم پر فخر کریں''۔

۱۵ دسمبر کو اقبال بیت المقدس سے روانہ ہو کر پورٹ سعید آئے اور وہاں سے بحری جہاز پر سوار ہو کر ۲۸ دسمبر کو بمبئی اور وہاں سے بذریعہ ٹرین ۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور پہنچ گئے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمائندے کو اپنے دورہ فلسطین کے تاثرات بیان کرتے ہوئے اقبال نے کہا:

''سفر فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔ فلسطین کے زمانہ قیام میں متعدد اسلامی ممالک مثلاً مراکش، مصر، یمن، عراق، فرانس اور جاوا کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوان عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ہوا''۔

فلسطین کے دوران قیام میں جو کیفیات اقبال کے قلب و ذہن پر گزریں ان کے نقوش ان کی طویل نظم ''ذوق وشوق'' میں نمایاں ہیں۔ یہ نظم ان کے دوسرے اردو مجموعہ کلام بال جبریل میں شامل ہے۔

۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس بیرون دہلی دروازہ میں اقبال نے صدارتی خطبے میں گول میز کانفرنس کی تفصیل پیش کی اور درپیش سیاسی مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے مستقبل کے امکانات پر روشنی ڈالی۔ ہندوستان کی آزادی اور اقوام ہند کی مفاہمت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس وقت ہندوؤں (اور ان کے آلہ کار پنجابی سکھوں) کا یہ غیر معقول رویہ تھا کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو ان کا جائز اور منصفانہ حق ہر لحاظ بہ آبادی کسی صورت میں نہ دیا جائے۔ اقبال کے نزدیک یہ

---

(۱) میں پیغمبروں میں تمہارا حصہ ہوں اور تم امتوں میں میرے حصے میں آئے ہو

ایک بنیادی انسانی مسئلہ تھا جس کے بارے میں برادرانِ وطن انگریزی حکمرانوں اور عالمی رائے عامہ کے ضمیر کو جھنجھوڑنا ضروری تھا خصوصاً پنجاب کا مسئلہ اس لیے بھی نازک ہو رہا تھا کہ یہاں ہندو قوم سکھوں کو اپنی ڈھال بنا کر اپنی نامعقول روش میں جذباتی ہیجان اور اشتعال پیدا کر رہی تھی۔ دوسری طرف بعض نام نہاد مسلمان رہنما یونینسٹ پارٹی کے پرچم تلے زمیندار، دیہاتی اور شہری کی تفریق کر کے مسلمانوں میں مزید انتشار پیدا کر رہے تھے اور یہ بات مستقبل قریب میں مسلمانوں کی قومی ہستی کو برصغیر میں سخت متاثر کرنے والی تھی۔ اقبال کو اس کا شدید احساس تھا اور وہ اس کھلی بے انصافی کے خلاف جہاد کو اپنی بقیہ زندگی کا نصب العین قرار دے چکے تھے۔ اقبال کا یہ سیاسی کردار برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں از حد اہمیت رکھتا ہے۔ ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے لاہور میں ''پہلا یوم اقبال'' منایا جس کے دو اجلاس ہوئے اس طرح شاعر ملت کو اس کی زندگی میں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اقبال اس موقع پر ہوٹل سٹفلو میں دعوت استقبالیہ میں شریک ہوئے۔ اسی سال ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' لاہور نے اقبال نمبر شائع کیا۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان روانہ ہوئے اور ۳۰ دسمبر تک لندن میں رہے۔ اس دوران میں انہوں نے ارسٹوٹلین سوسائٹی لندن میں ''کیا مذہب کا امکان ہے''؟ کے موضوع پر خطاب کیا جو ان کے خطبات ''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' کے آکسفورڈ ایڈیشن کا ساتواں خطبہ ہے۔

گول میز کانفرنس کے بعد اقبال فرانس آئے اور پیرس میں فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں سے ملاقات کی۔ پھر یہاں سے تین ہفتے کے لیے ہسپانیہ کی سیاحت کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس سیاحت نے اقبال کے قلب و نظر کو بے حد متاثر کیا۔ ان تاثرات کو انہوں نے مختلف موقعوں پر بیان کیا ہے۔

> ''میں علاوہ اور مقامات کے قرطبہ، اشبیلیہ اور میڈرڈ گیا۔ میں نے مدینۃ الزاہرا کے کھنڈرات بھی دیکھے۔ سپین کے جنوب کی آبادقوم مورش نسل ہونے پر اور اسلامی تہذیب کے ان آثار پر جو ان کے ملک میں موجود ہیں فخر کرتی ہے۔ وہاں بھی ایک نئی

ذہنیت پیدا ہورہی ہے۔ جو تعلیم کے ساتھ ساتھ ترقی کرے گی لوتھر نے جو مذہبی اصلاح کی تھی وہ نامعلوم طریقوں سے ترقی کررہی ہے۔ اور پادریوں کا اثر تمام یورپ میں عموماً اور سپین میں خصوصاً کم ہورہا ہے''۔

لارڈ لوتھیان کے نام جوابی خط میں فرانس اور سپین میں اپنی مصروفیات کی تفصیل پیش کرتے ہیں:

''آپ کے عنایت نامے کا بہت بہت شکریہ! جو کل دہلی سے واپسی پر مجھے موصول ہوا۔ میں لندن سے ۳۰ دسمبر کو روانہ ہوا اور پیرس میں رکنے کے بعد ہسپانیہ چلا گیا جہاں میں نے تقریباً تین ہفتے گزارے۔ فروری کے آخر میں ہندوستان پہنچا۔ آپ کا خط مجھے اسی وجہ سے اتنی تاخیر سے ملا۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ نے میری کتاب خطبات کو پسند کیا ہے۔ آپ نے آکسفورڈ کے مسٹر تھامس ایڈورڈ کو خط لکھا تھا چنانچہ اس ضمن میں انہوں نے مجھے لکھا اور میں نے انہیں کتاب کے دو نسخے روانہ کر دیئے ہیں اگر آکسفورڈ یونیورسٹی ان خطبات کی طباعت واشاعت کا فیصلہ کرتی ہے تو میں خطبات میں کہیں کہیں تھوڑا بہت رد و بدل کروں گا اور اپنے اس خطبے بعنوان ''کیا مذہب کا امکان ہے''؟ کا اضافہ بھی کروں گا جو میں نے لندن کی ارسطا طالین سوسائٹی کے سامنے دیا تھا۔ ہسپانیہ اور فرانس میں میرا وقت بہت دلچسپی سے گزرا۔ پیرس میں قیام کے دوران برگساں سے ملاقات ہوئی۔ جدید فلسفے اور تمدن پر ہماری گفتگو تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ کچھ وقت ہم نے برکلے پر تبادلہ خیال کیا جس کے فلسفے پر بعض فرانسیسی فلاسفروں نے بعض نہایت دلچسپ مشاہدات پیش کیئے ہیں۔ ہسپانیہ میں قیام کے دوران میں عربی کے بہت سے پروفیسروں سے میرا ربط قائم ہوا جو اسلام کے کلچر کے بارے میں بہت پرجوش نظر آتے ہیں۔ میڈرڈ یونیورسٹی نے ہسپانیہ اور عالم اسلام کا ذہنی ارتقاء کے موضوع پر مجھ سے خطاب کرنے کی درخواست کی۔ میرے خطاب کو بے حد سراہا گیا۔ صدارت پروفیسر آسن نے کی جو ''ڈیوائن

کا میڈی آف اسلام'' کے معروف مصنف ہیں۔ ہسپانیہ کی نئی حکومت غرناطہ کو دنیائے اسلام کے لیے ایک طرح کا تہذیبی مکہ بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ میرے خیال میں مناسب ترین وقت یہی ہے کہ انگلستان کو اسلام کے تہذیبی پہلو میں سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی لینی چاہئے۔ درحقیقت ایک معاشی نظام کی حیثیت سے اسلام کہیں زیادہ دلچسپ ہے اور ہماری موجودہ مشکلات کے کہیں زیادہ عملی حل تجویز کرتا ہے''۔

ہسپانیہ میں مسجد قرطبہ کو دیکھ کر اقبال خاص طور پر متاثر ہوئے اور یہ تاثر ان کی طویل نظم ''مسجد قرطبہ'' کی تخلیق کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس بارے میں ایس۔ ایم اکرام کو لکھتے ہیں:

''میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر لکھی جو کسی وقت شائع ہوگی۔ الحمراء کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی''۔

''مسجد قرطبہ'' کے علاوہ ہسپانیہ کی سیاحت کے دوران مندرجہ ذیل نظمیں تخلیق ہوئیں: دعا، ہسپانیہ، طارق کی دعا، (اندلس کے میدان جنگ میں) عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اندلس میں، قید خانہ میں معتمد کی فریاد۔

تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آنے کے بعد اقبال سیاسی اجتماعات میں شرکت سے گریز کرنے لگے۔ مارچ کے تیسرے ہفتے میں جامع ملیہ دہلی میں غازی رؤف پاشا کے دو لیکچروں میں صدارت کے فرائض انجام دیئے اور صدارتی تقریر کے دوران مسجد قرطبہ کا آخری بند بھی سنایا۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں اقبال سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کے ہمراہ افغانستان گئے۔ محمد نادر شاہ غازی نے انہیں تعلیمی مسائل میں مشورے کے لئے بلایا تھا۔ وہاں انہوں نے مختلف مقامات کی سیاحت کی۔ محمود غزنوی اور دوسرے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی۔ حکیم سنائی کے مزار پر کچھ اشعار بھی تخلیق ہوئے۔ سیاحت افغانستان کے تاثرات فارسی مثنوی ''مسافر'' میں ظہور پذیر ہوئے۔

۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کے کانووکیشن میں پنجاب یونیورسٹی نے اقبال کو ڈی ۔لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی ۔ چند برس قبل انکو درد گردہ اور نقرس (۱) کی تکلیف ہوئی تھی ۔حکیم نابینا کے علاج سے درد گردہ کی تکلیف تو رفع ہوگئی تھی البتہ نقرس کی شکایت کبھی کبھی ہو جاتی تھی ۔جنوری ۱۹۳۴ء میں ان پر انفلوئنزا کا حملہ ہوا۔ جسے شروع میں معمولی نزلہ بخار سمجھا گیا لیکن اس سے گلے کی تکلیف اور دمے کی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مستقل عارضے کی صورت اختیار کر لی۔مقدمات کی پیروی ان کے لئے مشکل ہوگئی۔آکسفورڈ یونیورسٹی نے اقبال کو روڈس لیکچر کے لئے دعوت دی تھی اور انہوں نے ''زمان ومکان فلسفہ اسلام کی تاریخ میں'' کے موضوع پر ۱۹۳۵ء میں انگلستان جا کر خطبات دینے کا پروگرام بنالیا تھا اور اس کے لئے تیاری بھی شروع کر دی تھی لیکن گلے کی تکلیف، مسلسل علالت اور اہلیہ کی رحلت کی وجہ سے یہ پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔تاہم تفصیلی اور تخلیقی کاموں کا سلسلہ جاری رہا۔۱۹۳۴ء میں اردو مجموعہ کلام ''بال جبریل'' تیار ہو چکا تھا (یہ مجموعہ جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوگیا) اس عرصے میں ان کے لئے ایک نئی پریشانی اہلیہ (والدہ جاوید) کی صورت میں نمودار ہوئی ۔نومبر ۱۹۳۴ء میں جاوید منزل کی تعمیر شروع ہوئی ۔دسمبر ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نے اقبال کو ڈی ۔لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی ۔مئی ۱۹۳۵ء کے تیسرے ہفتے میں اقبال میکلوڈ روڈ کی اقامت گاہ سے اپنی نو تعمیر کوٹھی ''جاوید منزل'' میں آ گئے اور یہاں آنے کے تین روز بعد ان کی اہلیہ رحلت فرما گئیں ۔گزشتہ سال سے گلا بیٹھ جانے کی وجہ سے اقبال کی وکالت کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ ذریعہ معاش مسدود ہو جانے کی وجہ سے وہ خاصے پریشان تھے ۔ گلے کے علاج کے لئے حکیم نابینا اور ڈاکٹروں کی کوششیں جاری تھیں ۔بھوپال میں علاج بذریعہ برقی شعاع کے لئے بھی وہ جاتے رہے ۔لیکن معمولی افاقے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا تھا۔سر راس مسعود اس زمانے میں بھوپال میں وزیر تعلیم تھے ۔ان کی خواہش تھی کہ اقبال فکر معاش سے بے نیاز ہو کر علمی کام کرتے رہیں ۔ بالآخر مئی ۱۹۳۵ء سے والئی بھوپال سر حمید اللہ خان نے تاحیات اقبال کے پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ خاص مقرر کر دیا۔اقبال تشکر و امتنان کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) پیر کے پنجے خصوصاً انگوٹھے کا درد

''ڈیئر مسعود! آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ میں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں انہوں نے ایسے وقت میری دستگیری فرمائی جب کہ میں چاروں طرف آلام و مصائب میں محصور تھا خدا تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے''۔

علالت اور مشکلات کے باوجود اقبال کے تصنیفی کاموں کے سلسلہ اور قومی، سیاسی مسائل پر غور و فکر جاری رہا۔ ضعف بصارت کی وجہ سے مطالعے کا دائرہ محدود ہو چکا تھا۔

''میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی''۔ بال جبریل کی اشاعت کے بعد ''ضرب کلیم'' کے مجموعے کی تخلیق جاری تھی۔ ۱۹۳۵ء میں اقبال نے ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' کے موضوع پر ایک آرٹیکل لکھا جو مختلف انگریزی اخباروں میں شائع ہوا۔ سٹیٹس مین نے مضمون شائع کرنے کے علاوہ اس پر اداریہ بھی لکھا۔ کشمیر کمیٹی کے معاملات میں اقبال کو قادیانیوں کے اصل رخ کردار کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ یہ مضمون حقائق سے باخبر ہونے کے بعد لکھا گیا۔ اس کے بعد پنڈت نہرو نے اس مسئلے پر بالاقساط تین مضمون ''ماڈرن ریویو'' میں لکھے ایک مضمون میں قادیانیوں کی حمایت کی گئی تھی۔ اقبال نے اس کے جواب میں ''اسلام اور احمدیت'' کے موضوع پر جنوری ۱۹۳۶ء میں ایک طویل مضمون لکھ کر تاریخی طور پر بتایا کہ ''مسلمانوں کے مذہبی فکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے''۔ پنڈت نے اس سے متاثر ہو کر اقبال کو خط لکھا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: ''میں نے اپنا مضمون محض اسلام اور ہندوستان کی بہتری کے لیے لکھا میرا ذہن اس بارے میں ہر شبہ سے پاک ہے کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں''۔

گول میز کانفرنس کے بعد انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء بنا۔ اس ایکٹ کے صوبائی حصے پر عمل درآمد کے سلسلے میں ۱۹۳۶ء میں انتخابات کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کے انہدام کا سانحہ پیش آیا جس نے پنجاب کے سیاسی حالات پر گہرے اثرات ڈالے۔ اسی زمانے میں مسٹر محمد علی جناح انگلستان سے واپس آ کر مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام شروع کر چکے تھے۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں

میں اتحاد یکجہتی پیدا کرنے کے لیے وہ برصغیر کا دورہ کر رہے تھے۔ مئی ۱۹۳۶ء میں وہ لاہور آئے اور اقبال سے بھی ملے۔ اقبال اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے کنارے پر رہ کر ہی سیاسی عمل میں حصہ لے سکتے تھے۔ ان کی مفکرانہ بصیرت نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ مستقبل کی سیاست میں پنجاب کی سرزمین رزم گاہ[1] بننے والی ہے۔ چنانچہ انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کا پورا پورا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اور پارلیمانی بورڈ کی تشکیل اور مسلم لیگ کے قیام و استحکام میں سرگرم ہوئے۔ مسلم لیگ پہلی بار عوام سے رابطہ پیدا کر کے اور پارلیمانی بورڈ بنا کر براہ راست انتخاب میں حصہ لے رہی تھی۔ اقبال نے پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اس کے عوامی پہلو پر خاص طور پر زور دیا۔ مسلم لیگ نے پنجاب میں صرف دو نشستیں حاصل کیں۔ لیکن یہ آغاز تھا اس تاریخی نیک انجام کا جو آگے چل کر مطالبہ پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء اور پھر ظہور پاکستان (۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) پر پہنچا۔ اس زمانے میں اقبال کے تاریخ ساز کردار کے بارے میں ان کے وہ مشورے دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں جو انہوں نے انتخابات کے بعد قائداعظم محمد علی جناح کو دیئے۔ یہ وہ نازک موقع تھا جب انڈین نیشنل کانگرس کو انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تھی اور اس کامیابی کے پندار[2] میں کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے صوبائی اسمبلیوں کے کانگریسی اراکین کے آل انڈیا کونشن (منعقدہ دہلی ۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء) میں ہندوستانی مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور صرف اقتصادی مسئلے ہی کو ملک کا اصل مسئلہ قرار دیا۔ اقبال اس پر کتنے بے چین ہوئے ہوں گے، اس کا اندازہ اس خط سے کیا جا سکتا ہے جو دوسرے ہی روز (یعنی ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو) انہوں نے قائداعظم کو لکھا:

> ''میرا خیال ہے کہ آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ خطبہ جو انہوں نے آل انڈیا نیشنل کونشن میں دیا ہے، پڑھا ہوگا اور اس کے بین السطور[3] جو پالیسی کارفرما ہے اس کو آپ نے بخوبی محسوس کر لیا ہوگا۔ جہاں تک اس کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں سے ہے میں سمجھتا ہوں کہ آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ نئے دستور نے ہندوستان کے

---

(۱) میدان جنگ (۲) غرور (۳) مراد اس کے اندر پوشیدہ۔

مسلمانوں کو کم از کم اس بات کا ایک نادر موقع دیا ہے کہ وہ ہندوستان اور مسلم ایشیاء کی آئندہ سیاسی ترقی کے پیش نظر اپنی قومی تنظیم کر سکیں۔ اگرچہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہیں تاہم ہمیں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت حد تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر ہے۔ اس لئے میری تجویز ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک مؤثر جواب دیا جائے۔ آپ جلد از جلد دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں جس میں شرکت کے لئے نئی صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے علاوہ دوسرے مقتدر مسلمانوں کو بھی مدعو کریں اس کنونشن میں پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیں کہ سیاسی مطمع نظر کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند ملک میں جداگانہ سیاسی وجود رکھتے ہیں۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ اندرون اور بیرون ہند کی دنیا کو بتا دیا جائے کہ ملک میں صرف اقتصادی مسئلہ ہی تنہا مسئلہ نہیں ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے ثقافتی مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے اور کسی صورت سے بھی یہ اقتصادی مسئلے سے کم اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ اگر آپ ایسا کنونشن منعقد کر سکیں تو پھر ایسے مسلم اراکین اسمبلی کی حیثیتوں کا امتحان ہو جائے گا جنہوں نے مسلمانانِ ہند کی امنگوں اور مقاصد کے خلاف جماعتیں قائم کر رکھی ہیں۔ مزید برآں اس سے ہندوؤں پر یہ عیاں ہو جائے گا کہ کوئی سیاسی حربہ خواہ کیسا ہی عیارانہ کیوں نہ ہو، پھر بھی مسلمانانِ ہند اپنے ثقافتی وجود کو کسی طور پر نظرانداز نہیں کر سکتے"۔

اس خط کے پس منظر میں قائداعظم کی اس للکار کو دیکھیے جو انہوں نے پنڈت نہرو کی کلکتہ کی تقریر کے اس فقرے پر کہ ہندوستان میں آج صرف دو فریق موجود ہیں یعنی کانگریس اور برطانوی حکومت بڑے زوردار طریق سے کہا تھا ہندوستان میں دو نہیں، تین فریق ہیں۔ کانگریس، برطانوی حکومت اور مسلمان' اعلان حق میں اقبال کا مشورہ مکمل طور پر شامل تھا، بعد کے خطوط میں بھی اقبال نے قائداعظم کو جو مشورے دیئے وہ

نشان منزل ثابت ہوئے چنانچہ قائداعظم نے ان کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ خطوط زبردست تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، بالخصوص وہ خطوط جن میں مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے بارے میں ان کے خیالات کا واضح اور غیر مبہم اظہار ہے۔ان کے خیالات پورے طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور بالآخر میں ہندوستان کے دستوری مسائل کے مطالعہ اور تجزیہ کے بعد انہی نتائج پر پہنچا اور کچھ عرصہ بعد یہی خیالات ہندوستان کے مسلمانوں کی اس متحدہ خواہش کی صورت میں جلوہ گر ہوئے جس کا اظہار آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی منظور کردہ قرار داد لاہور جو عام طور پر قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہے''۔

زندگی کے آخری ایام میں اس تاریخ ساز سیاسی خدمت کے ساتھ ساتھ تخلیق شعر کا عمل بھی جاری رہا۔اردو مجموعہ کلام ''ضرب کلیم'' کی طباعت اگست ۱۹۳۶ء میں ہوگئی تھی اسی سال ایک فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' تخلیق ہوئی جو نومبر ۱۹۳۶ء میں مع ''مسافر'' شائع ہوئی۔ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کی تخلیق بھی اسی سال ہوئی۔مزید فارسی و اردو کلام کی آمد جاری رہی اور اگلا مجموعہ کلام تیار ہوتا رہا۔

۱۹۳۷ء میں اقبال نے اپنے بچوں (جاوید اور منیرہ بانو) کے لئے سرپرست مقرر کر دیئے اور وصیت نامہ لکھ کر سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ کرا دیا۔اس سال کی عام صحت اور زندگی کے معمولات کے بارے میں ۱۳ جون ۱۹۳۷ء کو خط میں لکھتے ہیں:

''میری زندگی بہ نسبت سابق بہتر ہے لیکن بحیثیت مجموعی ایک دائم المریض (۱) کی زندگی بسر کر رہا ہوں تاہم صابر اور شاکر ہوں۔انشاء اللہ جب موت آئے گی تو مجھے متبسم پائے گی۔قصد تو یہ تھا کہ زندگی کے باقی دن جرمنی اور اٹلی میں گزار دوں مگر بچوں کی تربیت کس پر چھوڑ دوں خصوصاً جب کہ میں ان کی مرحوم ماں سے یہ عہد کر چکا

---

(۱) ہمیشہ مریض رہنے والا

ہوں کہ جب تک بالغ نہ ہوں جائیں ان کو اپنی نظر سے اوجھل نہ کروں۔ان حالات میں یورپ کا سفر اور وہاں کی اقامت ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو زیادہ سے زیادہ مکہ ہوتا ہوا ممکن ہے مدینہ پہنچ سکوں۔اب مجھ ایسے گنہگاروں کے لئے آستانِ رسالتؐ کے سوا اور کہاں جائے پناہ ہے''۔

۱۹۳۸ء میں یورپ کی فضا ایک نئی عالمگیر جنگ کے خطرے سے غبار آلود ہو رہی تھی اور مغربی تہذیب اپنی سائنسی ترقیوں اور مہلک ہتھیاروں کے ساتھ اپنے حشر کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔حبشہ، فلسطین، سپین اور چین کے مصائب عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ رہے تھے۔اس بھیانک عالمی منظر میں اقبال نے آل انڈیا ریڈیو کے لاہور سٹیشن سے یکم جنوری ۱۹۳۸ء سال نو کی نشری تقریر میں سامراجی طاقتوں کو انتباہ کیا کہ وہ اپنے عبرتناک انجام کا احساس کریں، ساری دنیا کو ایک خدا کی مخلوق سمجھ کر احترام آدمیت کے مسلک کو اپنائیں جو رنگ، نسل، زبان اور قومیت کے امتیازات سے بالاتر ہے۔اس کے بغیر نہ دنیا کو خوشحالی و اطمینان نصیب ہوگا اور نہ حریت مساوات، بھائی چارے کے الفاظ شرمندہ معنی ہو سکتے ہیں۔

مسلم براورہڈ کی طرف سے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور میں یوم اقبال منایا گیا۔عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی علامہ اقبال کو اعزازی ڈی لٹ کی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا۔اس موقع پر نظام دکن نے ایک ہزار کا چیک بھی علامہ اقبال کو بھجوایا جسے انہوں نے واپس کر دیا۔

دمے کے شدید دورے پڑ رہے تھے۔وقت رحلت قریب آ رہا تھا مگر صبر و شکر کا پیکر مجسم شدائد مرض کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لئے زندگی کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔معمول کے کام جاری تھے شام کی محفل بھی آراستہ ہوتی رہی۔خطوں کے جواب بھی لکھوائے جاتے رہے۔قومی مسائل بھی سوچے جاتے اور تخلیق شعر بھی ہوتی رہی اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علی الصبح تقریباً سوا پانچ بجے صبر و شکر، فقر و استغنا کا یہ پیکر راہی عالم بقا ہو گیا۔انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ؁

آخری فارسی، اردو مجموعہ کلام ''ارمغان حجاز'' ان کی رحلت کے چند ماہ بعد شائع ہوا۔اقبال دور حاضر کے، غالباً سب سے بڑے عاشق رسول تھے ان کی آخری آرزو یہی تھی کہ وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ

جائیں اور خانہ کعبہ کا طواف کریں اور روضۂ رسولؐ پر حاضری دیں، اپنا آخری مجموعہ کلام وہ ہدیہ عقیدت و محبت کے طور پر دیارِ رسالت پناہی میں لے جانا چاہتے تھے لیکن ان کی یہ آرزو زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔ ارمغان حجاز کی یہ رباعی اقبال کی اسی آخری آرزو کی آئینہ دار ہے:

سرود رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟

سرآمد روزگار این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟[1]

---

(۱) گیا ہوا نغمہ واپس آئے نہ آئے نسیم حجاز آئے یا نہ آئے
اس فقیر کا زمانہ ختم ہوا اب کوئی اور دانائے راز آئے یا نہ آئے

۱۔۴۔ اہم نکات

یونٹ کے چوتھے حصے کے شروع ہی میں آپ نے پڑھا کہ پروفیسر نکلسن نے ''اسرارِ خودی'' کا انگریزی میں ترجمہ کر کے مغرب والوں کو اقبال کے فلسفۂ خودی سے روشناس کیا۔اس حصے میں اقبال کی سیاسی زندگی کے بہت سے پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں وہ اگرچہ قائداعظم کی طرح عملی سیاستدان نہ تھے لیکن ایک مفکر سیاستدان کی حیثیت سے وہ تمام عمر عالمِ اسلام اور ملکی سیاست میں دلچسپی لیتے رہے۔آیئے ان کی اسی سیاسی زندگی کے اہم پہلوؤں کا جائزہ لیں۔

۱۔ انگریزوں کے ظلم وتشدد کے خلاف جو تحریکیں چلیں، علامہ اقبال نے ان میں عملاً حصہ تو نہیں لیا لیکن فکری سطح پر رہنمائی کرتے رہے۔

۲۔ پنجاب سے انہوں نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔حلقہ لاہور سے صوبائی مجلس قانون ساز کے تین سال کے لئے ممبر منتخب ہوئے (۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء)

۳۔ رائل کمیشن کے آمد کے موقع پر جب ملکی سیاست انتشار کا شکار تھی مسلمان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ان کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا علامہ اقبال نے ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے مسلمانوں کے سیاسی مسائل کی نشاندہی کی یعنی آزادی کا حصول اور فرقہ ورانہ نیابت کے قیام کا معاملہ (۱۹۲۱ء)

۴۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرس میں شرکت کی اور تقریر میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ سیاسی پروگرام کی ضرورت پر زور دیا۔

۵۔ شفیع مسلم لیگ کے ساتھ مل کر سائمن کمیشن سے تعاون کیا لیکن کمیشن کی رپورٹ سے انہیں سخت مایوسی ہوئی جس میں کھلم کھلا مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کی گئی تھی (۱۹۲۸ء)

۶۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آلہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں وہ تاریخی خطبہ دیا جس میں پاکستان کا تصور پیش کیا گیا۔

۷۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرس میں شریک ہوئے۔

۸۔ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو آل انڈیا مسلم کانفرس دہلی کے اجلاس کے صدارتی خطبے میں گول میز کانفرنس کی تفصیل پیش کی اور ملک کو درپیش سیاسی مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے مستقبل کے امکانات پر روشنی ڈالی۔

۹۔ پنجاب کی سیاست میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

۱۰۔ تیسری گول میز کانفرس (۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء) میں شرکت کی۔

۱۱۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے قائداعظم کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کی تنظیم نو میں پورا پورا تعاون کیا۔

۱۲۔ ہندوستان کی سیاست اور سیاسی مستقبل کے بارے میں قائداعظم کو خطوط لکھے اور انہیں اہم سیاسی مشورے دیئے ان کے یہ خطوط ہندوستان کی سیاست میں زبردست تاریخی اہمیت رکھتے ہیں جس کا اعتراف خود قائداعظم نے کیا۔ یونٹ کے اس حصے کا دوسرا اہم پہلو علمی اور تخلیقی ہے اس کے تین حصے بنا لیتے ہیں۔

مضامین، خطبات اور خطوط

۱۔ اسلام کے فقہی مسائل، معاملات پر مضامین جو ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے نام سے ۱۹۳۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے اور خطبات کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں (کل سات خطبات ہیں)

۲۔ خط زمیندار کے نام جس میں انہوں نے اشتراکی ہونے کی تردید کی روسی بالشوزم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اسلام کے نظام کو اعتدال کی راہ میں بتایا۔

۳۔ ۱۹۳۵ء میں قادیانی اور جمہور مسلمان کے موضوع پر ایک مضمون پھر ۱۹۳۶ء میں نہرو کے مضمون کے جواب میں اسلام اور احمدیت کے موضوع پر ایک اور مضمون لکھا۔

تقاریر

۱۔ اقبال لٹریری سوسائٹی لندن کی تقریب میں تقریر کی (۱۹۳۱ء) جس میں مشرقی اور مغربی ادبیات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور فارسی میں شعر کہنے کی غرض بیان کی۔

۲۔ فلسطین میں مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس سے خطاب کیا (۱۹۳۱ء) جس میں ان خطرات کی نشاندہی کی جن سے اسلام دوچار ہے یعنی وطنی قومیت اور مادی الحاد۔

۳۔ میڈرڈ یونیورسٹی میں ہسپانیہ اور عالم اسلام کے ذہنی ارتقا کے موضوع پر خطاب کیا (۱۹۳۲ء)

شعری تصانیف

۱۔ پیام مشرق (۱۹۲۳ء) گوئٹے کے دیوان کے جواب میں فارسی میں لکھی۔

۲۔ بانگ درا (۱۹۲۴ء) پہلا اردو مجموعہ کلام

۳۔ زبور عجم (۱۹۲۷ء) فارسی۔

۴۔ جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) فارسی۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کی طرز پر

۵۔ بال جبریل (۱۹۳۵ء) اردو۔

۶۔ ضرب کلیم (۱۹۳۶ء) اردو۔

۷۔ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق (۱۹۳۶ء)
مع مثنوی مسافر (۱۹۳۳ء) جو حکیم سنائی کے مزار پر افغانستان میں لکھی گئی۔

۸۔ ارمغان حجاز (۱۹۳۸ء) (اردو و فارسی)

اہم نظمیں

خضرراہ (۱۹۲۲ء) (بانگ درا) طلوع اسلام (۱۹۲۳ء) (بانگ درا)

ذوق وشوق (۱۹۳۲ء) مسجد قرطبہ (۱۹۳۳ء)

دعا، ہسپانیہ، طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)

عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین، اندلس میں قید خانہ میں معتمد کی فریاد

ابلیس کی مجلس شوریٰ ۱۹۳۶ء (ارمغان حجاز)

اعزازات

۱۔ ۱۹۲۳ء میں علمی وادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت برطانیہ نے سر کا خطاب دیا۔

۲۔ ۱۹۳۳ء کے کانووکیشن میں پنجاب یونیورسٹی نے اقبال کو ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔

۳۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نے اقبال کو ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

۴۔ عثمانیہ یونیورسٹی (دکن) نے بھی علامہ اقبال کو ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا۔

مشہور شخصیات: جن سے مختلف سفروں میں علامہ اقبال کی ملاقات ہوئی اور جن کے نام یونٹ کے اس حصے میں آئے ہیں۔

۱۔ سید ضیاء الدین طباطبائی (سابق وزیر اعظم ایران)

۲۔ حلمی پاشا (سابق خدیو مصر)

۳۔ امیر امان اللہ خان (سابق شاہ افغانستان)

۴۔ مسولینی، اٹلی کا ڈکٹیٹر

۵۔ مفتی اعظم السید امین الحسینی

۶۔ ہنری برگساں (فرانسیسی فلسفی)

۷۔ محمد نادر شاہ (شاہ افغانستان)

وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء بمقام لاہور

۴.۴۔ خود آزمائی نمبر ۴

(۱) ۱۔ تحریک خلافت میں اقبال، کانگریس مسلم لیگ اور جمعیت العلماء کس کے ساتھ تھے؟

۲۔ اقبال نے پیام مشرق کس کے جواب میں لکھی؟

۳۔ ''بولشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے''
اقبال کو یہ کیوں کہنا پڑا؟

۴۔ اقبال کے نزدیک مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بولشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں تو
پھر اعتدال کی راہ کون سی ہے؟

۵۔ اقبال ۱۹۲۶ء میں کس اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے؟

۶۔ اقبال نے فلسفہ اسلام کو اپنی کس کتاب میں فلسفہ جدید کی زبان میں بیان کیا ہے؟

۷۔ سائمن رپورٹ پر اقبال کا ردعمل کیا تھا؟

۸۔ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں ایک تاریخی خطبہ دیا یہ خطبہ انہوں نے کس مقام پر دیا؟

۹۔ اقبال کس گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے؟

۱۰۔ اقبال نے ایشیاء کی ڈیوائن کامیڈی کس کو کہا ہے؟

(۲) ۱۔ اقبال کی کتابوں کی نشاندہی کیجئے:
(جاوید نامہ، یادگار غالب، پیام مشرق، حیات جاوید)

۲۔ مسجد قرطبہ واقع ہے؟
(ترکی، سپین میں، مصر میں، اردن میں)

۳۔ پہلی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی:
(۱۹۳۴ء میں، ۱۹۳۲ء میں، ۱۹۳۰ء میں)

۴۔ فلسطین کے قیام کے دوران اقبال کے دل و دماغ پر جو کیفیات گزریں ان کے نقوش ملتے ہیں۔
(طلوع اسلام میں، خضر راہ میں، ذوق و شوق میں، شمع و شاعر میں)

۵۔ اقبال کا مجموعہ کلام ان کی وفات کے بعد شائع ہوا:
(ارمغان حجاز، پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق، ضرب کلیم، زبور عجم)

۵۔ جوابات

خود آزمائی نمبر ا۔

(ا) ا۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ۲۔ سرعبدالقادر

۳۔ ٹیی سن، ولیم کوپر، لانگ فیلو ۴۔ ہمارا دیس

۵۔ نظم "بلال" میں دینی احساس ملتا ہے

(۲) ا۔ ہاں ۲۔ ہاں ۳۔ ہاں ۴۔ نہیں ۵۔ نہیں

خود آزمائی نمبر ۲

(ا) ا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ۲۔ کم ہوا

۳۔ جذبہ اخوت ومحبت بیدار ہوا ۴۔ سمندر کی ہولناک موجیں انسان کا غرور ختم کر دیتی ہیں

۵۔ کیونکہ اقبال نے ہیٹ پہن رکھا تھا

(۲) ا۔ وطن ۲۔ دہلی ۳۔ مرزا غالب ۴۔ تعلیم ۵۔ تاریخ عالم

خودآزمائی نمبر۳

(ا) ۱۔ دونوں کام کیے ۲۔ دونوں پیشے پسند تھے ۳۔ جج ہائی کورٹ

۴۔ عائلی زندگی کی وجہ سے ۵۔ نہیں

(۲) ۱۔ الف ۲۔ ب ۳۔ ب ۴۔ ج ۵۔ ب

خودآزمائی نمبر۴

(ا) ۱۔ کسی کے ساتھ نہیں تھے

۲۔ جرمن شاعر گوئٹے

۳۔ اقبال کی بعض نظموں سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ اقبال اشترا کی خیالات کے حامی ہیں۔ اس لئے انہیں جواب میں یہ کہنا پڑا۔

۴۔ قرآن کا بتایا ہوا راستہ

۵۔ پنجاب اسمبلی

۶۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ

۷۔ مایوس ہوئے ہیں

۸۔ الٰہ آباد میں

۹۔ دوسری اور تیسری

۱۰۔ ''جاوید نامہ'' کو

(۲) ۱۔ ''جاوید نامہ'' پیام مشرق

۲۔ ۱۹۲۳ء سپین میں

۳۔ ۱۹۳۰ء میں

۴۔ ''ذوق وشوق'' میں

۵۔ ارمغان حجاز

یونٹ ۔ ۳

تصانیفِ اقبال

تحریر:
ڈاکٹر صدیق جاوید
ڈاکٹر محمد ریاض

فہرست

صفحہ نمبر	نمبر شمار عنوانات
82	یونٹ کے مقاصد •
83	ا۔ توضیحات
86	۲۔ اقبال کی اردو شاعری
87	۳۔ بانگ درا
104	۳.۱۔ خود آزمائی نمبر ا
106	۴۔ بال جبریل
121	۴.۱۔ خود آزمائی نمبر ۲
123	۵۔ ضرب کلیم
134	۵.۱۔ خود آزمائی نمبر ۳
136	۶۔ ارمغان حجاز
140	۷۔ دیگر تصانیف
141	۷.۱۔ فارسی تصانیف

۷.۲۔ خطوط کے مجموعے 143

۷.۳۔ تقاریر، بیانات اور ملفوظات 144

۷.۴۔ خود آزمائی نمبر ۴ 145

۸۔ جوابات 146

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد امید ہے کہ آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

۱۔ علامہ اقبال کی تصانیف سے واقف ہو کر ان کے بارے میں موٹی موٹی باتیں بتا سکیں۔

۲۔ ایک شاعر کی حیثیت سے علامہ اقبال کی فکر سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

۳۔ علامہ اقبال کے ان نظریات کو بیان کر سکیں جو انہوں نے انسانی کردار کی تعمیر و تشکیل کے بارے میں پیش کیے ہیں۔

۱۔ توضیحات

الفاظ	معانی	الفاظ	معنی
وحدۃ الوجود	تمام موجودات کو خدائے تعالیٰ	پیر مغاں	شراب خانے کا مالک
	ہی کا ایک وجود ماننا اور ماسوا کے	شرر فشاں	آگ پھیلانے والا
	وجود کو محض اعتباری سمجھنا	فوقیت	اہمیت، برتری
معروضی حالات	پیش کئے گئے حالات	گاز	قینچی
استفہام	سمجھنا، پوچھنا	نکبت	بدحال
تلمذ	شاگرد ہونا	مجروحین	مجروح کی جمع، بمعنی زخمی
تغیر	تبدیلی	کرمک	چھوٹا کیڑا۔ مراد جگنو
جبر واستبداد	سختی اور ظلم	شوریدہ	دیوانہ
نفاق انگیز	دشمنی پیدا کرنے والا	انفعال	شرمندگی
اسیر	قیدی	استحصال	لوٹ کھسوٹ
راہزن	لٹیرا	مغائرت	اجنبی ہونا۔ غیریت
دوئی	دو ہونا، مراد فرق	عہد کہن	پرانا عہد۔ مراد ماضی
شانتی	آرام، امن	بخت خفتہ	سویا ہوا نصیب
مضمر	چھپا ہوا	بیر	دشمنی
مسحور کن	جادو کرنا	پیت	محبت
رازہائے سربستہ	چھپی ہوئی باتیں	بھگت	پجاری
نردبان	سیڑھی	گل پژمردہ	مرجھایا ہوا پھول
اسرار	سر کی جمع۔ معنی بھید	قدسیوں	مراد فرشتوں
متمنی	خواہش مند	عالمگیر اخوت	تمام دنیا کا بھائی چارا

عزت	تنہائی	زعماء	بڑے لوگ
افادیت	فائدہ	مور بے مایہ	حقیر چیونٹی
عظمت رفتہ	ماضی کی شان وشوکت	پیکر خاکی	مراد جسم
رخت سفر	سفر کا سامان	احیا	زندہ کرنا
ظلمت شب	رات کی تاریکی	انحراف	انکار
مضرت رساں	نقصان پہنچانے والا	معرفت نفس	اپنی ذات کی پہچان
ادبار	شکست	صدف	ایک سمندری گھونگا جس سے موتی نکلتا ہے
ظریفانہ	مزاحیہ		
سامراج	شہنشاہیت، نو آبادیات اور ماتحت سلطنتیں رکھنے کی پالیسی	انحطاط	گراوٹ
		نشاط انگیز	خوشی پیدا کرنے والا
تسلط	قبضہ، غلبہ	فردا	آنے والا کل
امتیاز من وتو	ہم اور تم میں فرق مراد ناچاقی	جوئے کہستان	پہاڑی ندی
جرس	گھنٹی	بارگاہ ایزدی میں	اللہ تعالیٰ کے حضور
تفاخر	فخر کرنا	سرمایہ پرستی	دولت کی پوجا
شکتی	طاقت	فاشسطی	جمہوریت دشمن نظریات
مکتی	نجات	میلانات	میلان کی جمع بمعنی رجحان
مبلغ	تبلیغ کرنے والا	گراں خوابی	گہری نیند
سکوت	خاموشی	بالیدگی	بڑھنا۔ نشونما
نکہت گل	پھول کی خوشبو	زشت	برا
حرکت دوام	مسلسل حرکت	عظام	عظم کی جمع۔ ہڈیاں
آذری	بت تراشی	فقدان	نہ ہونا

قوافی	قافیہ کی جمع۔ مراد ہم وزن الفاظ	فغفور و خاقان	چین و ترکستان کے بادشاہوں
شوریٰ	مشورہ، صلاح		کے لقب
آشفتہ	پریشان	دانۂ اسپند	نظر بد دور کرنے کی
آلودگی	ناپاکی		غرض سے جلایا جانے
صاحب ادراک	عقل مند شخص		والا دانہ۔ ہرمل کا دانہ
مرگ دوام	ہمیشہ کی موت	اسلاف	گزرے ہوئے لوگ
سنگ و خشت	پتھر اور اینٹ		سلف کی جمع
گراں بار	بوجھل	رہبانیت	دنیا کو چھوڑ دینا
روز مکافات	بدلے کا دن۔ قیامت	التفات	مہربانی، توجہ
سیکولر	لادین	سہل پسندی	آسان پسندی
ہیئت	شکل	محاسن	خوبیاں
اضمحلال	کاہلی۔ سستی	خورسند	خوش۔ شادمان
ابلیسی خصوصیات	شیطان جیسی خصوصیات	طمانیت	سکون، اطمینان
خوئے غلامی	غلامی کی عادت	ہدف	نشانہ
سوہان روح	جان کو تکلیف دینے والا	عروق	عرق کی جمع۔ رگیں
فراست	عقل مندی	مغنی	گیت گانے والا

۲۔ اقبال کی اردو شاعری

علامہ اقبالؒ کی شعر گوئی کا آغاز ان کے سیالکوٹ کے ایام طالب علمی میں ہی ہو گیا تھا شیخ عبدالقادر نے دیباچہ "بانگ درا" میں نواب مرزا داغ دہلوی سے اس زمانے میں اقبال کے غائبانہ تلمذ کا حال لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ مرزا داغ نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر قائم نہیں رہا ڈاکٹر یوسف حسین کے مطابق:

"..........اقبال کی پہلی غزل ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی جب کہ ان کی عمر صرف سترہ سال تھی......."

اس غزل کا مطلع اور مقطع دیکھیے:

کیا مزہ بلبل کو آیا شیوہ بیداد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے اُڑ اُڑ کر جو گھر صیاد کا
بھول جاتے ہیں مجھے سب یار کے جور و ستم
میں تو دیوانہ ہوں اے اقبال تیری یاد کا

بہر حال سیالکوٹ میں ایف۔اے پاس کرنے کے بعد اقبال ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے اور یہاں سے ۱۸۹۹ء میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران میں اقبال لاہور کی ادبی انجمنوں میں شریک ہوتے رہے۔

رفتہ رفتہ مجلسوں میں اقبال کا چرچا ہونے لگا۔ انہوں نے ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں ایک دردانگیز نظم "نالہ یتیم" کے عنوان سے پڑھی۔ جلسے کے صدر شمس العلماء مولوی نذیر احمد نے اس نظم کی بے حد تعریف کی۔

اسی طرح اقبال نے نظم "ہمالہ" ایک ادبی مجلس میں پڑھ کر سنائی۔ یہ نظم نئے خیالات اور تازہ اسلوب کی بنا پر بہت مقبول ہوئی۔ شیخ عبدالقادر نے یہ نظم اپریل ۱۹۰۱ء کو "مخزن" کے پہلے شمارے میں شائع کر دی۔ علامہ اقبال نے ستمبر ۱۹۲۴ء میں جب اپنا پہلا اردو مجموعہ "بانگ درا" کے نام سے شائع کیا تو "ہمالہ" اس کی پہلی نظم قرار پائی۔

۴۔ بانگ درا

بانگ درا کو اقبال نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول ۱۹۰۵ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ حصہ دوم ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اور حصہ سوم ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک کی اردو منظومات پر مشتمل ہے۔

بانگ درا کے حصہ اول میں انچاس نظمیں اور تیرہ غزلیں ہیں۔ حصہ دوم میں چوبیس نظمیں اور سات غزلیں ہیں۔ حصہ سوم میں چھوٹی بڑی تریسٹھ نظموں اور آٹھ غزلوں کے علاوہ آخر میں ''ظریفانہ'' کے عنوان سے اٹھائیس قطعات شامل ہیں۔

اقبال کے فکر وفن کا تدریجی اور تاریخی جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری کے مختلف ادوار قائم کئے جاتے ہیں۔ بیشتر اقبال شناس خود اقبال کی ''بانگ درا'' کے ادوار کی تقسیم زان کی شاعری پر محیط خیال کرتے ہیں کسی فنکار اور مفکر کے فنی اور فکری ارتقاء کو سمجھنے کے لئے مختلف مراحل کا مطالعہ بڑا سودمند ثابت ہوتا ہے کیونکہ ذہنی پختگی کے ساتھ ساتھ ہر فنکار کے ہاں فکر ونظر کے زاویے تبدیل ہوتے رہتے ہیں اپنے مخصوص زمانے کے رجحانات اور میلانات کے سبب یہ تغیر پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک دور کی زمانی اور فکری وفنی خصوصیات اکثر دوسرے دور سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے یہاں بانگ درا کا ایک اجمالی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

جس زمانے میں اقبال نے شاعری شروع کی اردو میں نظم کی روایت مستحکم نہ ہوئی تھی انجمن پنجاب کے زیر اہتمام مشاعروں میں حالی اور آزاد وغیرہ جو نظمیں پیش کر رہے تھے۔ وہ بالواسطہ انگریزی سے متاثر تھیں۔ اقبال خود مغربی شعر وادب سے واقف تھے، اس لئے ان کے ہاں نظم کی پیش کش میں گہرے فنی شعور کا ثبوت ملتا ہے۔

اردو نظم کی تاریخ میں اقبال کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے نظم کے جدید فنی تقاضوں کا احساس پیدا کیا جن کے ماتحت جدید خیالات کا اظہار ممکن ہو۔ بانگ درا کی پہلی نظم ''ہمالہ'' کی کامیابی میں یہ دونوں عناصر کارفرما ہیں۔

اس نظم کے علاوہ کئی اور نظموں میں بھی وطن پرستی کے جذبے کا واضح اظہار ہوا ہے اس کے پیش نظر بعض ناقد پہلے دور کو نیشنلزم یا وطن پرستی کا دور بھی کہتے ہیں۔ ان نظموں کے قبول عام میں حب وطن کے جذبے کا بڑا حصہ رہا ہے کیونکہ بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر پاک و ہند میں سیاسی بیداری کے آثار پیدا ہو رہے تھے اور نوآبادیاتی نظام کے معاشی استحصال اور مغربی سامراج کے سیاسی تسلط اور جبر و استبداد کے خلاف شعور میں اضافہ ہو رہا تھا اقبال کی متذکرہ نظمیں ہندوستان والوں کے انہی جذبات، احساسات اور شعور کی آئینہ دار ہیں۔ اقبال ہندوستان کی غلامی پر سخت آزردہ اور مضطرب دکھائی دیتے ہیں وہ وطن کی آزادی کے خواب دیکھتے ہیں مگر اسے ہر جگہ اپنے ہم وطن تعصب اور افتراق کا شکار نظر آتے ہیں وہ یہ جانتے ہوئے کہ ہندوستان کے باشندوں کا باہمی نفاق سامراجی حکمت عملی کا نتیجہ ہے، محبت اور اتحاد پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں ان کے نزدیک اصل غلامی مغائرت اور امتیاز من و تو کی اسیری ہے۔ نفاق کی سرزمین میں آزادی کے حصول کے لئے صلح و آشتی ان کا پیغام ہے۔

اقبال ''ہمالہ'' کے حوالے سے وطن کے شاندار ماضی اور اس کی تہذیبی روایات کا ذکر کرتے ہیں اور ''صدائے درد'' دوسری نظم ہے جس میں شاعر وطن کی نفاق انگیز فضا کو دیکھتے ہوئے اپنی بے کلی اور بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔

''تصویر درد'' بھی اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس نظم کا ہر بند سوز اور درد میں ڈوبا ہوا ہے بابائے اردو نے اسے ''وطن کا مرثیہ'' کہا ہے۔ شاعر ہندوستان کے منظر کو عبرت خیز قرار دیتے ہوئے اہل وطن کی نادانی کا ماتم کرتا ہے کہ بربادی و تباہی کے آثار دیکھنے کے باوجود وہ باہمی اختلاف و افتراق کا شکار ہیں وہ بار ہا فرقہ آرائی اور تعصب سے اجتناب کرنے اور محبت و یگانگت اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے اپنی اس

کوشش میں کئی موقعوں پر وہ خطابت کا وسیلہ اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے:

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو[1] رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ[2] خو! رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ[3] کو بیدار قوموں نے
محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے

''ترانہ ہندی'' میں اقبال کی ہندوستانی قومیت کا مؤثر اظہار ہوا۔ اس نظم میں ہندوستان کی عظمت پر فخر کا احساس ملتا ہے اور اس میں مذہب کی بجائے ہندوستان کو قومیت کی بنیاد ٹھہرایا گیا ہے۔

---

(۱) ... و تم میں فرق کا قیدی یعنی ایک دوسرے میں فرق کرنے والا (۲) بیگانگی کے عادی (۳) سوئی ہوئی قسمت

کہا جاتا ہے کہ اس نظم کو جو مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہ بہت کم نظموں کا مقدر ہوئی ہے۔ ایک اور نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' بھی حب وطن اور قومی تفاخر کے جذبات سے لبریز ہے۔ قومیت اور وطنیت کے خیالات نظم بعنوان ''نیا شوالہ'' میں اپنے نقطہ عروج پر نظر آتے ہیں۔ اس میں اقبال کا یہ یادگار مصرع بھی ہے:

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرا دیوتا ہے

اس نظم میں بڑے جوش و جذبے کے ساتھ متحدہ قومیت کی تشکیل کی دعوت دی گئی:

آ، غیریت کے پردے، اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا[1] دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو، مے پیت کی پلا دیں
شکتی[2] بھی، شانتی[3] بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں[4] کی مکتی[5] پریت میں ہے

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس دور میں اقبال خلوص دل سے یہ سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد میں ہندوستان کی سیاسی آزادی کا راز مضمر ہے۔ اقبال کے اس نقطہ نظر میں ہندوستان کے حالات کے علاوہ یورپ کے سیاسی نظریات خصوصاً نیشنلزم کے تصورات کو بڑا دخل تھا۔ لیکن آئندہ تین چار برسوں میں اقبال کا نقطۂ نگاہ تبدیل ہو گیا۔ اگرچہ وہ ہندو مسلم تصادم کے مبلغ کبھی نہ بنے مگر وہ نیشنلزم کے مغربی تصور کے سخت مخالف ہو گئے اس کا تفصیلی ذکر آگے اپنے موقع پر آئے گا۔

---

(۱) دو ہونے کا احساس (۲) طاقت (۳) امن (۴) باشندے (۵) نجات

اقبال کی نظم ''ہمالہ'' میں فطرت اور اس کے مظاہر سے دلچسپی کا جو رجحان نظر آتا ہے، وہ اس دور کی اور نظموں میں ایک واضح رخ اختیار کرتا ہے۔ مثلاً ''گل رنگین'' ''ابر کہسار'' ''آفتاب'' ''آفتاب صبح'' ''گل پژمردہ'' ''ماہ نو'' ''چاند'' ''جگنو'' اور ''ایک آرزو'' وغیرہ میں منظر نگاری کے دلکش نمونے ضرور ملتے ہیں مگر نظموں میں مناظر قدرت اور مظاہر فطرت کی تصویر کشی مقصود بالذات[1] نہیں۔ کائنات کا حسن اقبال کو متاثر کرتا ہے لیکن وہ اس قدر مسحور نہیں کرتا کہ اقبال پر خود فراموشی کی حالت طاری ہو جائے بلکہ یہاں اقبال کی فلسفیانہ طبیعت کا اصل جوہر نمایاں ہوا ہے۔ فطرت کے ان گوناگوں مظاہر[2] کے حوالے سے شاعر زندگی کی حقیقت کا ادراک[3] کرنا چاہتا ہے کائنات کے اسرار اس کے جذبہ تجسس کو ابھارتے ہیں۔ ان نظموں میں مناظر کی رنگینی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر کا پہلو درد استفہام[4] سے واقف نظر آتا ہے۔ وہ قدرت کے رازہائے سربستہ[5] کی گرہ کشائی کا متمنی[6] ہے گویا شاعر ایک طرح کی باطنی خلش اور اضطراب سے دوچار ہے۔ یہ کیفیت ایک انفعالی رجحان[7] کو جنم دیتی ہے۔'' ایک آرزو'' میں زندگی سے گریز کی خواہش پیدا ہوتی ہے:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں، عزلت[8] میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

---

(۱) اصل مقصد (۲) مظہر کی جمع نظارے (۳) سمجھنا (۴) معلوم کرنا (۵) بند راز، یعنی پوشیدہ راز (۶) گرہ کھولنے کا خواہش مند (۷) مراد زندگی کے تقاضوں سے بچنا، فرار (۸) تنہائی

اقبال کی ذہنی کیفیت کا یہ ایک خطرناک موڑ تھا مگر انہوں نے اسی نظم کے آخری حصے میں فرار کی خواہش پر غلبہ پا لیا۔ فطرت کی مصوری اور منظر نگاری سے منسوب اقبال کی یہ نظمیں کئی دوسرے معنوی پہلوؤں کی حامل ہیں۔ مثلاً کئی نظمیں کسی اخلاقی نکتے کو نمایاں کرتی ہیں یا کئی مقامات سے اقبال کے نظریہ وحدت الوجود(۱) کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس دور میں بچوں کے لئے بھی سات نظمیں ہیں جو سادہ اسلوب، سلیس زبان اور دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں اقبال نے بچوں کی ذہنی سطح ملحوظ رکھتے ہوئے، انہیں اخلاقی سبق سکھائے ہیں۔ حصہ اول میں مرزا غالب، داغ، اور آرنلڈ پر بھی نظمیں ہیں جن میں وہ ان ہستیوں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اس دور کی آخری نظم "التجائے مسافر" ہے جو انہوں نے ۱۹۰۵ء میں انگلستان کو روانگی سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضر ہو کر پڑھی تھی اس نظم میں اقبال نے خواجہ نظام الدین اولیاء سے اظہار عقیدت کے بعد اپنی کامرانی کے لئے دعا کی تھی۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تیری، فیض عام ہے تیرا
چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفت مہر(۲) ہوں زمانے میں
تیری دعا سے عطا ہو وہ نردبان(۳) مجھ کو

---

(۱) کائنات کی ہر شے کو خدا تعالیٰ ہی کا وجود ماننا (۲) سورج کی طرح (۳) زینہ

پہلے دور کی غزلیات میں داغ کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ ان اشعار میں طرز بیاں کی جو شوخی و بانکپن اور زبان کی سادگی و شیرینی دکھائی دیتی ہے وہ داغ کا خاص رنگ ہے ابھی اقبال کی غزل میں وہ نکھار پیدا نہیں ہوا جوان کے اپنے محسوسات و تجربات کا آئینہ دار ہوتا۔ ان غزلوں میں حسن و عشق تصوف، اخلاق اور حکمت کے مضامین بیان ہوتے ہیں مگر وہ سب روائتی اور تقلیدی ہیں۔

اقبال ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ یورپ میں ان کا قیام ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یعنی تین سال تک رہا۔ اس عرصے میں جو نظمیں لکھی گئیں وہ بانگ درا کے حصہ دوم میں شامل ہیں اور تعداد کے لحاظ سے تھوڑی ہیں اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اس زمانے میں علامہ تحصیل علم میں ہمہ تن مصروف تھے۔ خصوصاً پی۔ ایچ۔ڈی کے لئے تحقیقی مقالے کی تحریر ایک بڑا کام تھا دوسرے اسی زمانے میں وہ شاعری کی افادیت کو شک و شبے کی نظر سے دیکھنے لگے تھے اور انہوں نے ہمیشہ کے لئے وہ شاعری ترک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر شیخ عبدالقادر اور سرتامس آرنلڈ نے انہیں قائل کیا کہ ان کی شاعری ان کے ملک و قوم کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ بہر حال اس دور کی منظومات اقبال کے بعض میلانات کی آئینہ دار ہیں۔

ان نظموں کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اقبال حسن و عشق کے موضوعات پر سوچ بچار کرتے نظر آتے ہیں ان نظموں میں جہاں فلسفۂ جمالیات[1] کی بازگشت[2] سنائی دیتی ہے، وہاں بعض نظموں میں شاعر کے ذاتی تجربات اور حسن سے پیدا ہونے والے تاثر کا رنگ بھی صاف جھلکتا ہے۔ محبت کی کیفیات جو سرخوشی طاری کرتی ہیں، اس میں اقبال کھو نہیں جاتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال دوسرے رومانوی[3] شاعروں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ حسن اور عشق و محبت کے موضوع پر لکھتے ہوئے بھی فلسفیانہ نکات کی نشان دہی کرتے چلے جاتے ہیں مثلاً دوسرے دور کی پہلی نظم کا عنوان ''محبت'' ہے۔ وہ محبت کا بھید جاننے کی

---

(۱) جس فلسفے کا تعلق حسن سے ہو (۲) گونج (۳) تخیل پرست محبت اور حسن کے پجاری

کوشش میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جوہر کائنات کے مختلف اجزاء کے مرکب کا نام محبت ہے دوسری نظم ''حقیقت حسن'' میں حسن کی اصلیت کے بارے میں سوال اٹھایا گیا ہے اور شاعرانہ انداز میں اس کا جواب دیا ہے کہ زوال، حسن کی حقیقت ہے ان کے علاوہ جن نظموں میں اقبال کی قلبی واردات اور فکری تاثرات کا اظہار ہوا ہے وہ یہ ہیں! ''وصال'' ''حسن وعشق'' ''فراق'' ''عاشق ہرجائی'' ....کی گود میں بلی دیکھ کر ''سلمیٰ'' اور ''کلی'' وغیرہ۔

ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اقبال کی شاعری میں یہ رنگ برقرار نہیں رہتا۔

شاعری کے اس دوسرے دور میں بھی اقبال مظاہر فطرت اور ان کے حسن کا بیان بڑی دلچسپی سے کرتے ہیں: ''ایک شام'' اور ''تنہائی'' اس سلسلے کی نہایت دلکش نظمیں ہیں۔ اگرچہ ''اختر صبح'' ''چاند اور تارے'' بھی مظاہر فطرت سے متعلق ہیں مگر شاعر ان کے حوالے سے زندگی کا راز جاننے کے لئے کوشاں ہے شاعر کے نزدیک ''محبت کی بنا مثال ابد پائیدار ہے'' ''چاند اور تارے'' تاروں اور چاند کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ یہ سادہ سی نظم اقبال کے فلسفۂ زندگی کی ترجمان ہے۔ اس میں سکون وقرار کے مقابلے میں مسلسل سفر، عمل پیہم اور جنبش وحرکت دوام کی فضیلت بیان کی گئی ہے نظریۂ وحدت الوجود (خدا اور کائنات کو ایک سمجھنا) کی جھلک بھی اس دور میں نظر آتی ہے۔ ''سوامی رام[۴] تیرتھ'' پر نظم کے علاوہ ''پیام'' کا یہ شعر دیکھئے:

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہ سحر میں وہ
چشم نظارہ میں نہ تو سُرمہ امتیاز دے

اس دور کی شاعری کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا رخ تبدیل ہو گیا۔ اسی زمانے کی چند نظمیں ایسی ہیں جن میں اقبال کی آئندہ پیغمبرانہ شاعری کے خدوخال ابھرے۔ ان نظموں میں اقبال کا قومی شعور اور زندگی کے تقاضوں کا احساس نمودار ہوتا ہے۔ ''پیام'' کے عنوان سے نظم کے آخری دو شعر ہیں:

پیر مغاں فرنگ[1] کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں، مجھ کو تو خانہ[2] ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا! بزم کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مے مجاز دے

اسی طرح ''کوشش ناتمام''، ''طلبہ علی گڑھ کالج کے نام'' اور ''عبدالقادر کے نام'' اس پہلو کی عمدہ مثالیں ہیں۔ یہ امتیاز بھی اسی دور کو حاصل ہے کہ اس میں اقبال وطنیت کے تصور کو مسترد کرتے ہوئے ملت کے تصور کو اپناتے ہیں۔ ''پیام عشق'' کے آخر میں کہتے ہیں۔

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہوجا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہوجا

اس دور کی آخری نظم ''صقلیہ'' (جزیرہ سسلی) میں تہذیب حجازی کی شان وشوکت اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ اسلامی تہذیب وتمدن کی تباہی اور شکست انہیں بہت متاثر کرتی ہے اور وہ اپنے ان الیہ تاثرات کو جذبے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس نظم کو اقبال کی شاعری کے اسلامی دور کی بنیاد کہا جاتا ہے۔

بانگ درا حصہ دوم کی نظموں کے بعد سات غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں اگرچہ ان غزلوں کے بیشتر حصے روایتی انداز لئے ہوئے ہیں مگر ان میں اس دور کی نظموں کے رجحانات اور خصوصیات کا عکس بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ یہ دور اقبال کی شاعری میں ایک اہم دور یعنی اہم تبدیلی کا دور کہا گیا ہے زیر نظر غزلوں میں یہ تبدیلی خصوصاً قابل ذکر ہے غزل کو مخصوص مضامین سے نکال کر اپنے مخصوص خیالات کا ترجمان بنانا ایک

---

(۱) یعنی مغربی تعلیم وتہذیب (۲) یعنی اسلامی علوم اور تہذیب

نہایت جرأت مندانہ اور انقلاب آفرین کام تھا۔ جسے اقبال نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمارؐ نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا
میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شررفشاں ہوگی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہوگا

آخر میں درج چار شعر اس غزل میں سے لئے گئے ہیں جو اقبال نے مارچ ۱۹۰۷ء میں لکھی اور حصہ دوم کی آخری غزل قرار پائی۔ یہ غزل زبان اسلوب، مواد اور لب و لہجے کے لحاظ سے اردو غزل کے فرسودہ اور روائتی انداز سے یکسر مختلف ہے۔

اقبال شناسوں میں ایک گروہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء تک کی شاعری کو تیسرا دور قرار دیتا ہے ہمارے پیش نظر بانگ درا کا حصہ سوم ہے جو ۱۹۰۸ء سے بانگ درا کے سال اشاعت یعنی ۱۹۲۴ء پر محیط ہے یہ حصہ ستر نظموں آٹھ غزلوں اور ظریفانہ کے زیر عنوان انتیس قطعات پر مشتمل ہے پچھلے صفحات پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ قیام یورپ اقبال کے نقطۂ نظر اور مقصد حیات میں ایک ٹھوس تبدیلی کا باعث ہوا قیام یورپ کے عرصے میں انھوں نے وہاں کی تہذیب و معاشرت، مروج سیاسی تصورات اور یورپی اقوام کی سیاسی حکمت عملی کا

مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ اس کے نتیجے میں وہ مغربی نیشنلزم کے تصور سے بیزار ہوئے انہوں نے اس تصور کو انسانی فلاح و بہبود کے لئے مضرت رساں خیال کیا اس کے سد باب کے لئے وہ عالمگیر اخوت اور بھائی چارے کی فوقیت کے قائل ہوئے علامہ کا تاریخی شعور بہت گہرا تھا۔ انہیں اپنے دین اسلام میں نسل انسانی کا تحفظ نظر آیا کیونکہ اسلام میں جغرافیائی حدود اور نسلی امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ اس میں توحید اور رسالت کا عقیدہ نسل انسانی کے لئے ایک اجتماعی بنیاد فراہم کرتا ہے اس لئے اقبال نیشنلزم کی حمایت کی بجائے ملت اسلامیہ کے اتحاد اور اسلامی اقدار کی حمایت کے پرجوش مبلغ بن گئے۔ اس دور میں ''ترانہ ہندی'' کے مقابلے میں ''ترانہ ملی'' تخلیق ہوا جس میں وہ کہتے ہیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بہر حال اس قسم کی نظموں کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ نظمیں جو عنوانات کے مطابق فطرت کے مظاہر یا مناظر سے متعلق ہیں مگر کسی نہ کسی حکیمانہ اور اخلاقی نکتے کی وضاحت کرتی ہیں مثلاً ستارہ ''دو ستارے،'' ''چاند'' ''رات اور شاعر'' ''بزم انجم'' ''سیر فلک'' ''غرہ شوال'' یا ''ہلال عید'' ''نوید صبح'' ''شبنم اور ستارے'' ''شعاع آفتاب'' اور ''پھول'' وغیرہ۔

۲۔ وہ نظمیں جو تاریخ اسلام کی بعض شخصیات اور مشرق و مغرب کے بعض زعما کے حوالے سے لکھی گئی ہیں یہ نظمیں بھی ان کے فکری اور جذباتی رجحانات کی آئینہ دار ہیں مثلاً: فلسفہ غم'' غلام قادر روہیلہ'' ''شبلی و حالی'' ''صدیق'' ''عرفی'' ''نانک'' ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' ''بلال'' ''شیکسپیئر'' اور ''ہمایوں'' وغیرہ۔

۳۔ وہ نظمیں جن میں اسلام کی شاندار روایات، بیسویں صدی کی دنیائے اسلام کی نکبت و ادبار، سیاسی زبوں حالی، اقتصادی پس ماندگی اور دینی اقدار سے لاتعلقی اور دوسرے مسائل، کا بیان ہوا

ہے مسلمانوں کو عام بے حسی کا احساس دلاتے ہوئے ، اپنے کردار میں حرکت اور حرارت کا جوہر پیدا کرنے کا درس دیا ہے فکر و خیال میں قدرت اور جہد و عمل میں انقلابی قوت پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان نظموں میں ''ترانہ ملی'' ''وطنیت'' ''شکوہ'' ''خطاب بہ نوجوانان اسلام'' ''جواب شکوہ'' ''کفر و اسلام'' ''طلوع اسلام'' ''شمع و شاعر'' ''فاطمہ بنت عبداللہ'' ''حضور رسالت مآب ؐ'' میں اور ''خضر راہ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ ۱۹۰۸ء کے بعد کا دور اسلامی شاعری کا دور ہے یوں تو بانگ درا کے حصہ سوم کی متذکرہ تینوں طرح کی نظموں سے اس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے مگر تیسری قسم کی نظمیں اقبال کے اسلامی جذبے اور احساس کی ترجمانی بڑی وضاحت اور قطعیت کے ساتھ کرتی ہیں۔ یہ نظمیں معنوی تاثیر اور کیفیت کے علاوہ اقبال کی فنی مہارت کا بھی دلکش نمونہ ہیں۔

''وطنیت'' میں نیشنلزم کے مغربی تصور کو رد کرتے ہوئے اس کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا ہے اقبال نے ۱۹۱۱ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں ''شکوہ'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔ اس سے حاضرین جلسہ تڑپ اٹھے۔

اس نظم کو بے پناہ مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کے ذکر کے ساتھ ان کے موجودہ ادبار اور پریشان حالی کا بیان ہے اقبال نے مسلمانوں کے زوال کا خدا سے شکوہ کیا ہے اور آخر میں مسلمانوں کے لئے خدا کے حضور دعا کرتے ہیں۔

مشکلیں امت مرحوم کی آساں کر دے
مور[1] بے مایہ کو ہم دوش[2] سلیماں کر دے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر[3] نشینوں کو مسلماں کر دے

---

(۱) حقیر چونٹی (۲) برابر ہم رتبہ (۳) بت کدوں میں بیٹھنے والوں

یورپ کی ترقی یافتہ اور طاقت ور اقوام کے سامراجی عزائم اور نو آبادیاتی منصوبوں نے افریقہ اور ایشیاء کی کمزور قوموں کو نشانہ ستم بنایا۔ جب ۱۹۱۲ء میں روس اور برطانیہ نے طرابلس و بلقان میں جنگ اور ظلم کی آگ لگائی تو ان مناظر سے ہند کے محکوم مسلمانوں کے جذبات بھی مشتعل ہوئے اقبال بھی اس صورتحال سے شدید طور پر متاثر ہوئے چنانچہ ''فاطمہ بنت عبداللہ'' ''حضور رسالت مآبؐ میں'' ''محاصرۂ اورنہ[(۱)]'' ''شمع و شاعر'' اور ''جواب شکوہ'' مسلمانوں کے اسی غم انگیز دور کے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں ''شمع و شاعر'' اور ''جواب شکوہ'' طویل نظمیں ہیں اور نسبتاً زیادہ مشہور ہیں ''شمع و شاعر'' میں اقبال نے بزدلی اور ناامیدی میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کو امید کا روشن راستہ دکھایا ہے اس نظم میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کئی پہلو بیان ہوئے ہیں ان میں فرد اور ملت کے باہمی ربط و ضبط کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ فلسفہ خودی کی بنیادی خصوصیات کا بھی اس نظم میں سراغ ملتا ہے۔ بقول سالک:

''جواب شکوہ'' تو مجروحین بلقان کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض ہی سے لکھی گئی تھی۔

اس نظم میں علامہ مرحوم نے مسلمانوں کے سیاسی زوال، محکومی، معاشی تباہ حالی اور اخلاقی انحطاط کا تجزیہ کیا ہے اور خود مسلمانوں کو اس خرابی اور بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کیونکہ ان میں ایمان، عمل اور جوش کردار باقی نہیں رہا۔

''خضر راہ'' اور ''طلوع اسلام'' بانگ درا کی آخری نظمیں ہیں ان دونوں نظموں کا شمار اقبال کی طویل نظموں میں ہوتا ہے۔ اقبال کی یہ شہرہ آفاق نظمیں اقبال کے فکر و فن کا اعلیٰ شاہکار ہیں اور آج بھی انہیں وہی مقبولیت حاصل ہے۔

''خضر راہ'' اپریل ۱۹۲۲ء کو انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی گئی۔ علامہ اقبال نے اس نظم

---

(۱) یورپی ترکی کا ایک شہر جسے انگریزی میں ایڈر یا نوبل کہتے ہیں۔

میں مکالماتی انداز اختیار کیا ہے۔ شاعر ایک رات ساحل دریا پر محو نظارہ تھا کہ اسے خضر دکھائی دیے۔ اقبال ان سے زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کئی سوال کرتے ہیں۔ خضر ان کے مفصل جواب دیتے ہیں۔

۱۔ خضر بتاتے ہیں کہ صحرا نوردی میں حرکت اور گردش پیہم کی حکمت پوشیدہ ہے۔

۲۔ زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ زندہ لوگ اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں زندگی کی حقیقت سخت جدو جہد اور کوشش سے آشکار ہوتی ہے۔ غلامی اور آزادی میں زندگی کا تصور بدل جاتا ہے مٹی کا پتلا اپنی قوت تسخیر سے ہی زندگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

۳۔ سلطنت کے بارے میں شاعر کے استفسار پر خضر مغربی تصور جمہوریت میں ملبوس شہنشاہیت اور آمریت کی نشان دہی کرتے ہیں۔

۴۔ سرمایہ و محنت کے بارے میں بندہ مزدور کی حق تلفی اور محرومی کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار کے مکر و فریب کا پردہ چاک کیا گیا ہے آخر میں مزدور سے خطاب ہے:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
کرمک ناداں! طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار[1] میں آباد ہو

۵۔ پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے دنیائے اسلام کو بھی متاثر کیا ترک قوم بطور خاص اس جنگ کے شعلوں میں آئی دوسرے اسلامی ممالک بھی ان حوادث کا شکار ہوئے اور ملت اسلامیہ کی یہ حالت ہوئی کہ:

---

(۱) وہ جگہ جہاں خوب روشنی ہو

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہوگیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

اقبال کو دوسرے بند میں مشرق کی نجات کا صرف ایک ہی راستہ نظر آتا ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کو یگانگت اور اتحاد کا پیغام دیتے ہیں۔

ربط و ضبط ملت بیضا(۱) ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر(۲)
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک(۳) خرگاہی ہو یا اعرابی(۴) والا گہر

''طلوع اسلام'' اقبال نے ۱۸ اپریل ۱۹۲۳ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی۔ اس زمانے میں ترکوں نے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی زیر قیادت یونانیوں کو شکست دی۔ اقبال ترکوں کے اس کارنامے سے بہت متاثر ہوئے جنگ بلقان میں ترکوں کی فتح اور یونانیوں کی شکست میں اقبال نے ملت اسلامیہ کا احیاء دیکھا۔ یہ نظم جوش، ولولے اور امید سے لبریز ہے اور مسلمانوں کو ذوق یقین اور قوت ایمان پیدا کرنے کی ترغیب دیتی ہے یہاں اقبال نے پھر رنگ و نسل کے امتیازات مٹانے اور اخوت کو فروغ دینے کی تلقین کی ہے۔ آٹھویں بند میں تہذیب حاضر کی جھوٹی چمک، مغربی حکمت کی ستم رانی

---

(۱) مراد ملت اسلامیہ (۲) چینی ترکستان کا ایک شہر (۳) خیموں میں رہنے والے ترک (۴) اعلیٰ خاندان کے عرب

اور سرمایہ دارانہ تمدن کے منفی رجحانات کو واضح کیا ہے اور آخری بند میں مسلمانوں کو ایک نئے دور کا آغاز کرنے کی دعوت دی ہے۔

بانگ درا حصہ سوم میں شامل غزلیات کی تعداد آٹھ ہے۔ ان غزلوں میں اگرچہ روائتی اسلوب اور ہیئت کی پابندی کا خیال رکھا گیا ہے مگر ان میں تین غزلیں ایسی ہیں جو شاعر کے پیغام کا فریضہ انجام دیتی ہیں اور یوں غزل میں نئے رجحانات کے اظہار کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ مندرجہ ذیل غزلوں میں تخاطب کا انداز اور لب ولہجہ غزل کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولتے ہیں۔

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

....

پردہ چہرے سے اٹھا، انجمن آرائی کر
چشم مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
ہو تری خاک کے ہر ذرہ سے تعمیر حرم
دل کو بیگانہ انداز کلیسائی[1] کر

(۱) گرجا سے متعلق طریقے مراد مغربی تہذیب

پھر باد بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو! گل ہے تو گلستاں ہو
اے رہرو فرزانہ![1] رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو

....

بانگ درا کے آخر میں ''ظریفانہ'' کے زیر عنوان انتیس قطعات درج ہیں۔ بیشتر قطعات میں اکبر الہٰ آبادی کے اسلوب کی پیروی کی گئی ہے باقی قطعات ہنگامی مسائل پر اخبارات کے لئے لکھے گئے تھے۔

۳.۱۔خود آزمائی نمبرا

(۱) مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب لکھیے :

۱۔ علامہ اقبال کی کتاب ''بانگ درا'' کا دیباچہ کس نے لکھا ہے؟

۲۔ ''بانگ درا'' کو علامہ اقبال نے کتنے حصوں میں تقسیم کیا ہے؟

۳۔ انجمن پنجاب کے تحت کون سے دو شعراء اپنی نظمیں زیادہ پیش کرتے ہیں؟

۴۔ علامہ اقبال کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا راز کس بات میں پوشیدہ تھا؟

۵۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ''التجائے مسافر'' کس بزرگ کے مزار پر حاضر ہو کر پڑھی تھی؟

۶۔ ''شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے'' اس شعر کا دوسرا مصرع بتائیے۔

۷۔ علامہ اقبال نے شاعری ترک کرنے کے بعد شاعری کا دوبارہ آغاز کس کے کہنے پر کیا تھا؟

۸۔ قیامِ یورپ کے دوران علامہ اقبال یورپ کے کس تصور سے زیادہ بیزار ہوئے؟

۹۔ ۱۹۱۱ء میں علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں کون سی نظم پڑھی تھی؟

۱۰۔ بانگ درا کے حصہ سوم میں غزلیات کی تعداد کتنی ہے؟

(۲) اس یونٹ کی روشنی میں صرف صحیح جملوں کو نشان ☑ لگائیے۔

۱۔ بانگ درا کے حصہ اول میں انچاس نظمیں ہیں۔

۲۔ بانگ درا کی ضخامت ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۳۔ بانگ درا کے آخر میں ظریفانہ کے عنوان کے تحت انتیس قطعات شامل ہیں۔

۴۔ ''خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے'' علامہ اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' کا مصرع ہے۔

۵۔ علامہ اقبال نے بانگ درا کے حصہ اول میں مرزا غالب، داغ اور آرنلڈ پر بھی نظمیں لکھیں۔

۶۔ بانگ درا حصہ دوم کی نظموں کے بعد سات غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

۷۔ بانگ درا کی اشاعت سے پہلے علامہ اقبال کی چار فارسی منظوم تصانیف منظر عام پر آئیں۔

۸۔ ''خضر راہ'' اور ''طلوع اسلام'' بانگ درا کی آخری نظمیں ہیں۔

۹۔ نظم ''طلوع اسلام'' اقبال نے اپریل ۱۹۲۵ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی۔

۱۰۔ بانگ درا حصہ سوم میں شامل غزلیات کی تعداد دس ہے۔

۴۔ بال جبریل

بانگ درا کے بعد اقبال کے فارسی کلام کا چوتھا مجموعہ ''زبور عجم'' کے نام سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔۱۹۳۲ء میں فارسی نظم کی ایک اور کتاب ''جاوید نامہ'' منظر عام پر آئی۔ ''جاوید نامہ'' کے تین سال بعد اقبال کا دوسرا اردو مجموعہ کلام ۱۹۳۵ء میں ''بالِ جبریل'' کے نام سے شائع ہوا۔

''بال جبریل'' میں ستر غزلیں، تقریباً پچاس چھوٹی بڑی نظمیں اور بیالیس کے قریب قطعات و رباعیات شامل ہیں۔

''بال جبریل'' کی تاریخی اہمیت میں ان غزلیات کا بڑا حصہ ہے جو اس کے پہلے ایک سو تیرہ صفحات پر محیط ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ غزل فارسی اور اردو کی مقبول ترین صنف سخن ہے غزل میں بنیادی طور پر حسن و عشق کے معاملات بیان ہوتے ہیں۔مگر ارتقاء میں مختلف منزلوں میں فلسفہ، تصوف اور اخلاقیات وغیرہ کے مسائل بھی اس میں داخل ہوتے رہے۔لیکن غزل کی ہیئت میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔غزل کی زبان اور اسلوب بیان میں بڑی حد تک یکسانیت رہی ہے۔غزل کی تاریخ کے مختلف ادوار میں جو کچھ فرق نظر آتا ہے وہ غزل گوؤں کے اپنے مزاج اور اسلوب کا یقیناً فرق ہے مگر صدیوں میں غزل کے مزاج اور اسلوب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔بال جبریل کی غزلیات میں پہلی بار غزل کا مزاج اور اسلوب یکسر بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔عام طور پر ایسی اچانک تبدیلی کا خیر مقدم نہیں کیا جاتا۔بال جبریل کی غزلوں کی کامیابی کا اور ثبوت کیا ہوگا کہ بال جبریل نے غزل کی روایت سے انحراف کو قابل قبول بنایا۔اقبال کے اس کارنامے کا ایک پس منظر ہے جس کے بغیر یہ ممکن نہ ہوسکتا تھا۔

چونکہ اقبال ایک فلسفی شاعر ہیں اور انہوں نے اپنی اردو اور فارسی نظموں میں اپنے فلسفیانہ تصورات مربوط انداز میں پیش کئے تھے۔اس لئے ان کی غزلیات کے لئے ایک ذہنی فضا قائم ہوچکی تھی۔جیسا کہ معلوم ہے غزل میں ہر شعر مضمون اور خیال کے لحاظ سے وحدت رکھتا ہے۔اس لئے غزلوں

میں کوئی مربوط سلسلہ خیال پیش نہیں کیا جا سکتا۔لہذا اقبال نے اپنے جن خاص خیالات کا اظہار ''اسرار خودی''''رموز بے خودی''''جاوید نامہ' وغیرہ میں کیا ہے انہیں ایجاز واختصار اور رمزو کنایہ کے ذریعے ''بال جبریل'' کے غزلیہ اشعار میں پیش کیا ان اشعار میں خودی، بے خودی، عشق، عقل، موت، حیات، فقر، درویشی، آزادی، غلامی، جمہوریت، آمریت، ارتقاء حیات، عظمت انسان اور مغربی تہذیب وتمدن کے منفی پہلوؤں پر تنقید وغیرہ کے مضمون ملتے ہیں اس سے پہلے اردو غزل میں یہ موضوعات نظر نہیں آتے یا کم از کم اس معنی اور مفہوم میں استعمال نہیں ہوئے۔البتہ بال جبریل کی غزلیات میں وہ خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں جو ہمیشہ سے غزل کی روح قرار پاتی رہی ہیں ان غزلیات میں سوز وگداز کی کیفیت، جذبے کا رچاؤ، ترنم اور موسیقیت، اور زبان وبیان کی چاشنی موجود ہے ان عناصر کے مرکب کو تغزل کا نام دیا جاتا ہے اگر تغزل کی خوبی زائل ہو جائے تو غزلیت باقی نہیں رہتی۔اقبال کا کمال یہ ہے کہ اس نے غزلوں میں فلسفہ، سیاست اور معاشرت کے مسائل بیان کیے ہیں مگر انہیں بھرپور تغزل میں رچا بسا کر پیش کیا ہے اس کے ثبوت میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

....

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی!
تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہ تمام اے ساقی

....

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

....

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے! نہ قفس نہ آشیانہ!
یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراش آزرانہ!

....

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی
گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ (۱) کی بہار
طائرک بلند بال (۲) دانہ و دام (۳) سے گذر

....

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

....

کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا درد مہجوری

....

گرم فغاں ہے جرس، اٹھ کہ گیا قافلہ!
وائے وہ راہرو کہ ہے منتظر راحلہ (۴)!

....

(۱) یورپ کا حسن مراد یورپی تہذیب (۲) اے اونچا اڑنے والے پرندے مراد مسلمان (۳) دانے اور جال مراد مادی ترقی
(۴) سواری کا جانور

اقبال کے فکر میں ان کے تصور خودی کو مرکزی اہمیت حاصل ہے علامہ کے تصور کے مطابق خودی، معرفت نفس اور عرفان ذات کا نام ہے انہوں نے خودی کی تربیت کے لئے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا جس کو وہ تفصیل کے ساتھ ''اسرار خودی'' میں پیش کر چکے ہیں نئے مقاصد اور نئی آرزوئیں خودی کا جوہر ہیں ذوق طلب اور عشق کی بدولت خودی مستحکم ہوتی ہے خودی انفرادیت کا مجرد فلسفہ (۱) نہیں ہے اقبال کے نزدیک خودی فکر وعمل کی ندرت (۲) کا نام ہے۔اقبال خودی کو کیا مقام دیتے ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے خودی کے بارے میں بال جبریل کی غزلیات میں کافی اشعار ملتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

....

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

....

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل!
یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

....

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازی افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوال نعمت و جاہ

....

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

---

(۱) خالی اور نا قابل عمل فلسفہ (۲) فکر وعمل کو نئے راستے پر لگانا

بے ذوق نمود زندگی موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی زور خودی سے پربت!
پربت ضعف خودی سے رائی

....

عقل و عشق کا مقابلہ اور عقل کے مقابلے میں عشق کی اہمیت اور فوقیت اقبال کا خاص مفہوم ہے۔اور وہ اس سے ایمان مراد لیتے ہیں۔عقل کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے اور اس کا اعتراف اقبال نے بھی کیا ہے مگر اقبال کو محدود خیال کرتے ہیں کیونکہ عقل ظن و تخمین (۱) میں الجھ کر رہ جاتی ہے اس لئے زندگی کے میدان میں تہذیبی، تمدنی اور روحانی ترقی کے لئے جس جوش و جذبہ اور قوت عمل کی ضرورت ہے وہ عقل کے بس کا روگ نہیں عشق کی بدولت ہی خودی کے ممکنات (۲) کو دریافت کیا جا سکتا ہے ہمت، مردانگی، حوصلہ، جرأت، بے باکی اور یقین محکم عشق کے چند اوصاف ہیں اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ کریں:

جب عشق سکھاتا ہے، آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

....

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

....

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ!
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

....

(۱) اندازے (۲) جس کا پانا ممکن ہو

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

....

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

....

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بہ دم

....

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

....

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

....

انسانی عظمت کا موضوع اقبال کے فلسفہ کا ایک اہم پہلو ہے وہ نظم ونثر میں مختلف موقعوں پر عظمت انسان کا احساس دلاتے ہوئے ان اوصاف کو بیان کرتے ہیں جن کو اپنا کر فانی انسان حور وفرشتہ کو اسیر کر سکتا ہے کیونکہ جب وہ اپنے اندر خودی کا جوہر پیدا کر لیتے ہیں تو غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک بن جاتے ہیں جن کو بروئے کار لاتے ہوئے کائنات اور فطرت کے سرکش عناصر کو تسخیر کرتے ہیں یہ نائب حق کا مقام ہے جس کو اقبال نے انسان کامل یا بندہ مومن وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا ہے اقبال کا مرد مومن بہت سی صفات کا حامل ہے جوش عمل ہستی، کردار، بے نیازی فقر اور یقین و ایمان جیسے اجزاء سے بندہ مومن کی

شخصیت مکمل ہوتی ہے۔ اقبال ہر جگہ ان صفات کی روشنی میں بندہ مومن کی تصویر پیش کرتے ہیں جہاں انہوں نے ایمانی و روحانی طور پر محکوم و مجبور شخصیت کا تذکرہ کیا ہے وہاں کردار کی ان خصوصیات اور شخصیت کی ان صفات کے فقدان کی نشاندہی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں! بتکدہ صفات میں

....

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

....

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

....

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
ہو نہ روشن، تو سخن مرگ دوام اے ساقی

....

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندہ مومن ہوں، نہیں دانہ اسپند!

....

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

....

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا!

....

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

....

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق!
علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق
دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری

....

اے رہروِ فرزانہ! بے جذبِ مسلمانی
نے راہِ عمل پیدا، نے شاخِ یقیں نمناک

....

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

....

علم کی حد سے پرے بندہ مومن کے لئے
لذت شوق بھی ہے نعمت دیدار بھی ہے

....

مئے یقین سے ضمیر حیات ہے پر سوز
نصیب مدرسہ یا رب یہ آب آتش ناک
عروج آدم خاکی کے منتظر، ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

....

وہی جہاں ہے تیرا جس کو تو کرے پیدا!
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

....

متذکرہ موضوعات کے علاوہ بال جبریل کی غزلوں میں موت، حیات، فقر جمہوریت، آمریت آزادی اور غلامی وغیرہ کے مضامین بھی سامنے آتے ہیں اقبال کی غزل نے اردو غزل کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

بال جبریل کا دوسرا حصہ چھوٹی اور بڑی نظموں پر مشتمل ہے یہ نظمیں اقبال کی فکری اور فنی پختگی کے زمانے کی یادگار ہیں۔ چھوٹی نظمیں اقبال کے فکر و خیال کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہیں مگر بڑی نظمیں اقبال کے فکر و فن کا شاہکار نمونہ ہیں۔ خصوصاً مسجد قرطبہ، ذوق و شوق اور ساقی نامہ، نہ صرف اقبال کی شاعری کا قیمتی حصہ ہیں بلکہ نظم کی تاریخ کا سنہری باب ہیں۔

اقبال ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد ۱۹۳۲ء میں ہسپانیہ تشریف لے گئے جہاں انہوں نے اسلامی دورِ حکومت کے قدیم آثار دیکھے۔ ان آثار میں مسجد قرطبہ اپنی عظمت کی بنا پر ایک ممتاز مقام رکھتی ہے یہ مسجد اسلامی فن تعمیر کی تاریخ میں منفرد خصوصیات کی حامل ہے جب علامہ اقبال

اس مسجد میں پہنچے تو ان پر روحانی وارفتگی طاری ہوگئی اس کیف وسرور کے عالم میں انہوں نے یہ نظم کہی۔ یہ نظم آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ اقبال پہلے بند میں سلسلہ روز وشب کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

آنی[1] و فانی تمام، معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات![2] کار جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

مگر وہ اگلے بند میں فنا کے مقابلہ میں ثبات کا راز دریافت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مرد خدا کی تخلیق فنا کے عمل سے محفوظ رہتی ہے کیونکہ مرد خدا کا عمل عشق سے زندگی پاتا ہے اور عشق اصل حیات ہے جس پر موت بھی حرام ہے اس بند میں تصور عشق کو مختلف زاویوں سے بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے بند میں بتایا گیا ہے کہ مسجد قرطبہ کی تعمیر میں عشق کارفرما تھا۔ جس نے مسجد قرطبہ کو ثبات اور دوام بخشا۔ اس حوالے سے اقبال نے نظریہ فن پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ معجزہ فن خون جگر کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ آئندہ بندوں میں مسجد قرطبہ کا جلال و جمال، بندہ مومن کی صفات، سرزمین اندلس میں مردان حق کی کارگزاریاں، انقلابات عالم کے واقعات کے بارے میں اشارے اور ملت اسلامیہ کے احیاء کے یقین کا اظہار کیا گیا ہے ان تصورات کو اقبال کی فنی مہارت اور شعری محاسن کے استعمال نے اتنا پرتاثیر بنا دیا ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ نظم اقبال کے معجزہ فن کا ایک یادگار نمونہ قرار پائی ہے۔

گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد اقبال موتمر اسلامیہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے بیت القدس (فلسطین) تشریف لے گئے۔ رسول اکرم ﷺ کے روضہ اطہر[3] پر حاضری اقبال کی ایک دیرینہ خواہش تھی مگر فلسطین جیسے قریبی دیار میں ہوتے ہوئے بھی روضہ اطہر کی زیارت نصیب نہ ہوئی ان کی

---

(۱) تھوڑی دیر کے لئے (۲) ناپائیدار (۳) نہایت پاک

محرومی تڑپ میں بدلی اور ''ذوق وشوق'' کے نام سے ایک نظم وجود میں آئی۔ یہ بال جبریل کی مایہ افتخار نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ ''ذوق وشوق'' پانچ بندوں پر مشتمل نظم ہے جس میں اقبال نے اپنی ملت کی مردہ دلی اور بے عملی کا ماتم کیا ہے جو جذبہ اور ایمان کے فقدان کا نتیجہ ہے اسے اقبال عشق قرار دیتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

عقل و دل و نگاہ کا مُرشد اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دین بتکدہ تصورات

....

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اس بند کے بعد نعت رسول مقبولﷺ قلم بند ہوئی ہے اقبال کے نزدیک رسول خدا کی مقدس ذات تخلیق کائنات کا باعث ہے اگلے بند کے اشعار میں رسول کریم کے اسوۂ حسنہ اور اتباع رسالت کی اہمیت بیان کی ہے۔

آخری بند میں عقل وعشق کے مقابلے میں عشق کی فوقیت کے علاوہ اقبال نے وصل وفراق کا تصور بھی پیش کیا ہے۔ یہ نظم زبان اور حسن و بیان کا دلفریب امتزاج (۱) ہے جذبہ کا خلوص، تغزل کی چاشنی اور سوز وگداز نے نظم کی آفرینی میں بڑا حصہ لیا ہے۔

بال جبریل کی تیسری بڑی نظم ''ساقی نامہ'' ہے یہ ساقی نامہ اردو کے ساقی ناموں کی تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظم میں فکر اقبال کی ترجمان قرار دی جاسکتی ہے۔ ''ساقی نامہ'' سات بندوں کی نظم ہے پہلا بند تمہیدی ہے اس میں بہار اور جوئے کہستان کے مناظر سے ایک فضا تیار کی گئی ہے جب قاری کا ذہن شاعری کی گرفت میں آجاتا ہے تو دوسرے بند سے مختلف مباحث پر اظہار خیال کا آغاز ہوجاتا ہے عالمی سیاست کے تغیرات اور زمانے کے بدلے ہوئے انداز کے پیش نظر اقبال کو ملوکیت (۲) مغرب کی

---

(۱) ملاپ (۲) شہنشاہی

سامراجی قوتیں اور دور سرمایہ داری انقلاب کی زد میں دکھائی دیتا ہے مگر جب وہ مسلمانوں کو روایات میں مگن دیکھتے ہیں تو اقبال اس بات پر نہایت آزردہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی افسردگی اور ملت اسلامیہ کے انحطاط کا علاج یہی ہے کہ نوجوان احیائے ملت کے جذبے سے سرشار ہو جائیں۔ اس لئے وہ ساقی سے ان نوجوانوں کے لئے ''دل مرتضیٰ'' اور ''سوز صدیق'' کی التجا کرتے ہیں اور ان کے سینوں میں تمنا کی بیداری کی دعا کرتے ہیں۔ اس کے بعد زندگی کے حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اقبال حرکت اور قوت کو زندگی کا راز بتاتے ہیں۔ چھٹے بند میں اقبال نے نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ تصور خودی کو نئے زاویے سے پیش کیا ہے آخری بند میں خودی کی نگہداشت کی تلقین کرتے ہوئے کائنات کی تسخیر کو مقصد حیات قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے مطابق یہ اعلیٰ ترین مقصد خودی کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فنی محاسن کے اعتبار سے بھی یہ ایک کامیاب نظم ہے اختصار و جامعیت ایجاز و بلاغت روانی اور جوش بیان نے نظم کو معنوی اور فکری طور پر گراں بار نہیں ہونے دیا۔

اقبال اسلامی اقدار سے محبت کرتے تھے۔ انہیں سماجی ناانصافی اور معاشی ناہمواری کا شدید احساس تھا اس لئے وہ بندہ مزدور کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے بیسویں صدی کے ربع اول [۱] میں روس کے اشتراکی [۲] انقلاب نے عالمی ذہن کو بڑا متاثر کیا۔ علامہ اقبال بھی اس انقلاب کے بعض علمی پہلوؤں کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر حضرت علامہ کو تاریخ کی مادی تعبیر اور سیکولر نظریہ سے سخت اختلاف تھا۔ بال جبریل میں وہ اشتراکی انقلاب کے داعی لینن [۳] کے بارے میں ایک نظم لکھتے ہیں۔ اس کا عنوان توجہ طلب ہے۔ ''خدا کے حضور میں'' اس نظم میں لینن خدا کی ہستی کا اقرار کرنے کے بعد بعض سیاسی اور سماجی

---

(۱) پہلی چوتھائی (۲) اشتراکیت ۱۹۱۷ء میں ہونے والا اشتراکی انقلاب، ایک نظریہ حیات جس کے مطابق ذرائع پیداوار پر عوام کی مشترکہ ملکیت ہونی چاہیے۔ (۳) ایک انقلابی جس نے ۱۹۱۷ء میں زار روس کا تختہ الٹا

حقائق کا اظہار کرتا ہے اثبات حق کے بعد لینن کی زبانی اقبال نے جتنی باتیں کہلوائی ہیں ان پر دونوں کا اتفاق ہوتا ہے سرمایہ دارانہ تمدن کی غیر انسانی اقدار، سرمایہ دارانہ استبداد اور استحصال مزدور کی حق تلفی، مذہب کی بے قدری اور اخلاق سوزی و بے مروتی پر تبصرہ کے بعد لینن بارگاہ ایزدی میں سوال کرتا ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تیری منتظر روز مکافات[1]

بعض دوسری نظمیں مثلاً ''فرشتوں کا گیت'' ''فرمان خدا'' (فرشتوں سے) ''''گدائی'' اور ''الارض اللہ''[2] معنوی لحاظ سے ''لینن (خدا کے حضور میں)'' کے ساتھ ربط رکھتی ہیں۔

اقبال کے لئے ابلیس کے کردار میں حرکت و حرارت کا عنصر کشش کا باعث ہے۔ ''جبریل و ابلیس'' مکالماتی انداز کی نظم ہے جس میں ابلیس جبریل کی سکون پرستی کے مقابلے میں اپنے ذوق عمل اور جرأت پر بڑا ناز کرتا ہے اقبال نے ابلیس کی شخصیت کے منفی رجحانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا بال جبریل کی دو مختصر نظموں ''ابلیس کی عرضداشت'' اور ''آزادی افکار'' میں دور حاضر میں سیاست کے بعض شر انگیز پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر پر مولانا رومی[3] کے افکار کا بڑا اثر ہے انہوں نے اپنے کلام میں کئی مقامات پر مولانا روم کو اپنا پیر و مرشد قرار دیا ہے اور عارف رومی کو شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بال جبریل کی نظم ''پیر و مرید'' بھی مکالمے کے انداز میں لکھی گئی ہے اس میں مرید ہندی ''زندگی اور کائنات کے بعض رموز کے بارے میں سوال کرتا ہے اور پیر رومی جواب میں مثنوی معنوی[4] کے اشعار پیش کرتے ہیں اس تصوراتی مکالمے کے نتیجے میں حیات و کائنات کے وہ موضوع سامنے آ جاتے ہیں جو

---

(۱) بدلے کا دن مراد سرمایہ داری کے خلاف انقلاب (۲) مطلب ہے زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے (۳) مولانا جلال الدین رومی فارسی کے مشہور شاعر (۴) مولانا رومی کی مشہور مثنوی

اقبال کے فلسفۂ حیات، کی بنیاد ہیں ایک اور مختصر نظم ''یورپ سے ایک خط'' میں بھی اقبال نے رومی کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

اقبال زوال ملت کے اسباب اور احیائے ملت کے امکانات پر غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ مغرب کی ملحدانہ تعلیم اور مادہ پرستی نے نئی نسل کو روحانی و اخلاقی اقدار و روایات اور قومی شعور سے بیگانہ کر دیا۔ اب نوجوانوں کے اندر بلند ہمتی اور جفاکشی کا جوہر باقی نہیں رہا۔ جس سے وہ سہل پسندی اور تن آسانی کا شکار ہو گئے ہیں.......... اس مضمون کو حضرت علامہ نے اپنی نظم ''ایک نوجوان کے نام'' میں بیان کیا ہے۔ احیائے ملت کے لئے وہ چاہتے ہیں کہ جوانوں میں عقابی روح بیدار ہو جائے کیونکہ:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

حضرت علامہ اپنی قوم کے بچوں میں شاہینی صفات پیدا کرنے کے متمنی تھے اور جب وہ شاہین کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد بلند ہمت سخت کوشش اور خوددار نوجوان ہوتے ہیں بال جبریل کی نظمیں ''نصیحت'' اور شاہین'' اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح اقبال نے اپنے کلام میں جہاں اپنے صاحبزادے جاوید سے خطاب کیا ہے وہاں جاوید کے ساتھ قوم کے تمام فرزندان سے مخاطب ہیں بال جبریل میں '' جاوید کے نام'' سے دو نظمیں شامل ہیں جن میں جاوید کو خودی عشق اور فقر کا مسلک اپنانے کی تلقین کی گئی ہے ''نپولین (۱) کے مزار پر'' کے زیر عنوان نظم میں اقبال نے سکندر (۲) اور تیمور (۳) کے جوش کردار کی تعریف کی ہے مسولینی کی شخصیت میں ندرت فکر و عمل اور ذوق انقلاب کا پہلو اقبال کو متاثر کرتا ہے۔ نظم '' تاتاری کا خواب'' میں روح تیمور انقلابی پیغام دیتی ہے ''خوشحال خان (۴) کی وصیت'' میں اقبال نے اس کے جذبہ حریت کی داد دی ہے نپولین تیمور اور مسولینی (۵) وغیرہ کی تعریف کی بنا پر بعض کم نظر نقادوں نے اقبال پر فاشسطی میلانات (۶) رکھنے کے اعتراضات بھی عائد کئے ہیں۔ یہ

---

(۱) مشہور فرانسیسی سپہ سالار جو ترقی کر کے فرانس کا حکمران بن گیا تھا (۲) مشہور یونانی فاتح (۳) ترکستان کا مشہور مغل فاتح (۴) پشتو کا مشہور شاعر جس کی زندگی مغلوں کے خلاف لڑنے میں گزری (۵) اٹلی کا مشہور رہنما جس نے فاشسٹ یعنی جمہوریت دشمن نوجوانوں کو منظم کیا یہ اشتراکیت کے بھی خلاف تھا (۶) مسولینی کی تحریک فاشزم سے متاثر

اعتراضات درست نہیں ہیں اگر ابلیس کے کردار میں حرکت وحرارت کے عنصر نے اقبال کو متوجہ کیا تھا تو ان تاریخی شخصیات کا حریت پسندانہ اور انقلابی پہلو اقبال کو متاثر کرتا ہے اور وہ اس تاثر کو اپنے قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں اقبال عظمت آدم اور شرف انسانیت کے کس قدر قائل تھے۔ اسکی تفصیل دو نظموں ''فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں'' اور ''روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' میں دیکھی جا سکتی ہے مسلمانوں کے اجتماعی زوال کی انتہا یہ ہے کہ صوفی اور ملا بھی بے عملی اور کوتاہ اندیشی کے سبب اپنے منصب کے شایان شان کردار ادا نہیں کر پا رہے تھے، بال جبریل کی نظمیں ''پنجاب کے پیرزادوں سے'' ''باغی مرید'' ''فقر'' اور ''ملا اور بہشت'' وغیرہ صوفی اور ملا کے منفی رخ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس سلسلے کی دو نظمیں ''اذان'' اور ''حال ومقام'' ہیں جن میں ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان کا فرق واضح کیا گیا ہے اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کے اعتبار سے مندرجہ ذیل مختصر نظمیں بھی قابل ذکر ہیں۔

''دعا'' ''قید خانہ میں معتمد[1] کی فریاد'' ''عبدالرحمن اول[2] کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت'' ''سرزمین اندلس میں'' ''ہسپانیہ'' ''طارق کی دعا'' ''لالہ صحرا'' ''زمانہ'' ''محبت'' ''پنجاب کے دھقان'' ہے۔

بال جبریل کی زیادہ مختصر نظمیں مثلاً لہو، پرواز، شیخ مکتب سے، فلسفی، ہارون کی آخری نصیحت ماہر نفسیات سے یورپ شیر اور خچر اور چیونٹی اور عقاب وغیرہ بھی فکر اقبال کے کسی نہ کسی گوشہ پر ہلکی سی روشنی ڈالتی ہیں۔ بال جبریل میں اختصار کے اس تجربے سے بعد میں اقبال نے ضرب کلیم میں بڑا فائدہ اٹھایا۔

نظموں اور غزلوں کے علاوہ بال جبریل میں رباعیات بھی شامل ہیں جن میں سے کچھ کو بعض نقاد فنی باریکیوں کے پیش نظر قطعہ قرار دیتے ہیں بہر حال مجموعی طور پر اقبال کی دوبیتیوں کو رباعی تسلیم کر لیا گیا ہے رباعی ایک ایسی صنف سخن ہے جو چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے رباعی کی مخصوص ہیئت ہے اس کے مطابق پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں تیسرے مصرعہ میں قافیہ لایا جا سکتا ہے مگر ضروری نہیں ہے۔ رباعی کی صنف کسی خاص موضوع کی پابند نہیں اس میں ہر طرح کے خیالات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ اقبال نے موضوع کے لحاظ سے رباعی میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا کی بال جبریل اور ارمغان حجاز کی رباعیات میں فکر اقبال کے مختلف زاویے اور حیات وکائنات کے بہت سے مسائل قلمبند کئے ہیں۔

---

(۱) اندلس پر حکمران خاندان بنو عباد کا سب سے بڑا بادشاہ المعتمد علی اللہ

(۲) عبدالرحمن جو الداخل کے لقب سے مشہور ہے اور اندلس میں اموی سلطنت کا بانی تھا

۱.۴۔ خود آزمائی نمبر ۲

(۱) ان سوالوں کے جواب لکھیں:

۱۔ بال جبریل کی غزلیات میں کون سی چیز بدلی ہوئی نظر آتی ہے؟

۲۔ بال جبریل کی غزلوں میں کون سے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے؟

۳۔ سوز وگداز، جذبہ کا رچاؤ، ترنم اور موسیقیت وغیرہ کے مرکب کو غزل میں کیا نام دیا جاتا ہے؟

۴۔ فکر اقبال میں کس چیز کو مرکزی اہمیت حاصل ہے؟

۵۔ فلسفۂ اقبال کے موضوع کا اہم پہلو کون سا ہے؟

۶۔ عقل وعشق کے مقابلے میں اقبال کس کو اہمیت دیتے ہیں؟

۷۔ علامہ اقبال نے اپنے دورہ ہسپانیہ کے دوران میں کون سی مشہور نظم لکھی؟

۸۔ بال جبریل کی تیسری بڑی نظم کا نام بتایئے؟

۹۔ بال جبریل میں اشتراکی انقلاب کے داعی کے بارے میں کون سی نظم لکھی گئی ہے؟

۱۰۔ بال جبریل میں علامہ اقبال نے کس شخصیت کو اپنا پیرومرشد قرار دیا؟

۲۔ صرف صحیح جملوں پر یہ ☑ نشان لگایئے:

۱۔ غزل اردو اور فارسی کی مقبول ترین صنف سخن ہے۔

۲۔ علامہ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غزلوں میں فلسفہ، سیاست اور معاشرت کے مسائل بیان کئے ہیں۔

۳۔ علامہ اقبال کے بندۂ مومن کی شخصیت جوش عمل، مستی کردار اور یقین وایقان سے تشکیل پاتی ہے۔

۴۔ علامہ اقبال کے ہاں نظریہ فن خون جگر کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔

۵۔ علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی بدحالی کا علاج یہ ہے کہ نوجوان احیائے ملت کے جذبے سے سرشار ہوں۔

۶۔ نظموں اور غزلوں کے علاوہ بالِ جبریل میں رباعیات بھی شامل ہیں۔

۷۔ رباعی ایسی صنف سخن ہے جو پانچ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

۸۔ علامہ اقبال اپنی قوم کے بچوں میں شاہینی صفات پیدا کرنے کے خواہشمند تھے۔

۹۔ اقبال حریت اور قوت کو زندگی کا راز نہیں بتاتے۔

۱۰۔ اقبال ۱۹۳۵ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے بعد ہسپانیہ تشریف لے گئے۔

۵۔ضرب کلیم

علامہ اقبال کا تیسرا اردو مجموعہ ۱۹۳۶ء میں ''ضرب کلیم'' کے عنوان سے شائع ہوا۔اس وقت تک اقبال اپنے فلسفہ وفکر کو تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے تھے۔اب ان کے افکار میں ایک اجمالی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

ضرب کلیم کی نظمیں اختصار اور جامعیت کی حامل ہیں۔لیکن ان میں کوئی تکلف باقی نہیں رہا۔فنی نزاکتیں اور شاعرانہ محاسن اقبال کے اظہار خیال پر اثر انداز نہیں ہوئے شاعری میں براہ راست اسلوب کو پسندیدہ خیال نہیں کیا جاتا کیونکہ اس طرح شعریت مجروح ہو جاتی ہے۔اقبال کے ہاں یہ خامی پیدا ہونے کے تمام امکانات موجود تھے۔مگر اقبال کے اس مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہمیں اس میں فکر، جذبہ اور فن کی مکمل ہم آہنگی ملتی ہے۔یہ نظمیں اقبال کے نظریہ فن کی عمدہ مثالیں ہیں۔اقبال شاعری کو اپنے خاص مقصد اور نظریات کی اشاعت کے لئے ایک ذریعہ خیال کرتے تھے۔اقبال نے اپنی بیشتر فارسی کتابیں باقاعدہ موضوعات کے مطابق تحریر کی ہیں۔اردو کتابوں میں یہ امتیاز ضرب کلیم کو حاصل ہے کہ اس میں انہوں نے اپنے موضوعات کی حدود قائم کی ہیں۔

اس کے علاوہ ضرب کلیم کی دو ابتدائی نظموں بعنوان ''ناظرین سے'' اور ''تمہید'' سے اقبال کے نقطہ نظر کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ان میں وہ زندگی کے حقائق پیش نظر رکھنے کی اہمیت بیان کرتے ہیں اور کارزار حیات میں جدوجہد اور سخت کوشی کو لازم قرار دیتے ہیں۔انہوں نے مشرقی اقوام کے روحانی اضمحلال [1] اور خیال پرستی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی شاعری اور پیغام کے انقلاب آفرین اثر کا بیان کیا ہے نیز:

جو کوکنار [2] کے خوگر تھے ان غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوق جذبہ ہائے بلند

---

(۱) کمزوری (۲) افیون/ پوست

تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے
وہ پرشکستہ کہ صحن سرا میں تھے خورسند(۱)

بانگ درا کی تقسیم زمانی لحاظ سے کی گئی تھی لیکن ضرب کلیم کی نظموں کو موضوعات کے اعتبار سے تقسیم کرتے ہوئے مندرجہ ذیل چھ عنوانات قائم کئے ہیں۔

۱۔ اسلام اور مسلمان ۲۔ تعلیم و تربیت

۳۔ عورت ۴۔ ادبیات فنون لطیفہ

۵۔ سیاسیات مشرق و مغرب ۶۔ محراب گل افغان کے افکار

بانگ درا کے حصہ سوم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے مسائل علامہ اقبال کی شاعری کا موضوع بن گئے تھے۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ملت اسلامیہ کا احیاء اقبال کی سب سے بڑی آرزو تھی جس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی۔ اقبال ملت اسلامیہ کی حالت زار اور گراں خوابی سے بہت آزردہ تھے انہیں مسلمانوں کے اعمال اور عقائد میں وہ اخلاص نظر نہیں آتا تھا جو اسلاف(۲) کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ چاہتے تھے کی مسلمان قرآن کریم کی روشنی میں اپنی معاشرتی زندگی کو استوار کریں۔ رسول اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کو اپنا کر ملت کی بقا کا سامان کریں۔ ضرب کلیم کے اس حصے (اسلام اور مسلمان) میں اقبال نے جن موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں ان کا لب لباب یہی ہے کہ مسلمان جن باطل عقائد کا شکار ہو چکے ہیں ان کو ترک کر کے پستی اور زوال سے نکلیں۔

اسلام میں توحید و رسالت پر ایمان کی بنیاد رکھی گئی ہے علامہ اقبال نے اپنی نظم و نثر میں جگہ جگہ توحید و رسالت کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کیا ہے توحید کی حقیقت سے واقف ہو کر عقیدے میں جو توانائی پیدا ہوتی ہے اور اس سے جو روحانی طمانیت کا احساس ہوتا ہے نیز اس سے اجتماعی شعور کو جو بالیدگی نصیب ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ توحید پر ایمان اور اعتقاد میں اگر ضعف پیدا ہو جائے تو فرد اور ملت پر یکساں

---

(۱) خوش (۲) اگلے وقتوں کے لوگ۔ بزرگ (سلف کی جمع)

اس کے بُرے اثرات وارد ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے عروج وزوال کی تاریخ میں اس حقیقت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ کے انحطاط کا سبب یہ ہے کہ اب تصورِ توحید ایک فعال قوت نہیں رہا بلکہ فقط موضوع بحث کی حقیقت اختیار کر گیا ہے۔ ''توحید'' کے عنوان سے ایک نظم میں کہتے ہیں۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے، فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

اس کے علاوہ دو نظمیں ''لا الٰہ الا اللہ'' اور ''نکتہ توحید'' کے عنوان سے ہیں۔ اقبال کو تصوف کے غیر اسلامی پہلوؤں سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ کیونکہ اسلامی دنیا میں مروج مسلک (۱) تصوف رہبانیت (۲) کا سبق دیتا ہے اس سے تقدیر پرستی اور مسکینی کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں ''صوفی سے'' ''تصوف'' ''فقر و راہی'' ''تن بہ تقدیر'' ''تسلیم و رضا'' اور ''شکست'' وغیرہ میں تصوف کے متذکرہ رجحان کی مذمت کی گئی ہے اس حصے میں ایک نظم ''کردار'' کے زیر عنوان ان تین شعروں پر مشتمل ہے۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

....

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

....

---

(۱) تصوف کے جس طریقہ کا رواج ہے (۲) ترک دنیا

اقبال کو ملائے حرم سے یہ شکایت ہے کہ اس کی نماز میں نہ جمال باقی ہے اور نہ جلال۔ اس کی اذان تاثیر سے خالی ہے کیونکہ بندہ مومن کی اذان کا رنگ تو یہ ہے کہ:

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذان سے پیدا

اقبال نے اپنے مردِ مومن کے خدوخال زیرِ نظر حصے کی کئی نظموں میں پیش کیے ہیں ان میں ''فقر و ملوکیت'' ''قلندر کی پہچان'' ''مردانِ خدا'' ''کافر و مومن'' ''مہدی برحق'' ''مومن'' ''الہام'' ''آزادی'' اور ''مرد مسلمان'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے، موضوعات پر نظموں کے چند عنوانات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

''مسلمانوں کا زوال'' ''ہندی مسلمان'' ''اسلام'' ''ہندی اسلام'' ''مدنیت اسلام'' ''پنجابی مسلمان'' ''اشاعت اسلام انگلستان میں'' ''امرائے عرب سے'' ''جہاد'' ''اجتہاد'' ''نماز'' ''وحی''، معراج، علم اور دین، قوت اور دین، آزادی احکام الٰہی اور علم و عشق وغیرہ۔

اقبال کے فکر و فن کا مقصود تہذیبی اصلاح اور قومی فلاح و بہبود ہے وہ اسلامی معاشرت کے فروغ اخلاقی اقدار کی ترویج اور ملت کے احیاء کے لئے عمر بھر کوشاں رہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے جہاں عام طور پر اپنی شاعری اور تحریروں میں فکر انگیز تصورات پیش کئے وہیں نظام تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ صرف کی۔ ضرب کلیم کے دوسرے حصے کا عنوان بھی ''تعلیم و تربیت'' ہے اس حصے میں جو منظومات درج ہیں ان میں انہوں نے مشرقی اقوام کے طرز عمل اور مغربی اور مشرقی درسگاہوں کو تنقید کا ہدف بنایا ہے کہ ان میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس سے تعلیمی مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی۔ یہ تعلیم فکر و نظر کی بلندی پیدا کرنے کی بجائے تقلید اور خوئے غلامی کو استوار کرتی ہے انہیں مدرسہ، اساتذہ اور طلبہ سے شکایت ہے کہ وہ ان خصوصیات اور صفات سے محروم ہیں جن کے بل بوتے پر قومی تعمیر و ترقی کا فریضہ سرانجام دیا جاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک زندگی کے خوب و زشت (۱) کا معیار خودی کا اصول ہے ''مقصود'' کے عنوان سے نظم میں موت وحیات کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حیات و موت نہیں التفات (۲) کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

خودی اقبال کے فلسفہ حیات کا مرکز ومحور ہے اس میں افراد کے لئے ایک نظام تربیت فراہم کیا گیا ہے گویا خودی شخصیت کی تعمیر وتشکیل کا ایک ایسا دستور العمل ہے جس پر عمل پیرا ہونے والا انسانیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوسکتا ہے۔ اقبال کو مشرق ومغرب میں جو بے نوری، بیماری اور اضمحلال (۳) نظر آتا ہے وہ مرگ خودی کی بدولت ہے ''مرگ خودی'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام (۴)
خودی کی موت سے روح عرب ہے بے تب وتاب
بدن عروق وعجم کا ہے بے عرق و عظام! (۵)
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال و پر (۶)
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام!

ضرب کلیم کے زیر نظر باب کی نظموں میں عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

اقوام مشرق، آگاہی، مصلحین مشرق، مغربی تہذیب، سلطان ٹیپو کی وصیت، بیداری، خودی کی تربیت، آزادی فکر، خودی کی زندگی، ہندی مکتب، تربیت خوب وزشت، عصر حاضر، طالب علم، امتحان، مدرسہ اساتذہ دین وتعلیم، جاوید سے (تین نظمیں) کے الفاظ کہ:

---

(۱) اچھائی اور برائی (۲) توجہ (۳) کمزوری (۴) کروڑ (۵) ہڈیوں اور رگوں کے بغیر مراد خالی (۶) جس کے بازو اور پر ٹوٹے ہوئے ہوں

انسانی تاریخ کے تقریباً ہر دور میں جو نظام معاشرت قائم ہوا اس میں عورت کا ایک خاص مقام رہا ہے کیونکہ عورت کا بنیادی فریضہ اور منصب اولاد کی تربیت قرار دیا گیا مگر مغربی معاشرت وتہذیب میں خرابی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس میں معاشرتی اقدار اور اخلاقیات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔مثلاً عورت کے فرائض اور فطری تقاضوں کو عہد حاضر نے جس بے حسی کے ساتھ نظر انداز کیا ہے اس سے بہت سے معاشرتی مسائل پیدا ہوئے۔اقبال نے ان مسائل پر غور وفکر کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عورت کا اصل منصب امومت (۱) ہے جسے آزادی نسواں کی تحریک نے بری طرح مجروح کیا اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مشرق عورت کے معاملے میں بھی مغرب کی تقلید کو اپنا مطمح نظر جانتا ہے۔

ضرب کلیم کا تیسرا اہم موضوع عورت ہے اس باب میں کل نو نظمیں ہیں ''مرد فرنگ'' پہلی نظم کا عنوان ہے اس میں اقبال فرنگی معاشرت کی خرابی کا ذمہ دار مرد کو ٹھہراتے ہوئے کہا کہ اس نے عورت کی فطرت کو پہچاننے میں کوتاہی کی ہے۔اقبال یورپ کے اہل فکر سے ''ایک سوال'' میں پوچھتے ہیں:

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار و زن تہی آغوش

''عورت'' کے عنوان سے نظم میں کائنات میں عورت کی اہمیت اور قدر و قیمت دو مختلف زاویوں سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

....

---

(۱) ماں ہونا

اسی طرح دوسری نظموں میں مثلاً ''آزادیِ نسواں'' ''عورت کی حفاظت'' ''عورت اور تعلیم'' ''عورت اور خلوت'' میں عورت کے مسائل کا بیان ہے۔ مندرجہ ذیل دو اشعار کو ان نظموں کا لب لباب سمجھنا چاہیے:

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

....

فن اور ادب تہذیبی عمل ہے انسانی تاریخ گواہ ہے کہ معاشرے پر فنون لطیفہ کے دوررس اثرات ہوتے ہیں۔ فنکار کسی معاشرے کے رجحانات اور میلانات کو تبدیل کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر اس کے پیش نظر زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد ہو تو ایسے فن کار کی تخلیق انسانوں کے جذبے اور شعور کو جلا بخشتی ہے اگر فنکار کے پیش نظر کوئی نصیب العین نہ ہو تو وہ معاشرتی برائیوں کی اصلاح کی بجائے زیادہ بگاڑ کا باعث ہوتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے علاوہ تحریر و تقریر میں کئی جگہ فن کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا خواجہ عبدالوحید صاحب نے ایک موقعہ پر علامہ اقبال سے گفتگو کا ملخص قلمبند کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''آپ نے فرمایا کہ آرٹ کے متعلق دو نظریے موجود ہیں۔ اول یہ کہ آرٹ کی غرض محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے دوم یہ کہ آرٹ انسانی زندگی کو بہتر بناتا ہے ان (اقبال) کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے ہر چیز کو انسانی زندگی کے لئے وقف ہونا چاہیے اور اس لئے ہر وہ آرٹ جو انسانی زندگی کے لئے مفید ہو جائز ہے اور وہ آرٹ جو زندگی کے لئے مضر ہو ناجائز ہے۔ وہ آرٹ انسان کی ہمت کو پست اور اس کے جذبات عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو، قابل نفرت ہے اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیے۔ آرٹ کے مضر اثرات کے متعلق آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتا ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کی تباہی میں ان کے فن موسیقی کا بہت بڑا حصہ رہا ہے''۔

اس اقتباس سے اقبال کے نظریہ فن کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں اقبال اور ادبیات اور فنون لطیفہ کی افادیت اور مقصدیت کے بڑے قائل تھے۔ وہ ایسے فن کو مستحسن خیال کرتے ہیں جس سے زندگی میں جوش اور امنگ پیدا ہو جو فن جذبہ تسخیر کو ابھارتا ہے۔ اور کشمکش حیات میں حوصلے اور جرأت کی افزائش کرتا ہے وہ حیات ابدی کا پیغام ہے اس کے برعکس جن فنون سے کم ہمتی، مردہ دلی اور افسردگی کی فضا پیدا ہو اور جو ذوق حیات کو گریز آشنا کریں وہ اقبال کے نزدیک مردود ہیں اور ہر سطح پر اقبال ان کی مذمت کرتے ہیں۔

''ادبیات وفنون لطیفہ'' کے عنوان کے ماتحت ضرب کلیم کا چوتھا باب قائم کیا گیا ہے اس میں'' فنون لطیفہ'' کے نام سے پانچ اشعار پر مشتمل ایک نظم ہے جو اس باب کی نمائندہ نظم کہی جا سکتی ہے اقبال اس میں کہتے ہیں:

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

زیرِ نظر حصہ چالیس سے زائد نظموں پر مشتمل ہے ان میں شعر، ادب دین، ہنر، مسجد وفن تعمیر، رقص، موسیقی، تھیٹر، شاعر اور دو تین مشہور فارسی شعراء کو موضوع سخن بنایا گیا ہے اور کم وبیش ہر نظم میں مختلف فنون نے مذموم (۱) یا مستحسن (۲) پہلوؤں کو خودی کے حوالے سے جانچا ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری کے دور میں سیاسی مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا ان کے کلام کا معتدبہ حصہ (۳) سیاسی افکار پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنے ملک وقوم کے سیاسی مصائب اور مسائل کے حل کے لئے عملی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے عالمی سیاسی صورت حال پر اپنے کلام میں جہاں تبصرہ کیا وہاں دوسری تحریروں میں اس کا بے لاگ تجزیہ بھی کیا ہے چنانچہ جمہوریت، اشتراکیت، ملوکیت، نظام سرمایہ داری، انقلابی تحریکات، آزادی اور غلامی وغیرہ کے بارے میں ان کے ہاں بڑے واضح خیالات کا اظہار ہوا ہے ضرب کلیم کے پانچویں باب میں چھوٹی چھوٹی پینتیس نظمیں سیاسیات مشرق و مغرب، کے عنوان سے درج ہوئی ہیں۔ ان نظموں کے مجموعی مطالعہ سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ اقبال روس کے اشتراکی انقلاب کے بعض پہلوؤں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ زیرِ نظر باب میں اشتراکیت، کارل مارکس (۴) کی آواز اور بالشویک روس (۵) کے عنوان سے تین نظموں میں سرمایہ داری اور کلیسائیت پر اشتراکی یورش کا جائزہ لیا ہے مگر یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ انہیں سرمایہ ومحنت کی آویزش کا بہترین حل قرآن پاک میں ملتا ہے پہلی نظم ''اشتراکیت'' کے آخری دو شعروں میں مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار!

---

(۱) قابل علامت (۲) قابل تعریف (۳) زیادہ حصہ (۴) اشتراکی فلسفہ پیش کرنے والا جرمن یہودی (۵) اشتراکی روس

جو حرف قل العفو(1) میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اقبال کے نزدیک یورپی سیاست ابلیسی خصوصیات کی حاصل ہے۔اس کے زیر اثر یہ ابلیسی خصوصیات ایک خام اور ناقص نظام ہے جس میں انسانوں کو گنا تو جاتا ہے مگر تولا نہیں جاتا فرنگی اقوام نے بڑی چالاکی سے ایسے پروگرام وضع کئے جس کا مقصد ایشیاء والوں کو اپنے مذہب اور روایات سے بیگانہ کرنا ہے دیکھئے نظام ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں سے'' ایک فرنگی اپنے بیٹے کو ''نصیحت'' نامی نظم میں یہ ملوکانہ راز بتاتا ہے کہ محکوم کی خودی کو تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر ملائم کرلو۔اس کے بعد جدھر چاہو اسے پھیر لو۔اقبال کو مشرق کی غلامانہ ذہنیت پر بڑا دکھ ہوتا ہے۔اس حصے کی کئی نظموں میں اقبال نے خوئے غلامی اور نفسیات محکومی کا ذکر کیا ہے مثلاً ''گلہ'' کے عنوان پر نظم میں انہیں اپنے اہل وطن سے شکایت ہے کہ وہ یورپ کی غلامی پر رضامند ہوگئے ہیں فلسطینی عرب سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذت نمود ہے

اقبال مشرق اور مغرب کو مرض میں مبتلا دیکھتے ہیں۔مگر دونوں کے مرض کا سبب مختلف ہے نظم ''مشرق ومغرب'' میں ہے۔

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری

اقبال کا خیال ہے کہ فرسودہ نظام بہت جلد بدل جائے گا وہ ایشیا اور یورپ کو اخلاقی بدحالی کے پیش نظر انقلاب کی زد میں دیکھتے ہیں''انقلاب'' بھی مندرجہ ذیل دوشعروں پر مشتمل ہے:

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز ساز حیات!
خودی کی موت ہے یہ، اور وہ ضمیر کی موت!

---

(1) قرآن حکیم کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کہہ دو جو بچے اپنے خرچ سے ،خرچ کردو دوسروں پر

دلوں میں ولولہ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی۔ شاید جہان پیر کی موت

ضرب کلیم کے آخری باب کا عنوان ''محراب گل افغان کے افکار'' ہے قارئین محراب گل کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ حکیم محمد حسین عرشی نے خط لکھ کر اقبال سے استفسار کیا۔ علامہ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۶ء میں انہیں جواب میں لکھتے ہیں کہ ''محراب گل'' محض فرضی نام ہے۔

یہ نظم بیس مختلف اجزاء پر مشتمل ہے۔ یہ اجزاء ترتیب قوافی اور بحر کے لحاظ سے مختلف ہیں ہر جز و ایک الگ وحدت رکھتا ہے۔ ہر ٹکڑے میں مختلف موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس نظم میں اقبال کا اسلوب بڑا سادہ ہو گیا ہے تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع کے وسیلوں کو کم از کم بروئے کار لایا گیا ہے اس لئے خیال و فکر براہ راست ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔

ان نظموں میں حریت فکر و نظر کی تعلیم دی گئی ہے۔ کشمکش حیات میں ہمت، جوانمردی، بلند حوصلگی اور استقلال کی اہمیت بیان کی گئی ہے خودی اور انقلاب، خودی اور فقر و درویشی، خودی اور تقلید وغیرہ کے باہمی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے فرزند کہستان کو اپنی خودی پہچاننے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان!
تو بھی اے فرزند کہستان! اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان!
او غافل افغان!

محراب گل افغان کے افکار، میں تعلیم اور فن کے بارے میں بھی باتیں کہی گئی ہیں اقبال نے نژاد نو (۱) کو بھی اپنا مخاطب بنایا ہے ایک جگہ اقبال کے مثالی نو جوان کی تصویر روشن ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے:

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری

بہر حال ''محراب گل افغان کے افکار'' دراصل اقبال کے افکار ہیں جنہیں اقبال اپنے دوسرے اردو فارسی کلام میں صراحت کے ساتھ بیان کر چکے تھے۔

---

(۱) نئی نسل،

۵.۱۔ خود آزمائی نمبر ۳

(ا) مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب لکھئے:

۱۔ اقبال کا مجموعہ ضرب کلیم کون سے سنہ میں شائع ہوا؟

۲۔ ضرب کلیم کی نظموں کی دو نمایاں خوبیاں کون سی ہیں؟

۳۔ اقبال اپنے خاص مقاصد اور نظریات کی اشاعت کا ذریعہ کسے خیال کرتے تھے؟

۴۔ اقبال ملت اسلامیہ کی کن دو خرابیوں سے بہت آزردہ تھے؟

۵۔ اقبال کو تصوف کے کن پہلوؤں سے اختلاف تھا؟

۶۔ ضرب کلیم کے دوسرے حصے کا عنوان کیا ہے؟

۷۔ علامہ اقبال کے نزدیک مغربی اور مشرقی درسگاہوں کے نظریہ تعلیم میں کون سے دو نمایاں نقائص تھے؟

۸۔ ضرب کلیم کا تیسرا اہم موضوع کون سا ہے؟

۹۔ ضرب کلیم کے پانچویں باب کی نظمیں کون سے دو موضوعات پر لکھی گئی ہیں؟

۱۰۔ اقبال نے "محراب گل افغان" کی شخصیت کے بارے میں اپنے خط میں کیا وضاحت کی؟

۲۔ صرف صحیح جملوں پر یہ ☑ کا نشان لگایئے:

۱۔ اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ کے انحطاط کا سبب یہ ہے کہ اب تصور توحید ایک فعال قوت نہیں رہا۔

۲۔ اقبال کو ملائے حرم سے یہ شکایت ہے کہ اس کی نماز میں نہ جمال باقی ہے اور جلال۔

۳۔ اقبال کے فکر و فن کا مقصود تہذیبی اصلاح اور قومی فلاح و بہبود ہے۔

۴۔ اقبال ایک ایسا نظام تعلیم چاہتے تھے جس میں مشرق و مغرب کی ساری خوبیاں مجتمع ہوں۔

۵۔ کسی معاشرے کے رجحانات اور میلانات کو تبدیل کرنے میں فن بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔

۶۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ہر دور میں سیاسی مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا۔

۷۔ اقبال کا خیال ہے کہ فرسودہ نظام بہت جلد نہیں بدلے گا۔

۸۔ ضرب کلیم کے پانچویں باب میں چھوٹی چھوٹی اڑتیس نظمیں ہیں۔

۹۔ اقبال روس کے اشتراکی انقلاب کے بعض پہلوؤں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۱۰۔ اقبال کو مشرق کی غلامانہ ذہنیت پر بڑا دکھ ہوتا تھا۔

۶۔ارمغان حجاز

''ارمغان حجاز'' علامہ اقبال کا آخری شعری مجموعہ ہے جسے علامہ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں مرتب کرلیا تھا مگر علامہ کی وفات کے بعد اس مجموعے کی اشاعت ہوئی۔ یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ فارسی رباعیات پر محیط ہے اور دوسرے حصے میں اردو کی چند نظمیں اور رباعیات ہیں۔ اقبال کی مشہور طویل نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' سے حصہ اردو کی ابتداء ہوتی ہے۔ اقبال کے مطابق اس نظم کا سال تصنیف ۱۹۳۶ء ہے۔ اقبال کو ابلیس کی شخصیت میں حرکت و حرارت کا پہلو بہت متاثر کرتا رہا مگر ابلیس کی شخصیت اقبال کے نزدیک خیر کا مجسمہ کبھی نہیں رہی خصوصاً ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں شیطان کی شخصیت کے شرانگیز پہلو کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ نظم کے آغاز میں ابلیس جو باتیں کہتا ہے ان سے اس کی اپنی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے وہ فرنگیوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ملوکیت کے خواب عالمی مذہبی اداروں کی شکست وریخت[1] مفلسوں کی تقدیر پرستی اور امیروں کی سرمایہ پرستی کو اپنا کارنامہ قرار دیتا ہے اس پر ابلیس کے مختلف مشیر سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اداروں کے فساد کو اپنی کارگزاری بتاتے ہیں۔ پہلا مشیر دنیائے سیاست کے ابلیسی نظام کے استحکام میں اپنی کوششوں کا ذکر کرتا ہے اور ملوکیت کے اثر ونفوذ کو اپنی سعی پیہم[2] کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ دوسرے مشیر کے استفسار پر پہلا مشیر جمہوریت کا پردہ یہ کہہ کر چاک کرتا ہے کہ:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

---

(۱) توڑ پھوڑ (۲) مسلسل کوشش

تیسرا مشیر مارکس کی تعلیمات کو اگرچہ شرارت قرار دیتا ہے اور اشترا کی انقلاب کو اس کی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتا ہے مگر اسے مندرجہ ذیل الفاظ میں شاندار خراج تحسین بھی پیش کرتا ہے۔

وہ کلیم بے تجلی[1] وہ مسیح بے صلیب[2]
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب[3]
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

ابلیس کا چوتھا مشیر تیسرے مشیر کی ڈھارس بندھاتے ہوئے مارکس کی تعلیمات اور اشترا کی انقلاب کا توڑ فاشزم کو بتاتا ہے مگر تیسرا مشیر مطمئن نہیں ہوتا۔ اور فرنگی سیاست کی ناکامی سے پریشان ہے اس مرحلے پر پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے ابلیس کے مریدان فرنگ کی فراست پر اعتبار نہیں اور وہ ابلیس کو انقلاب کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

وہ یہودی فتنہ گر[4] وہ روح مزدک کا بروز[5]
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعت افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت[6] پر مدار

---

(۱) کارل مارکس کو ایسا موسیٰ کہا گیا ہے جس نے خدا کا جلوہ نہیں دیکھا (۲) ایسا مسیح جس کا صلیب سے کوئی تعلق نہیں (۳) مارکس پیغمبر تو نہیں مگر کتاب ''سرمایہ'' رکھتا ہے (۴) مارکس یہودی تھا اسے یہودی فتنہ گر کہا ہے مزدک نے ایران میں ایسے ہی نظریات پیش کیے تھے۔ مارکس کا ظہور اقبال کے نزدیک مزدک کا دوبارہ آنا ہے (۵) ظاہر ہونا (۶) سرداری

آخر میں ابلیس تین بندوں میں اس ساری گفتگو کو سمیٹتے ہوئے اپنے ان مشیروں کو بتاتا ہے کہ یہ جہان رنگ و بو اس کے دست قدرت میں ہے۔ میدان سیاست کے رہنما اور کلیسا کے راہبر اس کی گرفت میں ہیں اس لئے:

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشان روزگار، آشفتہ سر(۱) آشفتہ مو(۲)
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت(۳) فتنہ فردا(۴) نہیں، اسلام ہے

دوسرے بند کے تمام اشعار گہرا رمز اور معنویت لئے ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ امت مسلمہ نے قرانی تعلیمات کو فراموش کر رکھا ہے۔ سرمایہ داری بندہ مومن کا دین بن چکا ہے۔ ابلیس اس کو غنیمت خیال کرتا ہے کہ مومن یقین و ایمان کی دولت سے محروم ہے اور کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہتا ہے۔ البتہ ابلیس کے لئے ایک خدشہ سوہانِ روح(۵) ہے۔ یہ خدشہ کیا ہے اس کی اپنی زبان میں سنیے:

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
الحذر،(۶) آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموسِ زن، مرد آزما مرد آفریں
موت کا پیغام ہے ہر نوع غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں

---

(۱) دیوانے (۲) بکھرے بال والے لوگ (۱) دین مزدک مراد اشتراکیت (۲) کل، مستقبل (۳) روح کو تکلیف دینے والا (۴) خدا کی پناہ

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں[1] کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

آخری بند میں ابلیس اپنے مشیروں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم اپنی ابلیسی قوتوں وصلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مسلمان کو عالم کردار سے بیگانہ رکھو کیونکہ:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب[2] کائنات
مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

اقبال خود کشمیری النسل تھے۔ اقبال کے دل میں کشمیر اور کشمیریوں کے مسائل سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ کشمیری برادری کی اصلاح کے لئے لاہور میں جو ''انجمن کشمیری مسلمانان'' قائم کی گئی تھی۔ اقبال اس کے معاملات میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ اقبال نے تحریک آزادی کشمیر ۱۹۳۲ء میں جس جوش وخروش سے حصہ لیا وہ ذاتی رغبت سے کہیں زیادہ اہم ہے کیونکہ کشمیری مسلمان صدیوں سے ظلم وتشدد سے دوچار تھے اور اقبال نے ہمیشہ دنیائے اسلام کے مظلوم خطوں کی حمایت کی اور ان پر سامراجی ستم رانیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ پیام مشرق اور جاوید نامہ میں بھی اقبال نے کشمیر کو موضوع بنایا ہے۔ ارمغان حجاز حصہ اردو میں ملا زادہ ''ضیغم لولابی'' دراصل ''محراب گل افغان'' کی طرح ایک فرضی نام ہے۔ کشمیر کی آزادی کے لئے جس جدوجہد کی ضرورت ہے اس کے لئے بہادر جری اور شجاع افراد درکار ہیں۔ یہ نظم چھوٹے چھوٹے انیس اجزاء پر مشتمل ہے۔

---

(۱) سرمایہ دار (۲) جانچ پڑتال مراد ہے جائزہ

۷۔ دیگر تصانیف

۱۔ اقبال کی سب سے پہلی تصنیف علم الاقتصاد کے نام سے ۱۹۰۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی یہ معاشیات کے موضوع پر اولین کتابوں میں سے ایک ہے اور اس میں نئی اصلاحات کے سلسلے میں اقبال نے علامہ شبلی نعمانی سے بھی مشورہ کیا تھا۔

۲۔ ۱۹۰۸ء میں اقبال نے اپنی تحقیقی کتاب لندن سے شائع کروائی اس کتاب کے پیش کرنے پر میونخ یونیورسٹی جرمن نے ۱۹۰۷ء میں انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی تھی۔ یہ کتاب اسلام سے قبل اور بعد کے فلسفہ ایران سے متعلق ہے جس میں اہم تر فلسفیوں کے افکار سے بحث کی گئی ہے۔

۳۔ ۱۹۱۰ء میں اقبال نے انگریزی زبان میں کچھ نوٹس لکھے جو مختلف امور کے بارے میں ان کے ذاتی تاثرات پیش کرتے ہیں اس کتاب کا عنوان "Stray Reflection" ہے اور ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے اسے مرتب کر کے ۱۹۶۱ء میں لاہور سے شائع کروایا ہے۔

۴۔ اقبال کی تیسری انگریزی تصنیف ان کے مشہور لیکچرز ہیں جن کا عنوان "Reconstruction of Religions Thought in Islam" یہ لیکچر اقبال نے مدراس، میسور، حیدرآباد دکن اور علی گڑھ میں دیئے تھے۔ چھ خطبات ۱۹۳۰ء میں لاہور سے شائع ہوئے اور آخری ساتواں خطبہ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں لندن میں دیا تھا اور موجودہ سات لیکچروں کی صورت میں یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں انگلستان سے شائع ہوئی تھی۔ اقبال کے ان خطبات کا موضوع وحی الٰہی کی اہمیت، خودی، نماز و عبادت، اسلامی ثقافت، اجتہاد اور مذہب کی ابدی اہمیت وغیرہ ہیں اور ان سات لیکچروں کی وجہ سے اقبال کو فلسفی کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کا ترجمہ سید نذیر نیازی نے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے عنوان سے کیا جو لاہور سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔

۷.۱۔ فارسی تصانیف

اقبال کی تیرہ منظوم کتابیں مندرجہ ذیل صورت میں موجود ہیں۔

۱۔ مثنوی اسرار خودی جو ۱۹۱۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔

۲۔ مثنوی رموز بے خودی جس کی پہلی اشاعت ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں یہ دونوں مثنویاں اسرار و رموز کے نام سے ایک ساتھ شائع ہوتی رہی ہیں۔

۳۔ پیام مشرق جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی اور جس میں گوئٹے کے دیوان شرقی و غربی کا جواب دیا گیا ہے۔

۴۔ زبور عجم جو حقیقت میں تین کتابوں پر مشتمل ہے۔

(الف) ''زبور عجم'' کے پہلے حصے کا خطاب خدا سے ہے اور دوسرے کا انسان سے ہے۔

(ب) ''گلشن راز جدید'' جو آٹھویں صدی ہجری میں لکھی جانے والی ایک فارسی مثنوی گلشن راز کا جواب ہے اس صوفیانہ مثنوی کے مصنف شیخ محمود شبستری تھے۔ اقبال نے اصل کتاب کے سترہ سوالوں میں سے گیارہ کا انتخاب کیا اور دو دو سوالوں کو ایک ایک جواب میں سمویا اور اس طرح کل نو عنوانات کا اپنے فلسفہ خودی کی روشنی میں جواب دیا ہے۔

(ج) ''زبور عجم'' میں شامل تیسری کتاب مثنوی ''بندگی نامہ'' ہے جس میں غلام قوموں کے فنون لطیفہ کی خرابیاں بیان کی گئی ہیں۔ زبور عجم پہلی بار ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

۵۔ جاوید نامہ: جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ شاعر مشرق کا شاہکار ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے مولانا رومؒ کی رہنمائی میں سات افلاک کی سیر کی اور کئی حقائق بیان کئے۔

۶۔ ''مثنوی مسافر'': یہ اقبال کی سفر افغانستان کی سرگزشت ہے۔ اقبال اکتوبر اور نومبر ۱۹۳۳ء کے کوئی دو ہفتے افغانستان میں رہے تھے۔ ''مسافر'' ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

۷۔ ''مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' یہ مثنوی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی اور مثنوی ''مسافر'' کو بھی اس کے ساتھ ضمیمے کے طور پر شائع کر دیا گیا اس کے بعد یہ دونوں مثنویاں ایک ساتھ شائع ہوتی رہیں۔

۸۔ ''ارمغان حجاز'' اس کتاب کی اشاعت نومبر ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبالؒ کی وفات کے کوئی چھ ماہ بعد عمل میں آئی اردو حصے کا تعارف ہو چکا، فارسی حصہ کتاب کے تقریباً دو تہائی ہے اور اس میں دو بیتیاں شامل ہیں ان دو بیتیوں میں اقبال نے اللہ تعالیٰ، حضرت رسالت مآبؐ، ملت اسلامیہ عالم انسانی نیز اپنے دوستوں سے خطاب کیا ہے اور حقائق اور معارف کے دریا بہا دیئے ہیں۔

۷.۲۔ خطوط کے مجموعے

اقبال کے کوئی ۱۳۰۰، انگریزی اور اردو خطوط ذیل کے مجموعوں میں شائع ہو گئے ہیں۔

۱۔ اقبال (انگریزی، از عطیہ بیگم) بمبئی ۱۹۴۷ء، اس کے اردو تراجم پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔

۲۔ "Letters of Iqbal" مرتب بشیر احمد ڈار لاہور ۱۹۷۸ء (اس مجموعے میں قائد اعظم کے نام مکتوبات اقبال بھی شامل ہیں)۔

۳۔ اقبال نامہ مرتب شیخ عطاء اللہ لاہور جلد اول ۱۹۴۵ء اور جلد دوم ۱۹۵۱ء۔

۴۔ مکتوبات اقبال بنام خان نیاز الدین لاہور ۱۹۵۴ء۔

۵۔ مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی کراچی ۱۹۵۷ء۔

۶۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی کراچی ۱۹۶۹ء۔

۷۔ خطوط اقبال (متفرق) مرتبہ رفیع الدین ہاشمی لاہور ۱۹۷۶ء۔

(شاد اقبال) کے نام سے ایک مجموعہ ۱۹۴۳ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ یہ اقبال کے کشن پرشاد کے نام خطوط ہیں۔

۳.۷۔تقاریر، بیانات، مقالات اور ملفوظات

لطیف احمد شروانی کا مرتبہ اقبال کے مضامین اور بیانات کا مجموعہ موجود ہے۔سید عبدالواحد معینی نے اردو انگریزی میں اقبال کے دو جدا جدا مجموعے شائع کروائے ہیں۔مقالات اقبال "Thoughts and Reflections of Iqbal" محمود نظامی نے ملفوظات اقبال، مرتب کئے ہیں اور سید نذیر نیازی نے ''اقبال کے حضور'' میں اقبال کی بعض گفتگوئیں قلم بند کی ہیں ''گفتار اقبال'' مرتبہ ڈاکٹر محمد رفیق افضل (لاہور ۱۹۶۹ء) اقبال کے بعض اخباری بیانات پر مشتمل ہے۔اقبال کے متروکہ اردو اور فارسی کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں ''باقیات اقبال'' مرتبہ سید عبدالواحد معینی اور محمد عبداللہ قریشی جامع تر ہے۔

۴.۷۔ خود آزمائی نمبر ۴

(۱) ان سوالوں کے جوابات لکھیے:

۱۔ علامہ اقبال کا آخری شعری مجموعہ کون سا ہے؟

۲۔ ارمغان حجاز کے پہلے حصے کی رباعیات فارسی زبان میں ہیں یا اردو زبان میں؟

۳۔ اقبال کی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کے کس پہلو کو پیش کیا گیا ہے؟

۴۔ سر راس مسعود کا اقبال سے کیا رشتہ ہے؟

۵۔ ارمغان حجاز میں ''ملازادہ ضیغم لولابی کی بیاض'' کتنے ٹکڑوں پر مشتمل ہے؟

۲۔ صرف صحیح جملوں پر یہ ☑ کا نشان لگائیے:

۱۔ ''ارمغان حجاز'' علامہ اقبال کی وفات کے تقریباً چھ مہینے بعد شائع ہوئی۔

۲۔ ''ارمغان حجاز'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ اقبال کے دل میں کشمیر اور کشمیریوں کے مسائل سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔

۴۔ ملازادہ ضیغم، محراب گل کی طرح ایک فرضی نام نہیں ہے۔

۵۔ ''ارمغان حجاز'' حصہ اردو میں رباعیات شامل نہیں ہیں۔

۳۔ دیئے ہوئے الفاظ میں سے صحیح لفظ منتخب کر کے خالی جگہ پر کیجئے:

۱۔ علامہ اقبال کی تحقیقی کتاب جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی .... سے متعلق ہے۔

(فلسفہ عرب، فلسفہ یورپ، فلسفہ ایران)

۲۔ اقبال کی پہلی نثری تصنیف .... تھی۔ (الکلام، بال جبریل، علم الاقتصاد)

۳۔ اقبال کی .... منظوم فارسی کتابیں ہیں۔ (پندرہ، بارہ، تیرہ)

۴۔ ''زبورِعجم'' حقیقت میں .... کتابوں پر مشتمل ہے۔ (دو، چھ، تین)

۵۔ ''مثنوی اسرارِخودی'' پہلی مرتبہ .... میں شائع ہوئی۔ (۱۹۱۶ء، ۱۹۱۵ء، ۱۹۲۱ء)

۸۔جوابات

خودآزمائی نمبرا

(ا) ا۔شیخ عبدالقادر نے

۲۔تین حصوں میں

۳۔الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد

۴۔ہندو مسلم اتحاد میں

۵۔حضرت نظام الدین اولیاء

۶۔یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

۷۔شیخ عبدالقادر اور سر ٹامس آرنلڈ

۸۔مغربی نیشنلزم

۹۔شکوہ

۱۰۔آٹھ

۲۔ صحیح جملے ا، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶

خودآزمائی نمبر۲

(ا) ا۔غزل کا مزاج اور اسلوب

۲۔خودی، بے خودی، عشق، عقل، موت وغیرہ

۳۔تغزل

۴۔تصور خودی

۵۔انسانی عظمت

۶۔عشق کو

۷۔مسجد قرطبہ

۸۔ساقی نامہ

۹۔لینن (خدا کے حضور میں)

۱۰۔مولانا رومی

(۲) صحیح جملے ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۸

خود آزمائی نمبر ۳

(۱) ۱۔۱۹۳۶ء میں

۲۔اختصار اور جامعیت

۳۔شاعری

۴۔حالت زار، گراں خوابی

۵۔غیر اسلامی پہلوؤں سے

۶۔تعلیم و تربیت

۷۔تقلید اور خوئے غلامی

۸۔عورت

۹۔سیاسیات اور مشرق و مغرب

۱۰۔محض فرضی نام ہے

(۲) صحیح جملے ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸

خودآزمائی نمبر۴

(۱) ا۔ارمغان حجاز

۲۔فارسی زبان میں

۳۔شرانگیز پہلو

۴۔دوست تھے

۵۔انیس ٹکڑوں پر

(۲) صحیح جملے ۱، ۲، ۳

(۳) ا۔ فلسفہ ایران

۲۔ علم الاقتصاد

۳۔ تیرہ

۴۔ تین

۵۔ ۱۹۱۵ء

یونٹ ۴۔۵

خطوط اقبال

بنام

قائداعظم

تحریر:

محمد جہانگیر عالم

فہرست

صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوانات
152		مقاصد
153	ا۔	خطوط کا تعارف
154	۲۔	خطوط کی اہمیت
155	۳۔	خطوط اقبال بنام قائداعظم کے مباحث
158	۴۔	قائداعظم کا تحریر کردہ پیش لفظ
160	۵۔	خطوط کا متن (مع توضیحات)
205	۶۔	خود آزمائی
208	۷۔	جوابات

مقاصد

یہ یونٹ پڑھ لینے کے بعد آپ کو اس قابل ہونا چاہئے کہ آپ!

۱۔ مطالبۂ پاکستان کی وضاحت کر سکیں۔
۲۔ مطالبۂ پاکستان کے سیاسی پس منظر پر بحث کر سکیں۔
۳۔ مفکر پاکستان علامہ اقبال اور بانی پاکستان قائداعظم کے باہمی تعلقات کو واضح کر سکیں۔
۴۔ مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں علامہ اقبال کی خدمات بیان کر سکیں۔

۱۔ خطوط کا تعارف

علامہ اقبال کے خطوط قائداعظم محمد علی جناح کے نام پہلی بار انگریزی میں ۱۹۴۳ء میں ''قائداعظم'' کے پیش لفظ کے ساتھ لاہور سے شیخ محمد اشرف نے شائع کیے ان کا اردو ترجمہ پہلی دفعہ جناب عبدالرحمٰن سعید نے کیا اور ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن نے اسے شائع کیا۔ اس کے بعد یہ خطوط متعدد بار انگریزی اور اردو میں شائع ہوتے رہے۔

ان خطوط کی دریافت اور اشاعت کا سہرا جناب محمد شریف طوسی کے سر ہے جنہوں نے دسمبر ۱۹۴۲ء میں قائداعظم محمد علی جناح کے ذاتی کتب خانے سے ان خطوط کو تلاش کر کے ترتیب دیا۔ پھر انہیں ٹائپ کر کے قائداعظم محمد علی جناح کے سامنے پیش کیا اور ان سے درخواست کی کہ یہ خطوط تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی اشاعت کا بندوبست ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے پورے ملک میں اور خصوصاً پنجاب میں مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور تحریک پاکستان کو اک تازہ ولولہ ملے گا۔

کورس کی موجودہ اشاعت میں دو خطوط (نمبر ۵ اور ۱۱) پہلی بار شامل کیے جا رہے ہیں جو حال ہی میں ملے ہیں۔ آخری تین خطوط وہ ہیں جو علامہ اقبال کی طرف سے بیرسٹر غلام رسول خان نے قائداعظم کو لکھے تھے۔ اب کل خطوط اٹھارہ ہو گئے ہیں۔

۲۔ خطوط کی اہمیت

تحریک پاکستان کی دستاویزات میں قائداعظم محمد علی جناح کے نام علامہ اقبال کے خطوط کو بڑی اہمیت حاصل ہے یہ خطوط ایسے وقت لکھے گئے تھے جب ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ کے ایک نازک دور سے گزر رہے تھے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا مسئلہ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس فکری انتشار کے زمانے میں علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت نے منزل کی نشاندہی کی اور اس کے راستوں کو روشن کیا۔ یہ خطوط ایک طرح سے خطبہ الہ آباد ہی کی تفصیل ہیں۔ ان میں برصغیر کے دستوری مسائل مسلم لیگ کی تنظیم نو، مسلم ایشیا کے مستقبل، برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کے قیام اور اس میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تحریک پاکستان کے پس منظر اور پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان خطوط کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

یہ خطوط علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کے درمیان گہرے تعلقات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ ان خطوط میں علامہ اقبال مسلسل برصغیر کے مسلمانوں کو درپیش مسائل کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے حل کے لیے قائداعظم محمد علی جناح کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ ایک خط میں یہاں تک لکھتے ہیں کہ اس نازک دور میں مسلم قوم صرف اور صرف آپ ہی کی ذات گرامی (قائداعظم) سے محفوظ رہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے۔ بالفاظ دیگر علامہ اقبال قائداعظم محمد علی جناح کو برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان خطوط سے علامہ اقبال کے عملی سیاسی کردار سے بھی آگاہی ہوتی ہے جو انہوں نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں ادا کیا ہے۔

۳۔ خطوط اقبال بنام قائداعظم کے مباحث

(۱) قائداعظم کے نام علامہ اقبال کے خطوط برصغیر پاک و ہند کی اہم سیاسی دستاویزات کا حصہ ہیں ان خطوط میں مسلم لیگ کی تنظیم سے لے کر شمال مغربی ہندوستان میں ایک مسلم ریاست کے قیام کی ضرورت اور اہمیت تک جیسے اہم مسائل شامل ہیں۔

(۲) دونوں رہنماؤں کی خط و کتابت کا زمانہ مسلم لیگ کی تنظیم نو کا ابتدائی زمانہ تھا۔ علامہ اقبال نے اپنے خطوط میں مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات کا واضح اظہار کیا۔ قائداعظم ان خیالات سے متفق ہوئے وہی خیالات ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی بنیاد بنے۔

(۳) علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ایک جداگانہ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا۔ اس ریاست کے حصول کے لئے وہ صرف قائداعظم کو مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کا اہل سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ اتنے دیانت دار تھے کہ کوئی انہیں خرید نہیں سکتا تھا۔

(۴) علامہ اقبال کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے قائداعظم کو مسلمانوں کے لئے جداگانہ ریاست کے حصول پر آمادہ کیا۔

(۵) جداگانہ ریاست کے حصول کے لئے علامہ اقبال کے نزدیک ضروری تھا کہ مسلم لیگ عوام میں ہر دلعزیز ہو۔ اس وقت تک مسلم لیگ صرف بالائی طبقے کی جماعت تھی۔

(۶) علامہ اقبال کی تحریک پر قائداعظم نے ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کا آغاز کیا۔ مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں تیزی سے ہونے لگا۔

(۷) علامہ اقبال قائداعظم کے نام اپنے خطوط میں مسلم لیگ کی بڑھتی پھیلتی سرگرمیوں سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے رہے اور مسلم لیگ کو مضبوط تر اور مقبول تر بنانے کے لئے وقتاً" فوقتاً" مفید تجویزیں پیش کرتے رہے۔

(۸) ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس لکھنو میں منعقد ہوا اس میں قائداعظم ہندوستانی مسلمانوں کے واحد نمائندہ لیڈر تسلیم کر لئے گئے۔

(۹) ۱۹۳۷ء کا ایک اہم واقعہ آل انڈیا نیشنل کنونشن میں پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر تھی۔ علامہ اقبال نے قائداعظم کے نام ایک طویل خط لکھ کر اس تقریر کے ان مضمرات کی طرف قائداعظم کو توجہ دلائی جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تھے نہرو نے اس پر زور دیا تھا کہ پورے ہندوستان کا سب سے بڑا اہم مسئلہ صرف اقتصادی مسئلہ ہے۔ علامہ اقبال نے اس پر اصرار کیا کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے ثقافتی مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے۔

(۱۰) ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال نے ایک خط میں قائداعظم کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ آل انڈیا کانگریس مسلمانوں کے جداگانہ وجود کو ختم کرنے کے لئے کیا کچھ کر رہی ہے اور اس کا توڑ کس طرح ممکن ہے۔

(۱۱) علامہ اقبال نے قائداعظم کے نام اپنے خطوط میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ مسلمانوں کے اپنے سیاسی اور اقتصادی مسائل حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی اپنی جداگانہ ریاست ہو اور اس میں نظام شریعت کا نفاذ عمل میں لایا جائے اس سے مسلمانوں کی غربت (روٹی کا مسئلہ) اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ امن وامان دونوں مسائل حل ہو جائیں گے۔

(۱۲) علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ ریاست پر اس لئے زور دیا کہ مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کا سلسلہ ختم ہو سکے اور ان کے مسائل کا حل غیر مسلموں کے رحم وکرم پر منحصر نہ ہو جیسا کہ قانون ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے ہو رہا تھا۔

(۱۳) برطانوی حکومت نے جس کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا اسے علامہ اقبال نے اس لحاظ سے پسند کیا کہ اس میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی وجود کو تسلیم کیا گیا تھا۔

(۱۴) جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد سے دنیائے اسلام جن مسائل سے دوچار رہی ہے ان میں فلسطین کا مسئلہ سب سے اہم ہے جس کی اہمیت پر علامہ اقبال نے خصوصی زور دیا اور قائداعظم کی توجہ دلائی۔

(۱۵) علامہ اقبال کے خطوط کا ایک نہایت اہم موضوع "جناح سکندر معاہدہ" ہے جو پنجاب کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اس سلسلے میں قائداعظم علامہ اقبال کے خیالات سے اتفاق نہ کر سکے۔

(۱۶) ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء اور ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے جو خطوط قائداعظم کے نام لکھے ان میں تصور پاکستان کی جھلک واضح ہے اس سے پہلے ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال خطبہ الہ آباد میں پاکستان کا تصور پیش کر چکے تھے۔ بعد میں وہ قائداعظم کو رفتہ رفتہ اپنی خواہش مطالبہ پاکستان کی طرف لاتے گئے۔ چونکہ قائداعظم اس معاملے میں ان کے ہم خیال تھے اس لئے دونوں کے متفقہ خیالات نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی شکل اختیار کی۔

۴۔ قائداعظم کا تحریر کردہ پیش لفظ

یہ کتابچہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو اسلام کے قومی شاعر فلسفی اور عارف ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے میرے نام مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء (ا) کے درمیانی عرصے میں اپنی وفات سے کچھ ماہ پہلے تحریر کئے۔ یہ دور جو جون ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے قیام اور اکتوبر ۱۹۳۷ء لکھنو کے تاریخی اجلاس کے دوران تک محیط ہے، مسلم ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اگر مرکزی پارلیمانی بورڈ نے اپنی صوبائی شاخوں کے ہمراہ مسلم لیگ کی طرف سے یہ پہلی عظیم کوشش کی کہ مسلم رائے عامہ قانون ہند ۱۹۳۵ء کے تحت صوبائی مجلس قانون ساز کے لئے لیگ کے ٹکٹ پر آئندہ انتخاب میں حصہ لیا جائے تو لکھنو اجلاس اس امر کی نشان دہی کا باعث بنا کہ پہلے مرحلے میں مسلم لیگ کی عوامی سطح پر تنظیم نو ہونی چاہئے اور یہ کہ مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور بااختیار جماعت ہے۔ ان دونوں مقاصد کے حصول میں اپنے دوستوں (جن میں ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی شامل ہیں) کے انمول تعاون، حب الوطنی اور بے غرض مساعی کی بدولت کامیاب ہو سکا اس مختصر عرصے میں مسلم لیگ کافی قوت پکڑ گئی۔ ہر صوبے میں جہاں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ قائم ہوا اور مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہوئیں ہم نے ساٹھ سے ستر فیصد نشستیں حاصل کیں جن پر مسلم لیگی امیدواروں نے انتخاب لڑا تھا۔ تقریباً ہر صوبے میں، مدراس کے دور دراز کونے سے لے کر شمالی مغربی سرحدی صوبے تک مسلم لیگ کی سینکڑوں ضلعی اور ابتدائی شاخیں قائم ہو گئیں۔

کانگرس نے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے اور مسلم لیگ کو مرعوب کرنے کے لئے جو نام نہاد مسلم رابطہ عوام تحریک چلائی تھی مسلم لیگ نے اس پر کاری ضرب لگائی۔ مسلم لیگ متعدد ضمنی انتخابات میں کامیاب ہوئی اور ان لوگوں کی فتنہ پردازیوں اور سازشوں کو ختم کر دیا جو یہ تاثر دینے کی توقع رکھتے تھے کہ مسلم لیگ کو مسلمان عوام کی حمایت حاصل نہیں۔

(ا) بعد میں دستیاب ہونے والے خطوط میں اقبال کا سات مارچ ۱۹۳۸ء کا خط بھی شامل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خط و کتابت مئی ۱۹۳۶ء، مارچ ۱۹۳۸ء تک جاری رہی۔

لکھنو اجلاس سے اٹھارہ ماہ پہلے مسلم لیگ ایک اعلیٰ اور ترقی پذیر پروگرام کی حامل جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کو منظم کرنے میں کامیاب ہوئی اور وہ صوبے بھی اس کے زیر اثر آ گئے جن تک وقت کی قلت یا لیگ پارلیمانی بورڈوں کی ناکام سرگرمیوں کے باعث بہتر طور پر رسائی نہ ہو سکی تھی۔ لکھنو اجلاس نے اس مقبولیت کی صریحاً شہادت فراہم کر دی جو مسلم لیگ کو مسلمانوں کی تمام جماعتوں اور گروہوں میں حاصل تھی۔

یہ مسلم لیگ کی نہایت شاندار کامیابی تھی کہ اس کی قیادت کو مسلم اکثریت اور اقلیتی صوبوں نے قبول کر لیا اور اسے اس کامیابی تک پہنچانے میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے بڑا کردار ادا کیا۔ گو عوام کو اس وقت اس کا علم نہ ہو سکا۔ " سکندر جناح" معاہدہ کے بارے میں ان کے کچھ اپنے خدشات تھے وہ اس پر عملدر آمد اور اس کے نمایاں نتائج کو جلد از جلد دیکھنا چاہتے تھے تاکہ اس کے متعلق عوام کے شکوک و شبہات دور ہو سکیں۔ لیکن افسوس وہ یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے کہ پنجاب نے قابل ذکر ترقی کر لی ہے اور اب اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان ثابت قدمی سے مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔

اس مختصر تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ان خطوط کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ تاہم مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ اقبال کے خطوط کے جواب میں میرے خطوط دستیاب نہ ہو سکے مذکورہ عرصے کے دوران میں تن تنہا بغیر کسی ذاتی عملے کی مدد کے کام کرتا تھا اس لئے میں ان متعدد خطوط کی نقول اپنے پاس نہ رکھ سکا جو میں دوسروں کو ارسال کرتا تھا میں نے لاہور میں اقبال کے ترکے کے نگرانوں سے دریافت کرایا تو مجھے اطلاع ملی کہ میرے خطوط دستیاب نہیں ہو سکے، چنانچہ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں ان خطوط کو اپنے جوابات کے بغیر ہی شائع کراؤں کیونکہ میرے نزدیک یہ خطوط زبردست تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، بالخصوص وہ خطوط جن میں مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے بارے میں ان مشکلات کا واضح اور غیر مبہم اظہار ہے۔ ان کے خیالات پورے طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور بالاخر میں ہندوستان کے دستوری مسائل کے مطالعے اور تجربے کے بعد انہی نتائج پر پہنچا اور کچھ عرصہ بعد یہی خیالات ہندوستان کے مسلمانوں کی اس متحدہ خواہش کی صورت میں جلوہ گر ہوئے جس کا اظہار آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی منظور کردہ ''قرارداد لاہور'' ہے جو عام طور پر ''قرارداد پاکستان'' کے نام سے موسوم ہوئی۔

ایم۔اے۔جناح

(قائداعظم محمد علی جناح)

۵۔خطوط کا متن (مع توضیحات)

خط نمبرا

لاہور

۲۳ مئی ۱۹۳۶ء

محترم جناح صاحب

ابھی ابھی آپ کا خط موصول ہوا جس کے لئے بے حد شکر گزار ہوں۔ مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ کا کام آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ پنجاب کی جماعتیں بالخصوص احرار [۱] اور اتحاد ملت [۲] تھوڑی بہت نزاع وکشمکش کے بعد آخر کار آپ کے ساتھ شریک ہو جائیں گی۔ اتحاد ملت کے ایک سرگرم اور فعال رکن نے چند روز ہوئے مجھے یہی بتایا ہے۔ اگرچہ مولانا ظفر علیخان [۳] کے رویے کے بارے میں خود اتحاد ملت والے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تاہم ابھی کافی وقت ہے۔ ہمیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ رائے دہندگان اسمبلی میں اپنی نمائندگی اتحاد ملت والوں کے سپرد کرنے کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں۔

امید ہے کہ آپ بخریت ہوں گے۔ ملاقات کا آرزومند۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

الفاظ	معانی
نزاع	تکرار، جھگڑا
رکن	کام کرنے والا (ساتھی)

اہم نکات

ا۔ پنجاب مسلم لیگ کی تنظیم کا کام کامیابی سے ہو رہا ہے۔

۲۔ دوسری مسلم جماعتوں سے توقع ہے کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کریں گی۔

(۱) مجلس احرار اسلام: پنجاب کی ایک سیاسی اور مذہبی جماعت جس کی داغ بیل پنجاب خلافت کمیٹی کے اراکین نے ۱۹۲۹ء میں ڈالی۔ اس جماعت کی باقاعدہ تشکیل جولائی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں ہوئی۔ مجلس احرار اسلام کے بانی اراکین میں مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری، چوہدری فضل حق، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور مولانا مظہر علی اظہر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تحریک آزادی میں مجلس احرار نے کانگرس کا ساتھ دیا اور حصول پاکستان میں مسلم لیگ کی مخالفت کی۔ انگریز دشمنی اور رد قادیانیت (تحریک ختم نبوت) کے سلسلے میں مجلس احرار کی خدمات نمایاں ہیں۔

(۲) مجلس اتحاد ملت: یہ بھی پنجاب کی ایک سیاسی اور مذہبی جماعت تھی جو نیلی پوش کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی ۱۹۳۶ء میں اس کا قیام عمل میں آیا اور مولانا ظفر علی خان اس کے صدر منتخب ہوئے۔ یہ جماعت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

(۳) مولانا ظفر علی خان: (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء) تحریک آزادی کے ایک جانباز سپاہی اور ہمہ صفت شخصیت تھے۔ ظفر علی خان ایک اچھے شاعر، بلند پایہ ادیب اور مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شعلہ نوا خطیب بھی تھے لیکن ایک بے باک صحافی کی حیثیت سے وہ زیادہ مشہور ہیں انہوں نے اپنے اخبار ''زمیندار'' کے ذریعے مسلمانان ہند میں سیاسی بیداری پیدا کی اور جدوجہد آزادی میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ بقول حضرت علامہ اقبال ''مصطفےٰ کمال'' کی تلوار نے ترکوں کو جگانے کے لئے جو کام کیا ظفر علی خان کے قلم نے وہی کام ہندوستان کے مسلمانوں کو جھنجھوڑنے کے لئے کیا ہے۔

مولانا ظفر علی خان نے خود کہا ہے۔

قلم سے کام تیغ کا اگر کبھی لیا نہ ہو
تو مجھ سے سیکھ لے یہ فن اور اس میں بے مثال بن

خط نمبر ۱۰

لاہور

۹ جون ۱۹۳۶ء

محترم جناح صاحب

میں اپنا مسودہ ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ کل کے ''ایسٹرن ٹائمز''(۱) کا ایک تراشہ بھی ہمراہ ہے۔ گورداس پور کے ایک قابل وکیل کا خط ہے۔

مجھے امید ہے کہ بورڈ(۲) کی طرف سے جاری شدہ بیان میں تمام سکیم کی پوری تفصیل ہوگی اور سکیم پر اب تک کے کئے گئے اعتراضات کا شافی جواب بھی ہوگا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ حیثیت کا ہندوؤں اور حکومت دونوں سے متعلق اس میں برملا اور واضح ذکر ہونا چاہئے اس بیان میں یہ انتباہ بھی ہو کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے موجودہ سکیم(۳) کو اختیار نہ کیا تو نہ صرف یہ کہ جو کچھ گزشتہ پندرہ برسوں میں انہوں نے حاصل کیا ہے ضائع کر بیٹھیں گے بلکہ خود اپنے ہاتھوں قومی شیرازے کو پارہ پارہ کر کے اپنے نقصان کا باعث بنیں گے۔

آپ کا

محمد اقبال

مکرر آنکہ: میں نہایت ممنون ہوں گا اگر اخبارات کو روانہ کرنے سے قبل آپ یہ بیان مجھے بھی ارسال کر دیں۔ دوسری بات جس کا ذکر اس بیان میں ہونا چاہئے یہ ہے۔

۱۔ مرکزی اسمبلی کے لئے بالواسطہ طریق انتخاب نے یہ قطعی طور پر ضروری کر دیا ہے کہ جو اراکین صوبائی اسمبلیوں کے لئے منتخب کئے جائیں وہ ایک کل ہند مسلم پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں تاکہ وہ مرکزی اسمبلی میں ایسے مسلمان نمائندے منتخب کریں جو اس بات کا عہد کریں کہ مرکزی اسمبلی میں مسلم ہندوستان کے ان مخصوص مرکزی مسائل کی تائید و حمایت کریں گے جو ہندوستان کی دوسری بڑی قوم کی حیثیت سے

مسلمانوں سے متعلق ہوں جو لوگ اس وقت صوبائی پالیسی اور پروگرام کے حامی ہیں وہی لوگ مرکزی اسمبلی کے لئے بالواسطہ طریق انتخاب کو دستور میں شامل کروانے کے ذمہ دار ہیں بلاشبہ ایک غیر ملکی حکومت کا مفاد اسی میں ہے اب جب کہ قوم اس مصیبت (بالواسطہ انتخاب) سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی ہے اور اس نے انتخاب کے لئے ایک کل ہند سکیم (یعنی مسلم لیگ کی سکیم) تیار کر لی ہے جس کی پابندی تمام صوبائی امیدوار کریں گے تو وہی لوگ پھر غیر ملکی حکومت کے اشارے پر معروف عمل ہیں کہ قوم کو اپنی شیرازہ بندی کی کوشش میں ناکام کریں۔

۲۔ اسلامی اوقاف کا قانون جیسا کہ شہید گنج (۴) سے ظاہر ہوا اور اسلامی ثقافت زبان، مساجد اور قانون شریعت سے متعلق مسائل پر بھی بیان میں توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

الفاظ	معانی
شافی	صاف، قطعی
انتباہ	خبردار کرنا
سکیم	تنظیم اتحاد

اہم نکات

مسلم لیگ کے منشور کے متعلق علامہ اقبال نے مشورہ دیا کہ :

۱۔ اس میں مسلمانوں کی موجودہ حیثیت کا برملا اظہار ہو۔

۲۔ مسلم نمائندوں کے لئے ضروری ہو کہ وہ کل ہند مسلم پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں۔

۳۔ اسلامی اوقاف اور ثقافت سے متعلق مسائل پر توجہ ہو

---

(۱) ایسٹرن ٹائمز: انگریزی اخبار جو لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کو یونینسٹ پارٹی کی مالی امداد حاصل تھی اور یہ اس پارٹی کے پروپیگنڈے کے لئے وقف تھا۔

(۲) بورڈ: آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی پارلیمانی بورڈ جس کے اراکین کے ناموں کا اعلان قائداعظم محمد علی جناح نے ۲۱ مئی ۱۹۳۶ء کو کیا۔ بورڈ کے اراکین کی تعداد ۵۴ تھی۔ (ان میں پنجاب سے علامہ اقبال کا نام سرفہرست تھا)۔

(۳) سکیم: اس خط میں سکیم اور بیان کا لفظ بار بار آیا ہے اس سے مراد آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کا مینی فیسٹو (منشور) ہے جو آئندہ مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا سنگ بنیاد بننے والا ہے۔

(۴) شہید گنج: لاہور ریلوے سٹیشن سے دہلی دروازے کی طرف جاتے ہوئے پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے نزدیک ایک بہت قدیم مسجد ہے جو شاہجہان کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی مسجد کے قریب ہی سکھوں کی ایک یادگار سمادھی بھی تھی یہ جگہ شہید گنج کے نام سے موسوم ہے۔ اپنے دور حکومت میں سکھوں نے مسجد پر قبضہ کر لیا برطانوی دور حکومت میں مسلمانوں کی طرف سے مسجد کو واگزار کرانے کے لئے کوششیں کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکیں۔

جون ۱۹۳۵ میں مسجد شہید گنج کے معاملہ میں مسلمانوں اور سکھوں میں سخت کشیدگی پیدا ہو گئی حکومت نے حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے مسجد کے چاروں طرف مسلح فوج اور پولیس کے سپاہی متعین کر دیئے اس کے باوجود سکھوں نے ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی رات کو یکا یک مسجد کو گرانا شروع کر دیا جب مسلمانوں کو معلوم ہوا تو وہ مسجد کی حفاظت کے لئے دوڑے لیکن دوسری طرف فوج نے بار بار گولی چلائی اور کئی مسلمان شہید ہو گئے اس طرح ایک تحریک شروع ہو گئی مسلمانوں نے شاہی مسجد کو اپنا صدر مقام بنا کر سول نافرمانی شروع کر دی حکومت نے مسلمان رہنماؤں کو گرفتار کر لیا لیکن تحریک جاری رہی۔ فروری ۱۹۳۶ء کو قائداعظم محمد علی جناح مسجد شہید گنج کے تنازعہ کے حل کے سلسلہ میں لاہور آئے۔ آپ نے گورنر سے ملاقات کر کے سیاسی قیدیوں کی رہائی کا بندوبست کیا اور سکھ رہنماؤں سے ملاقات کر کے انہیں باہمی سمجھوتے کے لئے آمادہ کیا۔

مسجد کو واگزار کرانے کے لئے شہید گنج لیگل ڈیفنس کمیٹی بنائی گئی جس نے ڈسٹرکٹ کورٹ میں دعوی دائر کیا کہ مسجد ہر حالت میں مسجد ہے اور مسلمانوں کو یہاں نماز پڑھنے کی اجازت ہونی چاہیے ڈسٹرکٹ کورٹ نے یہ مقدمہ خارج کر دیا پھر اس کی اپیل ہائی کورٹ میں کی گئی ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو ہائی کورٹ نے بھی اپیل خارج کر دی۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنو میں مسجد شہید گنج کا مسئلہ زیر غور آیا اور اس کے متعلق ایک قرارداد منظور کی گئی اس کے علاوہ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو مسلم لیگ کا ایک اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس میں اعلان کیا گیا کہ مسجد شہید گنج کی بازیابی کا مطالبہ ہندوستان کے مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ ہوا کہ یکم فروری کو پورے ہندوستان میں یوم شہید گنج منایا جائے۔

خط نمبر ۳

لاہور (بصیغہ راز)

---

۲۵ جون ۱۹۳۶ء

محترم جناح صاحب

سر سکندر حیات (۱) دو ایک روز ہوئے لاہور سے روانہ ہو چکے ہیں۔ میرے خیال میں وہ بمبئی میں آپ سے مل کر بعض اہم امور پر گفتگو کریں گے کل شام دولتانہ (۲) مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ ان سے کہنا تھا کہ یونینسٹ پارٹی (۳) کے مسلمان اراکین مندرجہ ذیل اعلان کرنے کے لئے تیار ہیں کہ ان تمام امور میں جو مسلمانوں سے بحیثیت ایک کل ہند اقلیت سے متعلق ہیں وہ مسلم لیگ کے فیصلے کے پابند ہوں گے اور صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم جماعت کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کریں گے، بشرطیکہ (صوبائی) مسلم لیگ بھی حسب ذیل اعلان کرے کہ وہ اراکین اسمبلی جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر صوبائی اسمبلی میں آئیں۔ وہ صرف اس جماعت یا فریق کے ساتھ تعاون کریں گے جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

لازراہ کرم اپنی اولین فرصت میں مطلع فرمایئے کہ اس تجویز کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے سر سکندر حیات سے جو گفتگو ہو اس کے نتیجہ سے بھی مطلع فرمایئے۔ اگر آپ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کا ہمارے ساتھ شامل ہو جانا کچھ بعید نہیں۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے

آپ کا مخلص

محمد اقبال

اہم نکات

مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان باہمی تعاون واشتراک کی تجویز

(ا) سر سکندر حیات خان: (۱۸۹۲ء،۱۹۴۲ء) قیام پاکستان سے پہلے پنجاب کے ارباب سیاست میں سے ایک اہم شخصیت تھے۔ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۲۴ء میں ہوا۔جب وہ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔۱۹۲۹ء میں حکومت پنجاب کے ریونیو ممبر بنے پھر ریزرو بنک کے گورنر مقرر ہوئے ۱۹۳۶ء میں سر فضل حسین کی وفات کے بعد یونینسٹ پارٹی کے لیڈر چنے گئے قانون ہند ۱۹۳۵ء کے تحت ۱۹۳۷ء میں پنجاب کے وزیر اعظم منتخب ہوئے اسی سال مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لکھنو میں شریک ہوئے اور قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ معاہدہ کیا کمیونسٹ پارٹی کے مسلمان اراکین مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔"جناح سکندر معاہدہ" کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) میاں احمد یار خان دولتانہ: (۱۸۹۶ء۔۱۹۴۲ء) پنجاب کی ایک اہم شخصیت اور یونینسٹ پارٹی کے روح رواں تھے اور اس کے دور جدید میں سیکرٹری منتخب ہوئے اپریل ۱۹۳۷ء میں پنجاب اسمبلی کے چیف پارلیمانی سیکرٹری مقرر ہوئے۔حضرت علامہ اقبال کے بڑے عقیدت مند تھے۔ شعروشاعری سے بھی شغف رکھتے تھے آپ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ اور پاکستان کے برطانیہ میں سابق سفیر میاں ممتاز احمد خان دولتانہ کے والد بزرگوار تھے۔

(۳) پنجاب یونینسٹ پارٹی: قیام پاکستان سے قبل پنجاب کی سب سے بڑی سیاسی جماعت جس کی داغ بیل سر فضل حسین (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۶ء) نے ۱۹۲۴ء میں رکھی تھی۔اس پارٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ پنجاب کی حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد و اشتراک سے چلائی جائے تاکہ اصلاحات کے تسلسل کو برقرار رکھا جاسکے۔صوبائی اسمبلی میں یونینسٹ پارٹی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں اور سر سکندر حیات کی سر کردگی میں وزارت تشکیل دی۔

ان ہی خطوط پر بعد میں یعنی ۱۹۳۷ء میں یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان ''جناح سکندر معاہدہ'' ہوا۔

خط نمبر ۴

میو روڈ لاہور

۲۳ اگست ۱۹۳۶ء

محترم جناح صاحب

امید ہے کہ میرا اس سے پہلے کا خط آپ کو مل چکا ہوگا۔ پنجاب پارلیمانی بورڈ اور یونینسٹ پارٹی کے مابین مفاہمت کی کچھ گفتگو ہو رہی ہے۔ اس قسم کی مفاہمت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے اور اس کے لئے آپ کیا شرائط تجویز کرتے ہیں؟ میں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ آپ نے بنگال پر جا پارٹی (۱) اور پارلیمانی بورڈ میں مصالحت کرا دی ہے۔ اس کی شرائط وضوابط سے مجھے مطلع فرمایئے چونکہ پر جا پارٹی بھی یونینسٹ پارٹی کی طرح غیر فرقہ وارانہ ہے۔ اس لئے بنگال میں آپ کی مصالحت آپ کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

اہم نکات

علامہ اقبال نے مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان تعاون اور اشتراک کے سلسلے میں قائداعظم سے شرائط کے بارے میں دریافت کیا۔

---

(۱) کرشک پر جا پارٹی: بنگال کی ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت تھی۔ ۱۹۲۴ء میں ڈھاکہ میں اس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ابوالقاسم فضل الحق (۱۸۱۰ء۔۱۹۶۲ء) اس جماعت کے سربراہ تھے۔ اس پارٹی کا مقصد بنگال کے کسانوں کی حالت کو بہتر بنانا تھا۔

خط نمبر ۵

لاہور

۸ دسمبر ۱۹۳۶ء

محترم جناح صاحب

غلام رسول نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے آپ کو بورڈ کے امور کے بارے میں ایک تفصیلی خط لکھا ہے۔ میں ان کے اس بیان سے بالکل متفق ہوں کہ انتخاب سے کم از کم پندرہ روز پہلے آپ کی اس صوبے میں موجودگی نہایت ضروری ہے آپ اس صوبے کے لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ عام طور پر جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ اگر آپ مولانا شوکت علی اور محمد کفایت اللہ کو انتخابات کے دنوں میں خطاب کریں تو مجھے یقین ہے کہ وہ سب آپ کی اور آپ کے امیدواروں کی حمایت کریں گے، وگرنہ وہ کچھ اور کر بیٹھیں گے، اس کے لئے میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ دسمبر ۱۹۳۶ء کے آخر یا جنوری ۱۹۳۷ء کے آغاز میں ہمارے ہاں تشریف لائیں تاکہ (ہماری تحریک کے خلاف پیدا کیئے جانے والے)[1] ردعمل کی قوتوں کو توڑنے کی کوشش کی جائے۔ اگر آپ تشریف نہ لاسکے تو مجھے خدشہ ہے کہ آپ آنے والی اسمبلی میں چار سے زائد حامیوں کو نہ پاسکیں گے احترامات کے ساتھ۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال (بار ایٹ لا)

صدر پنجاب صوبائی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ

(۱) آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاسی تحریک

خط نمبر ۶ (بصیغہ راز)

لاہور

۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

میرا خیال ہے کہ آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو[۱] کا وہ خطبہ[۲] جو انہوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن[۳] میں دیا ہے پڑھا ہوگا اور اس کے بین السطور جو پالیسی کارفرما ہے اس کو آپ نے بخوبی محسوس کر لیا ہوگا جہاں تک اس کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں سے ہے میں سمجھتا ہوں آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ نئے دستور[۴] نے ہندوستان کو کم از کم اس بات کا ایک نادر موقع دیا ہے کہ وہ ہندوستان اور مسلم ایشیا کی آئندہ سیاسی ترقی کے پیش نظر اپنی قومی تنظیم کر سکیں۔ اگرچہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہیں تاہم ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت حد تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر ہے۔ اس لئے میری تجویز ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک موثر جواب دیا جائے آپ جلد از جلد دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن[۵] منعقد کریں جس میں شرکت کے لئے نئی صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے علاوہ دوسرے مقتدر مسلم رہنماؤں کو بھی مدعو کریں۔ اس کنونشن میں پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ سیاسی مطمع نظر کی حیثیت سے مسلمانان ہند ملک میں جداگانہ سیاسی وجود رکھتے ہیں یہ انتہائی ضروری ہے کہ اندرون ہند اور بیرون ہند کی دنیا کو بتا دیا جائے کہ ملک میں صرف اقتصادی مسئلہ ہی تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے ثقافتی مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے۔ اور کسی صورت سے بھی یہ اقتصادی مسئلہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ اگر آپ ایسی کنونشن منعقد کر سکیں تو پھر ایسے مسلم اراکین اسمبلی کی حیثیتوں کا امتحان ہو جائے گا۔ جنہوں نے مسلمانان ہند کی امنگوں اور مقاصد کے خلاف جماعتیں قائم کر لی ہیں۔ مزید برآں اس سے ہندوؤں پر یہ عیاں ہو جائے گا کہ کوئی سیاسی حربہ خواہ کیسا ہی عیارانہ

کیوں نہ ہو پھر بھی مسلمانان ہند اپنے ثقافتی وجود کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میں چند روز تک دہلی آ رہا ہوں۔ اس اہم مسئلے پر آپ سے گفتگو ہو گی۔ میرا قیام افغانی سفارت خانہ میں ہو گا۔ اگر آپ کو کچھ فرصت ہو تو وہیں ہماری ملاقات ہونی چاہیے۔ از راہ کرم اس خط کے جواب میں چند سطور جلد از جلد تحریر فرمایئے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بار ایٹ لاء

مکرر آنکہ معاف فرمایئے میں نے یہ خط آشوب چشم کی وجہ سے ایک دوست سے لکھوایا ہے۔

الفاظ	معانی
عیاں	ظاہر
امنگوں	تمناؤں
مؤثر	کارگر، اثر کرنے والا
مطمع نظر	نصب العین
عیارانہ	فریب دینے والا
آشوب چشم	آنکھوں کی خرابی

اہم نکات

(۱) علامہ اقبال نے پنڈت جواہر لال نہرو کے خطبہ پر قائداعظم کی توجہ چاہی۔

(۲) نئے قانون کے تحت مسلمانوں کی تنظیم، نہایت ضروری ہے اور اس کے لئے آل انڈیا مسلم کنونشن کی تجویز پیش کی۔

(۳) جو واضح کر دے کہ مسلمان اپنا جداگانہ سیاسی وجود رکھتے ہیں۔

(۴) ان کے لئے ثقافتی مسئلہ اقتصادی مسئلہ سے کسی صورت میں کم اہمیت نہیں رکھتا

---

(۱) پنڈت جواہر لال نہرو: (۱۹۸۹ء-۱۹۶۴ء) انڈین نیشنل کانگرس کے رہنما تھے۔ اوائل زندگی ہی میں سیاست میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۲۹ء میں کانگرس کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور اس کے بعد کئی بار کانگرس کے صدر منتخب ہوئے۔ آزادی ہند کے سلسلہ میں بار بار نظر بند ہوئے۔ آزادی کے بعد بھارت کے پہلے وزیر اعظم بنے اور اپنی وفات تک وزارت عظمی پر فائز رہے۔

(۲) خطبہ: متذکرہ خطبہ میں پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ برصغیر کا حل طلب مسئلہ صرف اقتصادی مسئلہ ہے۔ خطبہ کے ان نکات پر علامہ اقبال قائداعظم محمد علی جناح کی خصوصی توجہ چاہتے تھے۔

(۳) آل انڈیا نیشنل کنونشن: (۳۷-۱۹۳۶ء) کے انتخابات میں کانگرس کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تو کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو دہلی میں آل انڈیا کنونشن طلب کی جس میں ان تمام اراکین اسمبلی نے شرکت کی جو کانگرس کے ٹکٹ پر منتخب صوبائی اسمبلیوں کے لئے منتخب ہوئے تھے۔

(۴) نئے دستور سے مراد قانون ہند ۱۹۳۵ء ہے۔

(۵) آل انڈیا مسلم کنونشن:۔ علامہ اقبال خواہشمند تھے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کا جواب آل انڈیا مسلم کنونشن کے ذریعے دیا جائے مگر کنونشن کا انعقاد نہ ہو سکا۔ البتہ اپریل ۱۹۴۶ء میں دہلی میں مسلم نمائندوں کا ایک کنونشن ہوا جس میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے منتخب نمائندوں نے شرکت کی اور انہوں نے حصول پاکستان کیلئے تجدید عزم کیا۔

خط نمبر ۷

لاہور

۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

دو ہفتے ہوئے میں نے آپ کو خط لکھا تھا۔ معلوم نہیں وہ آپ کو ملا یا نہیں۔ میں نے وہ خط آپ کو دہلی کے پتہ پر لکھا تھا اور پھر جب میں دہلی گیا[1] تو معلوم ہوا کہ آپ وہاں سے پہلے ہی رخصت ہو چکے ہیں۔ میں نے اس خط میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں فوراً ایک آل انڈیا مسلم کنونشن (کسی بھی مقام پر) مثلاً دہلی میں منعقد کر کے حکومت اور ہندوؤں کو ایک بار پھر مسلمانانِ ہند کی پالیسی سے آگاہ کر دینا چاہئے۔ چونکہ صورت حال نازک ہوتی جا رہی ہے اور پنجاب کے مسلمانوں کا رجحان بعض ایسے وجوہ کی بناء پر جن کی تفصیل بتانا (اس وقت) غیر ضروری ہے کانگرس[2] کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس معاملہ پر فوری غور فرما کر فیصلہ کریں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس اگست تک ملتوی ہو چکا ہے۔

لیکن حالات کا تقاضا ہے کہ فوری طور پر مسلم پالیسی کا اعلان مکرر ہو۔ اگر کنونشن کے انعقاد سے پہلے مقتدر مسلمان لیڈروں کا ایک دورہ بھی ہو جائے تو کنونشن یقیناً بہت کامیاب رہے گا۔ براہ نوازش اس خط کا جواب اپنی اولین فرصت میں عنایت فرمائیے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بارایٹ لاء

الفاظ	معانی
مکرر	دوبارہ

اہم نکات :

(۱) آل انڈیا مسلم کنونشن کی تجویز کا اعادہ کیا جائے تا کہ جلد از جلد مسلم پالیسی کا اعلان ہو جائے۔

---

(۱) علامہ اقبال ان دنوں بیمار تھے اور اپنے معالج حکیم عبدالوہاب نابینا صاحب کو اپنی نبض دکھانے دہلی تشریف لے گئے تھے۔

(۲) انڈین نیشنل کانگرس: ہندوستان کی قدیم اور سب سے بڑی سیاسی جماعت جس کو ۱۸۸۵ء میں ایک انگریز اے او ہیوم نے اس وقت کے وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کے ایماء پر قائم کیا۔ ہندو کثیر تعداد میں اس میں شریک ہوئے جب کہ مسلمانوں کی بہت ہی کم تعداد کانگرس کی طرف متوجہ ہوئی۔ کانگرس میں ہندو غالب رہے اور ہندوؤں ہی کا مفاد اس کے پیش نظر رہا جس کی بنا پر مسلمانوں نے اپنی جداگانہ تنظیم مسلم لیگ قائم کی۔

خط نمبر ۸

لاہور (بصیغہ راز)

۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

آپ کے نوازش نامہ کا شکریہ جو مجھے اس اثناء میں ملا مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ مسلم لیگ کے دستور اور پروگرام میں جن تبدیلیوں کے متعلق میں نے تحریر کیا تھا آپ کے پیش نظر رہیں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانان ہند کی نازک صورت حال کا آپ کو پورا پورا احساس ہے۔ مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی ایک جماعت بنی رہے گی یا مسلم جمہور کی جنہوں نے اب تک بعض معقول وجوہ کی بناء پر اس (مسلم لیگ) میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ کوئی سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی حالت سدھارنے کی ضامن نہ ہو۔ ہمارے عوام کے لئے باعث کشش نہیں ہو سکتی۔

نئے دستور کے تحت اعلیٰ ملازمتیں تو بالائی طبقوں کے بچوں کے لئے مختص ہیں اور ادنی ملازمتیں وزراء کے اعزاء اور احباب کی نذر ہو جاتی ہیں۔ دیگر امور میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی طرف کبھی غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی روٹی کا مسئلہ روز بروز نازک ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سو سال سے وہ برابر تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اس غربت کی وجہ ہندو کی ساہوکاری (سود خوری) اور سرمایہ داری ہے۔ یہ احساس کہ اس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی شریک ہے ابھی پوری طرح نہیں ابھرا لیکن آخر کو ایسا ہو کر رہے گا۔ جواہر لال نہرو کی بے دین اشتراکیت [1] بہت بعد میں حائل ہوئی۔

مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا علاج کیا ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر مسلم لیگ نے (اس ضمن میں) کوئی وعدہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام پہلے کی طرح اس سے بے تعلق رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس کا حل موجود ہے اور موجودہ نظریات کی روشنی میں اس میں مزید ترقی کا امکان ہے۔ اسلامی قانون کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لئے کم از کم حق معاش محفوظ ہو جاتا ہے لیکن شریعت اسلام کا نفاذ اور ارتقاء ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے بغیر اس ملک میں ناممکن ہے۔ سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے۔ اور اب بھی میرا ایمان ہے کہ مسلمانوں کی غربت (روٹی) اور ہندوستان میں امن و امان کے قیام کا مسئلہ اسی سے حل ہو سکتا ہے اگر ہندوستان میں یہ ممکن نہیں ہے تو پھر متبادل (راستہ) خانہ جنگی ہے جو فی الحقیقت ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کچھ عرصہ سے جاری ہے مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں فلسطین (کی داستان) دہرائی جائے گی جواہر لال نہرو کی اشتراکیت کا ہندوؤں کی ہیئت سیاسیہ کے ساتھ پیوند بھی خود ہندوؤں کے آپس میں خون خرابہ کا باعث ہوگا۔ اشتراکی جمہوریت اور برہمنیت (۲) کے درمیان وجہ نزاع برہمنیت اور بدھ مت (۳) کے درمیان وجہ نزاع سے مختلف نہیں ہے۔ آیا اشتراکیت کا حشر ہندوستان میں بدھ مت کا سا ہوگا یا نہیں؟ میں اس بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن میرے ذہن میں یہ بات صاف ہے کہ اگر ہندو دھرم اشتراکی جمہوریت اختیار کر لیتا ہے تو خود ہندو دھرم ختم ہو جاتا ہے اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو مناسب تبدیلیوں اور اسلام کے اصول شریعت کے ساتھ اختیار کر لینا کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع ہوگا۔ موجودہ مسائل کا حل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے لیکن جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ مسلم ہندوستان کے ان مسائل کا حل آسان طور پر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کو ایک یا زیادہ مسلم ریاستوں میں تقسیم کیا جائے جہاں پر مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبے کا وقت نہیں آ پہنچا؟ شاید جواہر لال نہرو کی بے دین اشتراکیت کا آپ کے پاس یہ ایک بہترین

جواب ہے۔ بہر حال میں نے اپنے خیالات پیش کر دیے ہیں۔ اس امید پر کہ آپ اپنے خطبہ مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کے مباحث میں ان پر سنجیدگی سے توجہ دیں گے۔ مسلم ہندوستان کو امید ہے کہ نازک دور میں آپ کی فراست موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

مکرر آنکہ: اس خط کے موضوع پر میرا ارادہ تھا کہ آپ کے نام اخبارات میں ایک کھلا خط شائع کراؤں مگر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ موجودہ وقت ایسے اقدام کے لئے موزوں نہیں۔

الفاظ	معانی
بالائی	اعلیٰ۔ اونچے
عمیق	گہرے۔ کامل
حق معاش	روزی
فراست	عقلمندی دانائی

اہم نکات

۱۔ مسلم لیگ کے پروگرام میں جن تبدیلیوں کا ذکر علامہ اقبال نے کیا تھا وہ قائد اعظم کے پیش نظر رہیں گی۔

۲۔ مسلم لیگ عام مسلمانوں کی حالت سدھارنے کے لئے توجہ دے۔

۳۔ مسلمانوں میں غربت کا مسئلہ تشویش ناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ اس کا سبب ہندو کے علاوہ غیر ملکی حکومت بھی ہے۔

۴۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں میں غربت کے خاتمے کے لئے خصوصی توجہ دینی چاہیے۔اور اسلامی قانون کے نفاذ سے غربت کا خاتمہ ہوگا۔

۵۔ اسلامی شریعت کا نفاذ ایک اسلامی ریاست ہی میں ممکن ہے۔

٦۔ نہرو کی اشتراکیت مسلمانوں کے لئے جاذب نظر نہیں ہوسکتی اور یہ خود ہندوؤں کے لئے بھی مفید ثابت نہیں ہوگی۔

۷۔ مسلم ہندوستان کے مسائل کے حل کے لئے برصغیر میں مسلم ریاست کا قیام ضروری ہے اس پر سنجیدگی سے توجہ دیجئے۔

---

(۱) اشتراکیت: ایک سیاسی نظریہ ہے جو ریاست میں انفرادی ملکیت کو ختم کر کے تمام ذرائع پیداوار کو ریاست کی تحویل میں دے دیتا ہے۔کارل مارکس نے سب سے پہلے اسے علمی اصولوں پر پیش کیا مگر اس نظریہ کو مقبولیت بہت بعد میں حاصل ہوئی۔اشتراکیت میں خدا کا تصور بالکل نہیں اس لئے اسے بے دین اشتراکیت کا نام دیا جاتا ہے۔آج کل روس چین اور مشرقی یورپ کے بہت سے ممالک میں اشتراکیت کا دور دورہ ہے۔

(۲) برہمنیت: اس سے مراد ہندومت ہے جو ایک قدیم مذہب ہے۔یہ مذہب کسی مخصوص عقیدے یا کسی مخصوص شخصیت کی تعلیم سے ماخوذ نہیں بلکہ یہ متضاد اور مختلف اوہام اور عقیدوں کا مجموعہ ہے ہندو معاشرہ شدت سے ذات پات کا قائل ہے۔ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ تمام انسان چار ذاتوں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر میں منقسم ہیں برہمن سب سے اعلی اور اونچی ذات تصور کی جاتی ہے اور اسے دوسری ذاتوں پر ہمیشہ برتری حاصل رہی ہے۔

(۳) بدھ مت: ایک قدیم الہامی مذہب جس کی بنیاد گوتم بدھ نے رکھی اس مذہب میں کسی خدا کا تصور نہیں بلکہ یہ چند اخلاقی اور روحانی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔گوتم بدھ کے نزدیک زندگی دکھوں کا گھر ہے اور مصائب انسان کا مقدر ہیں ان سے نجات پانے کا طریقہ خواہشات کو ختم کر کے زندگی سے فرار اور رہبانیت اختیار کرنا ہے۔

خط نمبر ۹ (بصیغہ راز)

لاہور

۲۱ جون ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

کل آپ کا نوازش نامہ ملا۔ بہت بہت شکریہ! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں مگر مجھے توقع ہے کہ میرے بار بار خط لکھنے کو آپ بار خاطر نہ خیال کریں گے۔ اس وقت جو طوفان شمال مغربی ہندوستان اور شاید سارے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے اس میں صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے قوم محفوظ رہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہم فی الحقیقت خانہ جنگی کی حالت میں ہیں اگر فوج اور پولیس نہ ہو تو یہ (خانہ جنگی) دیکھتے ہی دیکھتے پھیل جائے۔ گذشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ نہ صرف شمال مغربی ہندوستان میں گذشتہ تین ماہ میں کم از کم تین (فرقہ ورانہ) فسادات ہو چکے ہیں۔ اور کم از کم چار وارداتیں ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسالت کی ہو چکی ہیں ان چاروں مواقع پر رسول کی اہانت کرنے والوں کو قتل کر دیا گیا ہے سندھ میں قرآن مجید کو نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔ میں نے تمام صورت حال کا اچھی طرح سے جائزہ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان حالات کے اسباب نہ مذہبی ہیں اور نہ اقتصادی بلکہ خالص سیاسی ہیں یعنی مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کرنا ہے۔ نیا دستور کچھ اس قسم کا ہے کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم وزارتیں کوئی مناسب کاروائی نہیں کر سکتیں بلکہ انہیں خود مسلمانوں سے ناانصافی برتنا پڑتی ہے تاکہ وہ لوگ جن پر وزارت کا انحصار ہے خوش رہ سکیں اور ظاہر کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر جانب دار ہے لہذا یہ واضح ہے کہ ہمارے پاس اس دستور کو رد کرنے کے خاص وجوہ موجود ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیا دستور ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ہندو اکثریتی صوبوں

میں ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے اور وہ مسلمانوں کو بالکل نظرانداز کر سکتے ہیں۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو کاملاً ہندوؤں پر انحصار کرنے کے لئے مجبور کر دیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں کہ یہ دستور ہندوستانی مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے لئے بنایا گیا ہے علاوہ ازیں اقتصادی مسئلہ کا بھی حل نہیں ہے جو مسلمانوں کے لئے بہت زیادہ جانکاہ بن چکا ہے۔

کیمونل ایوارڈ (۱)، ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی وجود کو صرف تسلیم کرتا ہے۔ لیکن کسی قوم کے سیاسی وجود (۲) کا ایسا اعتراف جو اس کی اقتصادی پسماندگی کا کوئی حل تجویز نہ کرتا ہو اور نہ کر سکے اس کے لئے بے سود ہے۔ کانگرس کے صدر نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کے (جداگانہ) سیاسی وجود سے ہی انکار کر دیا ہے۔ ہندوؤں کی دوسری سیاسی جماعت یعنی مہاسبھا (۳) نے جسے میں ہندو عوام کی حقیقی نمائندہ سمجھتا ہوں بارہا اعلان کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک متحدہ ہندو مسلم قوم کا وجود ناممکن ہے ان حالات کے پیش نظر بدیہی حل یہ ہے کہ ہندوستان میں قیام امن کے لئے ملک کی ازسرنو تقسیم کی جائے۔ جس کی بنیاد نسلی، مذہبی اور لسانی اشتراک پر ہو۔ بہت سے برطانوی مدبرین بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہیں اور اس دستور کے جلو میں جو ہندو مسلم فسادات چلے آ رہے ہیں وہ ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں کہ ملک میں حقیقی صورتحال کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے روانگی سے قبل لارڈ لوتھیان (۴) نے مجھے کہا کہ میری سکیم (۵) میں ہندوستان کے مصائب کا واحد ممکن حل ہے لیکن اس پر عمل درآمد کے لئے ۲۵ سال درکار ہیں۔ پنجاب کے کچھ مسلمان شمال مغربی ہندوستان میں مسلم کانفرس کے انعقاد کی تجویز پیش کر رہے ہیں اور یہ تجویز تیزی سے مقبولیت اختیار کر رہی ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ہماری قوم ابھی اتنی زیادہ منظم نہیں ہوئی اور نہ ہی ان میں اتنا نظم وضبط ہے اور شاید ایسی کانفرنس کے انعقاد کا ابھی موزوں وقت بھی نہیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم ازکم اس طریق عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہئیے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر اختیار کرنا پڑے گا۔

میرے خیال میں تو نئے دستور میں ہندوستان بھر کو ایک ہی وفاق میں مربوط رکھنے کی تجویز بالکل بیکار ہے۔ مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق کا قیام اس طریق پر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے صرف

واحد راستہ ہے- جس سے ہندوستان میں امن و امان قائم ہوگا اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط سے بچایا جاسکے گا-

کیوں نہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو علیحدہ اقوام تصور کیا جائے جنہیں ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دوسری اقوام کی طرح حق خود اختیاری حاصل ہو- ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے- مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اسی طریق کو اختیار کرنے میں ہے- اس لئے مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبہ کی بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا- لاہور میں اگست کا مہینہ تکلیف دہ ہوتا ہے- میرا خیال ہے آپ لاہور میں وسط اکتوبر میں جب موسم خوشگوار ہو جاتا ہے مسلم لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے بارے میں غور فرمائیں- پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور لاہور میں مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کا انعقاد پنجاب کے مسلمانوں میں ایک نئی سیاسی بیداری کا باعث ہوگی-

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بار ایٹ لاء

الفاظ	معانی
بارخاطر	ناگوار
اہانت	توہین
جانکاہ	سخت، تکلیف دہ
بدیہی	واضح، صاف
مربوط	بندھا ہوا

اہم نکات

۱- برصغیر میں جو خطرناک صورت حال پیش آنے والی ہے اس میں صرف آپ (قائداعظم) ہی قوم کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں۔

۲- ملک میں ہندو مسلم فسادات عام ہو رہے ہیں اس کے اسباب خالصتاً سیاسی ہیں۔

۳- کیمونل ایوارڈ صرف مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن مسلمانوں کے مسائل کا حل نہیں۔

۴- برصغیر میں امن وامان کے قیام کے لئے مسلم ریاست کا قیام ناگزیر ہے۔

۵- مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس پنجاب میں ہوگا۔

---

۱) کیمونل ایوارڈ: گول میز کانفرنس میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا مسئلہ حل نہ ہو سکا تو ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء کو برطانوی وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ نے ایک اعلان کیا جس میں ہندوستان کے مختلف فرقوں کی نمائندگی کا تعین کیا گیا یہ اعلان کیمونل ایوارڈ کے نام پر مشہور ہے جس کی رو سے مسلمانوں کے علاوہ سکھوں، عیسائیوں اور اچھوتوں کے لئے بھی جداگانہ انتخاب تسلیم کر لیا گیا مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب پورے ایوان کا ایک تہائی مقرر کیا گیا۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا مرکزی ملازمتوں میں مسلمانوں کا ایک چوتھائی حصہ رکھا گیا بعض خامیوں کے باوجود مسلمانوں نے اس ایوراڈ کی پذیرائی کی۔

۲- کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے ۳۷-۱۹۳۶ء کے انتخابات میں کانگرس کی غیر متوقع کامیابی کے بعد کلکتہ کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج ہندوستان میں صرف دو فریق موجود ہیں یعنی کانگرس اور برطانوی حکومت۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اسی وقت جواب دیا کہ ہندوستان میں دو نہیں بلکہ تین فریق ہیں کانگرس، برطانوی حکومت اور مسلمان۔

۳۔ ہندو مہاسبھا: ہندوستان کی ایک سیاسی جماعت جو بیسویں صدی کے شروع میں قائم کی گئی یہ جماعت ہندوؤں کو ایک الگ قوم تصور کرتی تھی اور متحدہ قومیت پر یقین رکھتی تھی- لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر مونجے اور مساورکر اس کے رہنما تھے-

۴۔ لارڈ لوتھیان (۱۸۸۲ء-۱۹۴۰ء) برطانوی نواب اور سیاست دان تھے- گول میز کانفرنس میں برطانوی مندوب تھے- ۱۹۳۸ء میں ہندوستان آئے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کانووکیشن سے خطاب کیا امریکہ میں برطانیہ کے سفیر بھی رہے-

۵۔ ''میری سکیم'' سے مراد علامہ اقبال کی وہ تجویز ہے جو آپ نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اِلہ آباد میں مسلم لیگ ''سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت'' کے دوران پیش کی تھی یعنی پنجاب، سرحد، اور بلوچستان کو ملا کر ایک اسلامی ریاست قائم کر دی جائے- شروع میں اقبال صرف شمال مغربی صوبوں پر مشتمل جداگانہ مسلم مملکت کے داعی تھے لیکن بعد میں انہوں نے بنگال کی طرف بھی توجہ دی جیسا کہ زیر نظر خط میں اقبال نے ان صوبوں کے علاوہ بنگال کے مسلمانوں کے حق خود اختیاری کا ذکر بھی کیا ہے-

خط نمبر ۱۰

لاہور

۱۱۔اگست ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

واقعات نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ مسلم لیگ کو اپنی تمام تر سرگرمیاں شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں پر مرکوز کر دینی چاہئیں۔ مسلم لیگ کے دہلی دفتر نے مسٹر غلام رسول [1] کو مطلع کیا ہے کہ مسلم لیگ کے اجلاس کی تاریخ تاحال طے نہیں ہوئی۔

اندریں حالات مجھے اندیشہ ہے کہ اگست اور ستمبر میں اجلاس نہیں ہو سکے گا۔ لہٰذا میں مکرر درخواست کرتا ہوں کہ مسلم لیگ کا اجلاس اکتوبر کے وسط یا آخر میں لاہور میں منعقد کیا جائے پنجاب میں مسلم لیگ کے لئے جوش و خروش برابر بڑھ رہا ہے اور مجھے قوی امید ہے کہ لاہور میں اس کا اجلاس مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں باب اور عوام سے رابطہ استوار کرنے کے لئے ایک اہم ذریعہ ثابت ہوگا۔ براہ کرم جواب میں چند سطریں لکھیے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بار ایٹ لاء

الفاظ	معانی
مکرر	دوبارہ

اہم نکات

(۱) مسلم لیگ کی تمام تر توجہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں پر مرکوز ہو۔

(۲) مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس لاہور میں ہو۔

(۱) غلام رسول خان بار ایٹ لاء (وفات ۱۹۴۹ء) علامہ اقبال کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں جب علامہ اقبال افغانستان کے بادشاہ کی دعوت پر وہاں گئے تو غلام رسول خان ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے ساتھ تھے۔ ۱۹۳۶ء میں پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کئے جانے پر غلام رسول خان مسلم لیگ کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ آپ نے پنجاب میں مسلم لیگ کے لئے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

خط نمبر ۱۱

میورو ڈ لاہور

۱۳ اگست ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

جیسا کہ کل میں نے آپ کو لکھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کے لئے جوش و خروش بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ آپ سن کر خوش ہوں گے کہ پنجاب کے مختلف شہروں میں پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے باقاعدہ آغاز کار کے بغیر لیگ کی تقریباً ۴۰ شاخیں قائم ہو گئی ہیں مجھے یقین ہے کہ اگر پنجاب مسلم لیگ کے کچھ عہدیدار صوبے کا دورہ کر سکیں تو وہ نہ صرف رقم اکٹھی کر سکیں گے بلکہ پنجاب کے عام مسلمانوں کی آنکھیں اس صورت حال کے بارے میں جو خوش قسمتی سے خود ہی مسلمانوں کے بارے میں کانگرس کے رویے سے پیدا ہو چکی ہے کھول دیں گے۔ اگرچہ بدقسمتی سے صوبائی لیگ اس قسم کے دورے کے لئے ابتدائی اخراجات۔ کے لئے رقم کے فقدان [1] کی وجہ سے بڑی دشواری میں ہے۔ کیا آپ مرکزی فنڈ سے تقریباً ۱۵۰۰ روپے عطیہ دے سکیں گے؟ مجھے امید ہے کہ ہمارے آدمی کافی رقم اکٹھی کر لیں گے جس سے ہم آپ سے مستعار [2] لی ہوئی رقم واپس کر سکیں گے۔ اگر آپ اپنی اولین فرصت میں ایسا کر سکیں تو ہم بڑے ممنون ہوں گے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

الفاظ	معانی
فقدان	کمی ہونا
مستعار	ادھار

خط نمبر ۱۲ (بصیغۂ راز)

لاہور

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

مسلم لیگ کے لکھنو اجلاس (۱) میں پنجاب سے خاصی تعداد کی شرکت کی توقع ہے یونینسٹ مسلمان بھی سر سکندر حیات کی قیادت میں شرکت کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں۔ آج کل ہم ایک پر آشوب دور سے گذر رہے ہیں اور ہندوستان کے مسلمان امید کرتے ہیں کہ آپ اپنے خطبے میں جملہ امور میں جن کا تعلق قوم کے مستقبل سے ہے ان کی کامل اور واضح ترین رہنمائی فرمائیں گے۔ میری تجویز ہے کہ مسلم لیگ ایک مناسب قرار داد کی صورت میں کیمونل ایوارڈ سے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان یا مکرر وضاحت کر دے۔ معلوم ہوا ہے کہ پنجاب اور سندھ میں بھی بعض فریب خوردہ مسلمان اس فیصلہ کو اس طرح تبدیل کرنے کے لئے تیار ہیں کہ یہ ہندوؤں کے حق میں زیادہ مفید ہو جائے۔ ایسے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندوؤں کو خوش کر کے وہ اپنا اقتدار بحال رکھ سکیں گے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ برطانوی حکومت ہندوؤں کو خوش کرنا چاہتی ہے جو کیمونل ایوارڈ میں گڑ بڑ کرانے میں خوش آمدید کہیں گے۔ لہذا وہ (برطانوی حکومت) کوشش کر رہی ہے کہ اپنے مسلم ایجنٹوں کے ذریعے اس میں گڑ بڑ کرائے۔ مسلم لیگ کونسل کی خالی نشستوں کے لئے میں ۲۸ افراد کی فہرست تیار کروں گا۔ مسٹر غلام رسول آپ کو وہ فہرست دکھا دیں گے۔ مجھے امید ہے کہ یہ انتخاب پورے غور و خوض سے کیا جائے گا۔ ہمارے آدمی ۱۴ تاریخ کو لاہور سے روانہ ہوں گے۔

مسئلہ فلسطین (۲) نے مسلمانوں کو مضطرب کر رکھا ہے۔ مسلم لیگ کے مقاصد کے لئے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا ہمارے لئے یہ نادر موقع ہے مجھے امید ہے کہ مسلم لیگ اس مسئلہ پر ایک زور دار قرار داد ہی منظور نہیں کرے گی بلکہ لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس میں کوئی ایسا لائحہ عمل بھی تیار کیا جائے

گا۔جس میں مسلمان عوام بڑی تعداد میں شامل ہوسکیں۔اس سے (ایک طرف تو) مسلم لیگ کو مقبولیت حاصل ہوگی اور (دوسری طرف) شاید فلسطین کے عربوں کو فائدہ پہنچ جائے۔ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لئے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔مشرق کے عین دروازے پر ایک مغربی چھاؤنی کا قیام (اسلام اور ہندوستان) دونوں کے لئے پرخطر ہے۔

بہترین تمناؤں کے ساتھ۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بارایٹ لاء

مکرر آنکہ: مسلم لیگ یہ قرارداد پاس کرے کہ کوئی صوبہ دوسری اقوام کے ساتھ کیمونل ایوارڈ سے متعلق کوئی سمجھوتہ کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔یہ ایک کل ہند مسئلہ ہے اور صرف مسلم لیگ ہی کو اس کا فیصلہ کرنا چاہئے۔ممکن ہے آپ ایک قدم آگے بڑھ کر کہیں کہ موجودہ فضا کسی فرقہ ورانہ سمجھوتہ کے لئے مناسب نہیں۔

الفاظ	معانی
پرآشوب	فتنہ انگیز، فساد سے بھرا ہوا۔
غوروخوض	سوچ وبچار
مضطرب	بے چین

اہم نکات

(۱) مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس میں یونینسٹ پارٹی شرکت کے لئے تیاری کر رہی ہے۔

(۲) کمیونل ایوارڈ کے بارے میں مسلم لیگ اپنی پالیسی واضح کر دے۔ کوئی صوبہ اپنے طور پر کسی فرقہ سے سمجھوتہ نہ کرے۔

(۳) مسئلہ فلسطین پر مسلم رہنماؤں کی کانفرنس میں کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے۔

(۱) لکھنؤ اجلاس: مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اجلاس جو ۱۵ تا ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا۔

(۲) مسئلہ فلسطین: دنیائے اسلام کا اہم ترین دینی اور سیاسی مسئلہ ہے۔ فلسطین کا علاقہ بحیرہ روم کے کنارے پر مصر، شام، اردن، سعودی عرب سے متصل ہے۔ اسرائیل نے مغربی سامراج کے تعاون سے علاقہ پر قبضہ کر کے اپنی ریاست قائم کر رکھی ہے۔ اس کے اسباب و عمل میں اسلام دشمنی، عربوں کو تباہ و برباد کرنا اور دنیا کی عظیم آبی شاہراہ نہر سویز کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانا ہے فلسطین کی آزادی کے لئے نہ صرف عرب سرگرم عمل ہیں بلکہ دنیا بھر کی تمام اسلامی حکومتیں بھی عربوں کی ہم نوا ہیں۔

خط نمبر ۱۳   (بصیغہ راز)

لاہور

۳۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

امید ہے کہ آپ کے مطالعہ سے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی منظور کردہ قرارداد گزر چکی ہوگی آپ کے بروقت قدم نے صورت حال کو بچالیا۔ ہم سب کانگرس کی قرارداد پر آپ کے تاثرات کے منتظر ہیں ''ٹریبون'' (۱) لاہور نے پہلے ہی اس پر تنقید کی ہے اور مجھے امید ہے کہ ہندوؤں کی رائے بھی بالعموم اس کے خلاف ہی ہوگی۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس کا اثر خواب آور نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں تنظیم کا کام پہلے سے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ جاری رکھنا ہے اور اس وقت تک دم نہیں لینا جب تک کہ پانچ صوبوں (۲) میں مسلم حکومتیں قائم نہیں ہو جاتیں نیز بلوچستان میں بھی اصلاحات کا نفاذ نہیں ہو جاتا۔

سننے میں آیا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک حصہ مسلم لیگ کے نصب العین پر دستخط کرنے کو تیار نہیں۔ ابھی تک سر سکندر اور ان کی پارٹی نے اس پر دستخط نہیں کئے۔ مجھے آج صبح معلوم ہوا ہے کہ مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس تک انتظار کریں گے۔ جیسا کہ خود ان میں سے ایک ممبر نے مجھے بتایا ہے کہ ان کا منشا صوبائی مسلم لیگ کی سرگرمیوں کو کمزور کرنا ہے اور حال میں چند روز میں آپ کو پورے کوائف سے مطلع کروں گا۔ اور پھر آپ کی رائے درکار ہوگی کہ ہم کس طرح کام جاری رکھیں۔ مجھے امید ہے کہ اجلاس لاہور سے پہلے کم از کم دو ہفتوں کے لئے آپ پنجاب کا دورہ کریں گے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بار ایٹ لاء

الفاظ	معانی
خواب آور	نیند لانے والی

اہم نکات

(۱) کانگرس کمیٹی کی قرارداد کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟۔

(۲) مسلم لیگ کی تنظیم کا کام جاری رہے تاکہ پانچ صوبوں میں مسلم حکومتیں قائم ہو جائیں۔

(۳) یونینسٹ پارٹی مسلم لیگ میں شریک نہیں ہو رہی ان کا مقصد صوبائی مسلم لیگ کی سرگرمیوں کو کمزور کرنا ہے۔

---

(۱) ٹریبون: لاہور سے شائع ہونے والا انگریزی روزنامہ جو کانگرس کے پروگرام اور ہندو نقطۂ نگاہ کی اشاعت و ترویج میں پیش پیش تھا۔

(۲) پانچ صوبے: ۱۔ پنجاب ۲۔ سندھ ۳۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ ۴۔ بنگال ۵۔ آسام

خط نمبر ۱۴۲ (ضروری)

لاہور

یکم نومبر ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

سر سکندر حیات خان اپنی پارٹی کے چند اراکین کے ہمراہ کل مجھے ملے۔ ہمارے درمیان دیر تک مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے باہمی اختلافات پر گفتگو ہوتی رہی دونوں فریقوں کی طرف سے اخبارات کو بیانات جاری کر دیئے گئے ہیں۔ ہر ایک فریق ''جناح سکندر'' معاہدہ (ا) کے بارے میں اپنی اپنی تاویل کرتا ہے۔ اس سے بہت زیادہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے آپ کو لکھا تھا کہ میں یہ سارے بیانات چند روز میں آپ کو ارسال کروں گا۔ سردست میری درخواست ہے کہ آپ مجھے اس سمجھوتہ کی ایک نقل جس پر سر سکندر کے دستخط ہیں اور جو میرے علم کے مطابق آپ کے پاس ہے جلد بھجوا دیجئے۔ آپ سے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ آیا آپ صوبائی پارلیمانی بورڈ کو یونینسٹ پارٹی کے اختیارات میں دینے پر رضامند ہو گئے تھے۔ سر سکندر کا مجھ سے یہ کہنا ہے کہ آپ اس پر راضی ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ان کا مطالبہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کی بورڈ میں اکثریت ہونی چاہیے۔ جہاں تک میرا خیال ہے جناح سکندر معاہدہ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

براہ کرم اس خط کا جواب جلد از جلد عنایت فرمایئے ہمارے آدمی ملک کا دورہ کر رہے ہیں اور مختلف مقامات پر مسلم لیگ کی (شاخیں) قائم کر رہے ہیں گذشتہ رات لاہور میں ہم نے ایک خاصا کامیاب جلسہ کیا ہے اب یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بارایٹ لاء

الفاظ	معانی
سردست	فی الحال، ابھی

اہم نکات

۱۔ سرسکندر حیات خان علامہ اقبال سے ملے اور مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے باہمی اختلافات پر گفتگو رہی۔

۲۔ جناح سکندر معاہدہ کے تحت یونینسٹ پارٹی پارلیمانی بورڈ میں اپنی اکثریت پر مصر ہے۔

۳۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم کا کام جاری ہے۔

۱۔ ''جناح سکندر'' معاہدہ:۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں قائداعظم محمد علی جناح اور سرسکندر حیات خان کے درمیان تبادلہ خیالات ہوا جس کے بعد سرسکندر حیات خان نے اعلان کیا کہ وہ اپنی یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارا کین کو ہدایت کریں گے کہ وہ مسلم لیگ کے ممبر بن جائیں اور وہ مسلم لیگ کے قواعد وضوابط کی پابندی کریں۔ اس سے اس وقت کی مخلوط یونینسٹ وزارت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور مسلم لیگ کے صوبائی پارلیمانی بورڈ کی از سرِ نو تشکیل ہوگی۔ یہ اعلان بعد میں جناح سکندر معاہدہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس معاہدہ کی رو سے سرسکندر حیات کو مسلم لیگ کی حمایت حاصل ہوگئی اور مسلم لیگ میں پنجاب کے وزیراعظم اور اس کے ساتھیوں کی شمولیت سے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت مسلم ہوگئی۔

خط نمبر ۱۵ (بصیغۂ راز)

لاہور

یکم نومبر ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

سر سکندر اور ان کے احباب سے متعدد گفتگوؤں کے بعد اب میری قطعی رائے ہے کہ سر سکندر اس سے کم کسی چیز کے خواہش مند نہیں کہ مسلم لیگ اور صوبائی پارلیمانی بورڈ پر ان کا مکمل قبضہ ہو۔ آپ کے ساتھ ان کے معاہدہ میں یہ مذکور ہے کہ پارلیمانی بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل کی جائے گی۔ اور اس میں یونینسٹ پارٹی کو اکثریت حاصل ہوگی۔ سر سکندر کہتے ہیں کہ آپ نے بورڈ میں ان کی اکثریت تسلیم کر لی ہے میں نے پچھلے دنوں آپ سے خط لکھ کر دریافت کیا تھا کہ کیا واقعی آپ نے پارلیمانی بورڈ میں یونینسٹ اکثریت منظور کر لی ہے۔ ابھی تک آپ نے مجھے اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی۔ ذاتی طور پر مجھے انہیں وہ کچھ دینے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا جس کے وہ خواہش مند ہیں لیکن جب وہ مسلم لیگ کے عہدیداروں میں مکمل ردو بدل کا مطالبہ کرتے ہیں تو منشائے معاہدہ سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ بالخصوص سیکرٹری کی علیحدگی کا مطالبہ حالانکہ انہوں نے مسلم لیگ کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلم لیگ کی مالیات پر بھی ان ہی کے آدمی کا اختیار ہو۔ میرے خیال میں تو وہ اس طرح مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اسے ختم کر دینا چاہتے ہیں صوبے کی رائے کی پوری جان پہچان رکھتے ہوئے میں مسلم لیگ کو سر سکندر کے اور اس کے احباب کے حوالے کر دینے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔

معاہدہ کے باعث پنجاب مسلم لیگ کے وقار کو سخت نقصان پہنچا ہے اور یونینسٹوں کے ہتھکنڈے اسے اور بھی نقصان پہنچائیں گے انہوں نے ابھی تک مسلم لیگ کے منشور پر دستخط نہیں کئے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ کرنا بھی نہیں چاہتے۔ لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس وہ فروری کی بجائے اپریل میں چاہتے ہیں میرا خیال ہے کہ وہ صوبہ میں اپنی زمیندارہ لیگ کے قیام واستحکام کے لئے مہلت چاہتے ہیں شاید آپ کو معلوم

ہوگا کہ لکھنؤ سے واپسی پر سر سکندر نے ایک زمیندارہ لیگ (۱) قائم کی ہے جس کی شاخیں اب صوبہ بھر میں قائم کی جا رہی ہیں اندریں حالات براہ کرم مجھے مطلع فرمایئے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے اگر ہو سکے تو بذریعہ تار اپنی رائے سے مطلع فرمایئے ورنہ فوری ایک مفصل خط تحریر فرمایئے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بارایٹ لاء

الفاظ	معانی
مضائقہ	حرج
وقار	قدر و منزلت
ہتھکنڈے	ہوشیاری، چالاکی
استحکام	مضبوطی

اہم نکات

سر سکندر حیات خان سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں وہ مسلم لیگ اور صوبائی پارلیمانی بورڈ پر اپنی بالادستی چاہتے ہیں۔ اس طرح مسلم لیگ پر مکمل قبضہ کر کے اُسے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اپنی زمیندارہ لیگ کو بھی منظم کر رہے ہیں۔ جناح سکندر معاہدہ کی بنا پر مسلم لیگ کے وقار کو نقصان پہنچا ہے۔

خط نمبر ۱۶

۸ نومبر ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

آپ نے یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر سر محمد اقبال کو خط بھیجا تھا۔ اس کے پیش نظر انہوں نے مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ آپ کو اطلاع دے دوں کہ:

ا۔ لکھنو میں آپ کے اور سر سکندر کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا۔ وہ صوبے بھر میں شدید اختلافات کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ سر سکندر نے پنجاب واپس آتے ہی ایک بیان شائع کر دیا تھا کہ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے سابقہ صورت حال ہنوز قائم اور بحال ہے۔ البتہ اس میں صرف یہ ترمیم کر دی گئی ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے ان مسلم ارکان کو جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں۔ مشورہ دیا جائے گا کہ اگر وہ پسند کریں تو لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ آئندہ ضمنی انتخابات میں جو مسلم امیدوار لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے انہیں یہ عہد کرنا ہوگا کہ کامیاب ہونے کے بعد وہ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں گے۔ اس کے عوض انتخابات کی جنگ میں انہیں یونینسٹ پارٹی کی بھی امداد حاصل ہوگی۔

سر سکندر کی جماعت کے بعض دیگر ارکان نے بھی اس قسم کے بیان شائع کیے ہیں کہ سکندر جناح پیکٹ کی رو سے پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یونینسٹ پارٹی کے قبضے میں چلا جائے گا۔

سر چھوٹو رام نے اپنے دستخط سے ایک بیان اخبارات کو دیا ہے کہ جس میں انہوں نے بھی یہ لکھا ہے کہ آئندہ لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت باقی نہیں رہے گی اور وہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ بن کر رہ جائے گی۔

یونینسٹ پارٹی کے ارکان کی ان تصریحات سے مسلمانان پنجاب میں زبردست ہیجان واضطراب پیدا ہو گیا ہے اور وہ سخت حیران ہیں کہ ایسا معاہدہ کس طرح کیا گیا ہے جس کے تحت لیگ کی مستقل حیثیت

کالعدم ہوگئی ہے اور وہ یونینسٹ پارٹی کی ایک ماتحت جماعت بنا دی گئی ہے، حالانکہ عوام کی نگاہ میں یونینسٹ پارٹی بدترین رجعت پسندوں کا ایک گروہ ہے۔ ان حالات کے پیش نظر میں نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے اور ڈاکٹر محمد اقبال کے مشورے سے ایک بیان شائع کیا جس کا مقصد پنجاب مسلم لیگ کے متعلق جدید غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا چنانچہ میں نے محض سکندر جناح پیکٹ کی اہم شقوں کو نقل کر دیا اور دہرایا کہ اس معاہدے کی رو سے جو مسلم لیگ پارٹی معرض وجود میں آئے گی وہ آل انڈیا مسلم لیگ، مسلم لیگ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ اور مسلم لیگ پراونشل پارلیمنٹ بورڈ کے قواعد وضوابط کے تحت ہوگی۔

اسی ضمن میں ملک برکت علی ایم ایل اے نے بھی ایک بیان شائع کیا ہے جس میں انہوں نے معاہدے کی شرائط کو نقل کر کے واضح کر دیا ہے کہ مجلس قانون ساز کے اندر صرف مسلم لیگ پارٹی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بنیادی اصول اور لائحہ عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی دوسرے گروہ سے مل کر مخلوط کولیشن بنائے یا کسی سرکولیشن کو قائم رکھے۔ ان ہر دو بیانات کی نقول ارسال خدمت ہیں۔

مسلمان عوام پر ان بیانات کا خوشگوار اثر ہوا ہے لیکن یونینسٹ پارٹی کے مقتدر ارکان ان بیانات کی اشاعت سے برہم ہوگئے ہیں۔ روزنامہ ''ٹریبون'' نے ان بیانات پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی ارسال خدمت ہے۔

۲۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر سر محمد اقبال کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے سر سکندر کی خدمت میں رکنیت کے نوے فارم بھیجے اور یہ درخواست کی کہ اسمبلی کی یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں سے ان پر دستخط کرا لئے جائیں کیونکہ ان ایام میں وائسرائے کی آمد کے سلسلے میں تمام ارکان لاہور میں موجود تھے، مگر اس وقت تک ایک فارم پر بھی دستخط نہیں ہوئے اور نہ کوئی فارم ہمیں واپس کیا گیا ہے۔ سچ پوچھیے تو خود میں نے اسمبلی کے بعض مسلم ارکان سے ان فارموں پر دستخط کرنے کو کہا تھا۔ ان میں سے بعض نے بڑی مسرت سے میری درخواست کو شرف قبولیت بھی بخشا، لیکن سر سکندر نے اسمبلی کے ارکان کو پیغام بھیجا کہ ان فارموں پر دستخط نہ کئے جائیں۔ یہ ہے ہماری موجودہ پوزیشن!

سر سکندر اور ان کے بعض دوست یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلم لیگ موجودہ یونینسٹ پارٹی کے قبضہ اقتدار میں آ گئی ہے اور سکندر جناح پیکٹ کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ پنجاب اسمبلی میں لیگ کا واحد نمائندہ مسلم لیگ بلاک کے وجود میں آنے کے بغیر ہی وزارتی پارٹی میں شامل ہو جائے گا۔

لہٰذا یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سکندر جناح پیکٹ سے آل انڈیا مسلم لیگ کی شہرت کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو لیگ سے مسلمانان پنجاب کی تمام ہمدردی ختم ہو جائے گی۔ میں یہ بھی واضح کر دوں کہ اگر ہم یہ بیانات شائع نہ کرتے، تو آل انڈیا مسلم لیگ کے وقار کو سخت ٹھوکر لگتی۔

آپ کو یہ سن کر دلی مسرت ہوگی کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا ایک وفد (جس میں خان بہادر ملک زمان مہندی، ملک برکت علی، مسٹر عاشق حسین بٹالوی اور راقم الحروف کے علاوہ بعض دیگر ارکان بھی شامل ہیں) پنجاب کا دورہ کر کے مختلف مقامات پر بڑے جلسوں میں تقریریں کر رہا ہے۔ ان مقامات پر مسلمان عوام نے آل انڈیا مسلم لیگ اور پنجاب پراونشل مسلم لیگ سے جس خلوص اور عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ ہماری کوششوں سے اس وقت تک ۲۴ شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ اور مزید شاخیں قائم ہو رہی ہیں مگر چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب ہے، اس لیے ہم اپنا دورہ ملتوی کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ واضح کر دینا بھی مناسب ہے کہ سر سکندر کی پارٹی کے ایک کارکن نے بھی ہمارا ساتھ نہیں دیا۔

۴۔ میر مقبول محمود نے ملک برکت علی کو سکندر جناح پیکٹ کی نقل مہیا نہیں کی اس لئے ان کے متعلق آپ کو تار دیا گیا تھا ڈاکٹر سر محمد اقبال نے بھی سر سکندر حیات کو پیغام بھیجا تا کہ معاہدہ مذکورہ کی ایک نقل بھیجدیں سکندر نے نقل بھیج دی ہے، مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اصل کے مطابق ہے یا نہیں، کیونکہ میر مقبول محمود نے مجھے بتایا ہے کہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کی رات کو گیارہ بجے جب کہ معاہدے کی تمام شرائط آپ کے کمرے میں طے ہو چکی تھیں۔ سر سکندر نے بعض ترمیمیں پیش کیں اور بالآخر معاہدہ مرتب ہوا جس کی نقل ڈاکٹر سر محمد اقبال کو بہم پہنچائی گئی ہے چونکہ ہمیں ان ترمیموں کا کوئی علم نہیں، اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ اس معاہدہ کی نقل جو کہ آپ کے پاس موجود ہے، ایک نقل ہمیں بھی ارسال فرما دیجئے کیونکہ جب ملک برکت علی نے میر مقبول محمود سے یہ نقل مانگی تھی تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ مطلوبہ نقل آپ کو بھیج دی گئی ہے۔

۵۔ اب میں ان امور کی طرف آتا ہوں جن کے متعلق آپ نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مشورہ طلب کیا ہے۔
(الف) فروری ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی لاہور میں منعقد کرنے کے متعلق جہاں تک سر سکندر کی دعوت کا تعلق ہے، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن ہم اس وقت تک کوئی تجویز پیش کرنے کے قابل نہیں ہیں، جب تک کہ اس قسم کا واضح اور غیر مبہم سمجھوتہ نہ ہو جائے کہ سر سکندر کی پارٹی کے مسلمان ارکان کسی مزید تاخیر کے بغیر مسلم لیگ کے حلف نامے اور قرطاس رکنیت پر دستخط کر دیں اور اعلان کریں کہ اسمبلی کے اندر بھی ان کی جماعت مسلم لیگ پارٹی کہلائے گی۔ جہاں تک صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ سر سکندر حیات خان کی طرف سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے سے بچ جائیں۔
(ب) جہاں تک آرگنائزنگ کمیٹی کی تشکیل کا سوال ہے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ پراونشل مسلم لیگ اس وقت موجود ہے اور ہم ہر ضلع ہر تحصیل اور اکثر دیہات میں لیگ کی مقامی شاخیں قائم کر رہے ہیں، اس لئے پنجاب میں کسی آرگنائزنگ کمیٹی کی ضرورت نہیں۔
(ج) جہاں تک مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا تعلق ہے۔ ہماری یہ تجویز ہے کہ پنجاب کو پانچ نشستیں دی جائیں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی درخواست ہے کہ وہ خرابی صحت کی بنا پر اس قابل نہیں ہیں کہ مجلس عاملہ کے جلسوں میں شریک ہو سکیں، اس لئے ان کی جگہ ملک زمان مہدی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو لے لیا جائے۔ ملک برکت علی ورکنگ کمیٹی میں بدستور شامل رہیں اور مسٹر غلام رسول خان بیرسٹر ایٹ لاء کا نام بھی شامل کر لیا جائے۔ جہاں تک سر سکندر اور میاں احمد یار خان دولتانہ کا تعلق ہے، اس مسئلہ کے حل کا انحصار بیشتر ان کے اس فیصلہ پر ہے کہ وہ لیگ ٹکٹ پر دستخط کر دیں اور کسی مزید تاخیر کے بغیر اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیں اگر وہ اس معاہدے پر عمل کریں تو خیال رکھا جائے گا کہ ان کی نیابت کسی صورت میں موجودہ مسلم لیگ پارٹی کی نیابت سے تجاوز نہ کرنے پائے۔

آپ کا مخلص

غلام رسول

(برائے ڈاکٹر سر محمد اقبال)

الفاظ	معنی
تصریحات	وضاحتیں، توضیحات
کالعدم	ختم ہونا
شرف قبولیت	قبول کرنے
تدارک	روک تھام
راقم الحروف	خط لکھنے والا
قرطاس رکنیت	رکنیت کا فارم
آرگنائزنگ کمیٹی	تنظیمی کمیٹی، پوری جماعت کو منظم کرنے والی کمیٹی
تجاوز	زیادہ بڑھ جانا
نیابت	نمائندگی

زمیندارہ لیگ: ۱۹۳۷ء میں سر سکندر حیات نے پنجاب کے زمینداروں اور جاگیرداروں کی تنظیم زمیندارہ لیگ کے نام سے قائم کی مگر اس کو کوئی مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔

خط نمبر ۱۷

۱۷ جنوری ۱۹۳۸ء

محترم جناح صاحب

آپ کی گشتی چٹھی نمبر ۵۶۶، مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء کے جواب میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مجھے تحریر کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

(۱) مذکورہ بالا گشتی چٹھی میں آپ نے جو ہدایات دی ہیں انہیں عملی جامہ پہنانے کے لئے مناسب اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

(۲) جہاں تک لیگ کے اجلاس خصوصی کا سوال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ اجلاس لیگ کے لئے آئین کے مطابق کر رہے ہیں مگر آپ کو اس امر کا پورا احساس ہوگا کہ اس خاص اجلاس میں جو مسئلہ زیر بحث آئے۔ وہ بے حد اہم ہے اور تمام مسلمانان ہند پر بالعموم اور مسلمانان پنجاب پر بالخصوص اثر انداز ہوگا۔

یہ امر اس بات کا متقاضی ہے کہ کھلے اجلاس میں اہل بصیرت مسلمانوں کی بڑی سے بڑی اکثریت اس پر بحث کرے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کی رو سے پنجاب سے ۳۶۰ سے زیادہ مسلمان اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے اور وہ بھی اس صورت میں کہ یہ تمام ممبر وہاں پہنچ جائیں۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے احساسات بھی پنجاب کے مسلمانوں کے احساسات کی طرح شدت سے مجروح ہوئے ہیں یا نہیں، لیکن اگر لیگ سول نافرمانی کا فیصلہ کرے تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلہ کا انحصار ان ہی لوگوں پر رکھا جائے جس پر اس تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا بوجھ ڈالا جائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ آئین جدید کی رو سے یہ امر ممکن نہیں، اس لئے ہماری تجویز یہ ہے کہ خاص اجلاس پرانے آئین ہی کے ماتحت ۳۱ مارچ ۱۹۳۸ء سے پہلے منعقد کر لیا جائے، کیونکہ پرانے آئین کی رو سے ہر مسلمان ایک روپیہ ادا کر کے بحث میں حصہ لے سکتا ہے، اگر آپ کا خیال ہے کہ ۲۱ مارچ بہت قریب

۔ہ،تو پھر ہماری یہ تجویز ہے کہ آپ نئے آئین کے نفاذ کو خاص اجلاس تک ملتوی کر دیں اور یہ اجلاس ۳۱ مارچ کے بعد مناسب تاریخوں میں منعقد کرایا جائے۔

اگر یہ دونوں تجویزیں آپ کو منظور نہ ہوں، تو پھر ہماری درخواست ہے کہ آپ خاص اجلاس کی بجائے ہندوستانی مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس منعقد کریں جس میں ہر بالغ مسلمان کو شامل ہونے کی اجازت ہو۔ظاہر ہے کہ یہ کانفرنس بھی لیگ کے زیر اہتمام اور آپ ہی کی زیر صدارت منعقد ہوگی۔

آپ کا مخلص

غلام رسول

آنریری سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ

(برائے ڈاکٹر سر محمد اقبال)

الفاظ	معانی
بالعموم	عام طور پر
بالخصوص	خاص طور پر
متقاضی	تقاضا کرنا
اہل بصیرت	بصیرت رکھنے والے، روشن ضمیر

خط نمبر ۱۸

۷ مارچ ۱۹۳۸ء

محترم جناح صاحب

مجھے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی طرف سے ذیل کا خط لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے آپ کا خط ڈاکٹر صاحب موصوف کو ۴ مارچ ۱۹۳۸ء کو ملا۔ ان کی صحت کی خرابی ہم سب کیلئے مندرجہ ذیل کے لئے وجہ اضطراب بنی ہوئی ہے اور وہ آپ کو خط لکھنے سے معذور ہیں۔ آپ کے خط کے جواب میں ان کا ارشاد یہ ہے۔

کل پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا ایک عام اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس میں صوبے کے تمام اضلاع کے نمائندے شامل ہوئے اور پراونشل مسلم لیگ کے ارکان کی ایک بڑی تعداد نے اس میں حصہ لیا۔ آپ نے سر محمد اقبال کو جو خط لکھا تھا وہ اس اجلاس میں پڑھا گیا اور اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی لاہور ہی میں منعقد ہو اور اس کے لئے ایک رسمی دعوت نامہ بھیج دیا جائے۔ لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ شہید گنج کے متعلق لیگ کا اجلاس خصوصی ایسٹر کی تعطیلات میں لاہور میں منعقد کرنے کے لئے اس خط ہی کو دعوت نامہ تصور کیا جائے۔ جہاں تک پنجاب کی صورت حال کا تعلق ہے، سر محمد اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں:

۱۔ شہید گنج کے متعلق غالباً پریوی کونسل میں اپیل کی جائے گی، لیکن لوگوں کو اس سے زیادہ دلچسپی نہیں، کیونکہ اس وقت وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ برطانوی عدالت کی طرف رجوع بے سود ہے۔

۲۔ ملک برکت علی نے تحفظ مساجد کے متعلق پنجاب اسمبلی میں جو بل پیش کرنے کا نوٹس دیا ہے۔ مسلمانوں میں اس پر کافی جوش پھیلا ہوا ہے اس وقت تک یونینسٹ پارٹی کے پچیس ارکان نے سر سکندر کی ہدایات کے برعکس اخبارات میں اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ اس بل کی تائید کریں گے اور اس بل کو انہوں نے اپنا بل بنا لیا ہے۔ نیز صوبے کے تمام ووٹر مناسب قرار دادیں منظور کر کے اپنے اپنے نمائندوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس بل کی پوری حمایت کی جائے۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ جب یہ بل منظوری کی غرض سے اسمبلی میں پیش ہوگا تو قانون کی صورت اختیار کر لے گا۔

۳۔ شہید گنج کی سول نافرمانی کی تحریک روز بروز تقویت پکڑ رہی ہے۔ عوام پر امن ہیں اور بے تابی سے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی کے اہم فیصلوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب یہ فیصلہ ہو جائے گا تو پنجاب کے تقریباً تمام مسلم ادارے لیگ کی رہنمائی میں سرگرم عمل نظر آئیں گے۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ آپ کو یقین دلاتی ہے کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی کے لئے تمام ضروری انتظامات کرنے کی ذمہ دار ہے۔

آپ کا مخلص

غلام رسول خان

آنریری سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ

(برائے ڈاکٹر سر محمد اقبال)

۶۔ خود آزمائی

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کا جواب ہاں یا نہیں کی صورت میں دیجئے

۱۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کیا۔

۲۔ علامہ اقبال نے خطبہ آلہ آباد میں پاکستان کا تصور پیش کیا۔

۳۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان منظور کی۔

۴۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں قائداعظم مسلم لیگ کی تنظیم کے سلسلہ پر لاہور تشریف لائے تو علامہ اقبال بیماری کی وجہ سے تعاون نہ کر سکے۔

۵۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۳۷ء مسلم لیگ کی تنظیم نو کے زمانے کا پہلا اجلاس تھا۔

۶۔ پنجاب کی سیاسی جماعتوں بالخصوص احرار اور اتحاد ملت نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا۔

۷۔ جناح سکندر معاہدہ بڑا مبہم اور غیر واضح تھا۔

۸۔ جناح سکندر معاہدہ سے پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم کے کام کو فائدہ پہنچا۔

۹۔ قیام پاکستان سے پہلے یونینسٹ پارٹی پنجاب کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔

۱۰۔ خطوط اقبال بنام قائداعظم میں ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو تحریر کردہ خط اپنے مباحث کے اعتبار سے بڑا منفرد اور اہم ہے۔

۲۔ مندرجہ ذیل فقرات کو دیئے گئے لفظوں سے مکمل کیجئے۔

۱۔ علامہ اقبال نے قائداعظم کے نام یہ خطوط مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصہ میں اپنی وفات سے چند.......... پہلے تحریر کئے۔ (سال۔ ماہ)

۲۔ خطوط اقبال بنام قائداعظم ایک طرح سے خطبہ .... کے اجمال کی تفصیل ملی ہیں۔
(علی گڑھ۔الہ آباد)

۳۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء کو لاہور میں مسلم راہنماؤں کا ایک اجلاس پنجاب مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلہ میں .... کی صدارت میں منعقد ہوا۔ (علامہ اقبال۔قائداعظم)

۴۔ ۲۳ مارچ .... سنہ میں مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان منظور کی۔
(۱۹۴۰ء،۱۹۳۰ء)

۵۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۴۔۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی صدارت .... نے کی۔ (علامہ اقبال۔قائداعظم)

۶۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلہ میں قائداعظم اپریل .... کو لاہور تشریف لائے۔ (۱۹۳۶ء۔۱۹۴۰ء)

۷۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کی صدارت .... نے کی۔
(علامہ اقبال۔قائداعظم)

۸۔ مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس ۱۹۳۷ء میں آسام بنگال اور .... کے وزیراعظم نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیا۔ (سندھ۔پنجاب)

۹۔ قانون ہند ۱۹۳۵ء کو برصغیر پاک و ہند کی تمام سیاسی جماعتوں نے .... کیا۔
(پسند۔ناپسند)

۱۰۔ کرشک پرجا پارٹی .... کی ایک سیاسی جماعت تھی۔ (بنگال۔پنجاب)

۱۱۔ کیمونل ایوارڈ میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریق انتخاب کا اصول تسلیم .... گیا۔
(کرلیا۔نہیں کیا)

۱۲۔ کیمونل ایوارڈ میں مسلمانوں کے سیاسی وجود کو تسلیم .... گیا۔
(کرلیا۔نہیں کیا)

۱۳۔ علامہ اقبال کے نزدیک برصغیر پاک و ہند میں ہندو مسلم فسادات کے اسباب خالصتاً .... تھے۔ (مذہبی۔سیاسی)

۱۴۔ علامہ اقبال کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کا آئندہ سالانہ اجلاس .... میں منعقد کیا جائے۔ (دہلی۔لاہور)

۳۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھیے۔

۱۔ خطوط اقبال بنام قائداعظم سب سے پہلی بار کب شائع ہوئے؟

۲۔ خطوط اقبال بنام قائداعظم میں کون سا خط اپنے مباحث کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے؟

۳۔ خطوط اقبال بنام قائداعظم محمد علی جناح کی تعداد کتنی ہے؟

۴۔ پاکستان میں علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات کا انعقاد کس سن میں ہوا؟

۵۔ خطوط اقبال بنام قائداعظم کے مباحث سے کسی دو کے نام بتایئے۔

۷۔ جوابات

(۱) ۱۔ نہیں ۲۔ ہاں ۳۔ ہاں ۴۔ نہیں
۵۔ ہاں ۶۔ نہیں ۷۔ ہاں ۸۔ نہیں
۹۔ ہاں ۱۰۔ ہاں

(۲) ۱۔ ماہ ۲۔ الہ آباد ۳۔ علامہ اقبال ۴۔ ۱۹۴۰ء
۵۔ قائداعظم ۶۔ ۱۹۳۶ء ۷۔ علامہ اقبال ۸۔ پنجاب
۹۔ ناپسند ۱۰۔ بنگال ۱۱۔ کرلیا ۱۲۔ کرلیا
۱۳۔ سیاسی ۱۴۔ لاہور

(۳) ۱۔ ۱۹۴۳ء میں ۲۔ جون ۱۹۳۷ء کو تحریر کردہ خط نمبر ۸
۳۔ اٹھارہ ۴۔ ۱۹۷۷ء میں
۵۔ مسلم لیگ کی تنظیم نو، برصغیر میں مسلم ریاست کا قیام۔

یونٹ ۔ ٦

منظر نگاری سے مقصدی شاعری تک

منظوم مکالمے

(نظمیں)

۱۔ ایک پرندہ اور جگنو

۲۔ چاند اور تارے

تحریر: ڈاکٹر محمد ریاض، حسن سجاد سید

فہرست

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
212	تعارف	
212	مقاصد	
213	علامہ اقبال کی شاعری کا ارتقاء	۱۔
214	ایک پرندہ اور جگنو۔ تعارف	۲۔
215	نظم کا متن۔ ایک پرندہ اور جگنو	۲.۱۔
216	توضیحات	۲.۲۔
216	تشریحات	۲.۳۔
218	چاند اور تارے۔ تعارف	۳۔
219	نظم کا متن۔ چاند اور تارے	۳.۱۔
220	توضیحات	۳.۲۔
220	تشریحات	۳.۳۔
222	خود آزمائی	۳.۴۔
225	جوابات	۴۔

تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

کلام اقبال میں مکالمہ نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ان مکالموں کے ذریعے سے اقبال نے زندگی کو بہتر بنانے کا سبق دیا ہے۔اس یونٹ میں آپ اقبال کی دو نظمیں پڑھیں گے جن میں مکالمے کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔پہلی نظم میں باہمی تعاون اور دوسری میں حرکت و عمل کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد امید ہے آپ اس قابل ہوسکیں گے کہ:

(۱) معاشرتی زندگی میں باہمی تعاون کی اہمیت سے آگاہ ہوں اور اپنے آپ کو معاشرے کا مفید فرد بنائیں۔

(۲) فرد کی شخصیت کی نشو ونما کے لئے محنت سے کام کرنے کی ضرورت سے واقف ہوں اور اپنے آپ کو محنت ومشقت کا عادی بنائیں۔

(۳) اقبال کی شاعری خصوصاً ان کے منظوم مکالموں سے لطف اندوز ہوں۔

(۴) یونٹ میں شامل نظموں کو سمجھیں اور ان کی تشریح کریں۔

ا۔ علامہ اقبال کی شاعری کا ارتقاء

آج سے جو یونٹ آپ کو شروع کرنا ہے اس میں علامہ اقبال کی دو نظمیں جو منظوم مکالمے میں شامل ہیں۔ ان نظموں کی تشریح اور وضاحت سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو علامہ اقبال کی شاعری کے بنیادی موضوعات سے روشناس کرا دیا جائے اور ان کی شاعری میں وقت کے ساتھ ساتھ جو تبدیلیاں آتی رہی ہیں ان کی تفصیل بیان کر دی جائے۔

اقبال کی شاعری کو ہم آسانی کے ساتھ تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلے دور میں انہوں نے زیادہ تر مناظر فطرت پر نظمیں لکھی ہیں اور فطرت کو بڑے دل نشین پیرائے میں پیش کیا ہے ''گل رنگین'' ''ابر کوہسار'' ''آفتاب صبح'' ''ماہ نو'' ''چاند'' اور ''کنار راوی'' وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس دور میں انہوں نے جو غزلیں لکھی ہیں، وہ روایتی انداز کی ہیں اور ان کا موضوع زیادہ تر عشق و محبت ہے۔

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جب وہ قومی شاعری کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس دور کی نظموں میں حب الوطنی کا جذبہ شدت سے موجود ہے وہ ایک سچے وطن پرست کی حیثیت سے قوم کی حالت زار پر رنجیدہ اور غمگین نظر آتے ہیں اور اپنی پر جوش شاعری کے ذریعے قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کی شاعری کا تیسرا دور وہ ہے جو ان کے قیام یورپ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ان کی شاعری کا بہترین دور سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انہیں یورپ کی تہذیب اور سیاست کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دنیا میں انسان کے لئے اگر کوئی جائے پناہ ہے تو وہ دین اسلام ہے یہی وجہ ہے کہ اس دور کی شاعری میں اسلام اور پیغمبر اسلام سے عقیدت اور محبت بہت زیادہ نظر آتی ہے، یہ دور نہ صرف اپنے موضوعات کی گہرائی کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس دور کی نظمیں اور غزلیں اپنی شاعرانہ خوبیوں کے اعتبار سے بھی پہلے دو ادوار سے بہتر ہیں۔ اس یونٹ میں شامل دونوں نظمیں بالترتیب ان کے پہلے اور دوسرے دور کی شاعری سے آپ کے لئے منتخب کی گئی ہیں۔ اب ان دو مکالماتی نظموں کو دیکھیں۔

۲۔ایک پرندہ اور جگنو

تعارف

اقبال کی یہ نظم ایک پرندے اور جگنو کے درمیان مکالمے کی صورت میں ہے۔اس کے کل بارہ شعر ہیں۔یہ نظم بانگ درا کے حصہ اول میں سے ہے۔اسے علامہ اقبال نے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان جانے سے پہلے ۱۹۰۵ء تک کسی وقت لکھا۔جگنو جو ایک چھوٹا سا برساتی کیڑا ہے اقبال نے اس پر بڑی توجہ مبذول کی ہے۔ان کی اردو اور فارسی شاعری میں اس ننھے سے کیڑے کے بارے میں کئی نظمیں ہیں۔اقبال کو جاندار یا بے جان چیزوں کے مکالمے لکھنے اور ان سے غیر معمولی نتائج نکالنے سے بہت دلچسپی تھی۔اس نظم میں انہوں نے پرندے کی قسم نہیں بتائی صرف یہ بتایا ہے کہ یہ پرندہ جگنو پر حملہ آور ہونے لگا تھا مگر جگنو نے اسے اپنی اہمیت بتائی۔جگنو کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اس دنیا میں طاقتور اور کمزور افراد کے درمیان تعاون ہونا چاہئے اور اگر طاقتور کمزوروں پر حملہ آور ہوں اور انہیں دنیا سے مٹا ڈالنے کی کوشش کریں تو اس دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔اقبال نے جو بات کہی اس کا تعلق فرد سے بھی ہے اور قوم سے بھی۔

۱۲۔ نظم کا متن

ایک پرندہ اور جگنو

سر شام ایک مرغ نغمہ پیرا — کسی ٹہنی پر بیٹھا گا رہا تھا
چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر — اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر
کہا جگنو نے او مرغ نوا ریز! — نہ کر بے کس پر منقار ہوس تیز
تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی — اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
لباس نور میں مستور ہوں میں — پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
چہک تیری بہشت گوش اگر ہے — چمک میری بھی فردوس نظر ہے
پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی — تجھے اس نے صدائے دلربا دی
تری منقار کو گانا سکھایا — مجھے گلزار کی مشعل بنایا
چمک بخشی مجھے، آواز تجھ کو — دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز — جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز
قیام بزم ہستی ہے انھی سے — ظہور اوج وپستی ہے، انھی سے

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

۲.۲۔ توضیحات

سرِشام: شام کے وقت، مرغ نغمہ پیرا: چہچہانے والا پرندہ، طائر: پرندہ، مرغ نوا ریز: خوش آواز پرندہ، منقارِ ہوس: لالچ کی چونچ، بے کس: بے سہارا، مستور: چھپا ہوا، بہشت گوش: کانوں کو اچھا لگنے والا، فردوس نظر: آنکھ کو اچھا لگنے والا، ضیا: روشنی، صدائے دلربا: دل کو چھین لینے والی آواز، گلزار: باغ، ہم نشین: ساتھی، دوست، قیامِ بزمِ ہستی: زندگی کی محفل کا قائم رہنا، ظہور: ظاہر ہونا، اوج: بلندی، پستی، نشیب، ہم آہنگی: تعاون، ایک دوسرے کے ساتھ یکجہتی اور اتفاق۔

۲.۳۔ تشریحات

کہانی یوں ہے کہ:

ایک شام کوئی پرندہ درخت پر بیٹھا گا رہا تھا۔ اسے کوئی چمکتی چیز دکھائی دی۔ پرندے نے جگنو سمجھ کر اس پر حملہ کیا وہ چیز تھی تو جگنو ہی مگر جگنو نے پرندے سے بحث شروع کی۔ اس نے کہا کہ پرندے کے پاس اگر چہکنے کی اہلیت ہے تو اس جگنو کے پاس بھی چمک اور روشنی ہے۔ جگنو لباسِ نور پہنے ہوئے ہے وہ پتنگوں کی دنیا کا گویا کوہِ طور ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا جلوہ دکھائی دیا تھا۔ پرندے کی چہک اگر کانوں کو پسند ہے تو جگنو کی چمک بھی آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ جگنو پرندے کی خوش نوائی کی تعریف کرتا ہے اور اپنے پروں کے حسن کی بھی۔ پرندے کی چونچ گانا جانتی ہے مگر باغ کی روشنی کا سامان جگنو مہیا کرتا ہے۔ پرندے کی آواز میں ساز ہے تو جگنو کی چمک میں سوز۔ سوز و ساز یعنی ہمدردی اور باہمی تعاون سے ہی دنیا کے کام چلتے ہیں۔ پوری کہانی کا سبق آخری شعر میں ہے:

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی ؎ اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

مطلب یہ ہے کہ ہم آہنگی: تعاون اور ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کے ذریعے ہی اس دنیا کی محفل کی رونق ہے اور اس باغِ دنیا کی بہار اس طرح قائم رہتی ہے جس طرح طاقتور پرندے کو کمزور جگنو پر ہاتھ

اٹھانا چاہئے اس طرح کسی بھی طاقتور ذی روح کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کمزوروں کو دبائے اور انفرادی سطح پر بھی ہونا چاہئے اور قومی پیمانے پر بھی۔ لہذا طاقتور اور ترقی یافتہ اقوام کو بھی چاہئے کہ کمزور اور ترقی پذیر اقوام کو اپنی برادری کا جزو سمجھیں۔ کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسرے کو نیچا دکھائے۔ چھوٹا بڑا کمزور اور طاقتور سب اس کائنات کے حسن میں اضافہ کر رہے ہیں اور سب کا وجود مفید ہے۔ اقبال نے اپنی کئی ابتدائی اور آسان اردو نظموں میں بھی ان باتوں کو نہایت خوبی سے سمجھایا ہے۔ مثلاً ''ایک پہاڑ اور گلہری'' میں ہے۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں ۔۔۔ نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں

۳۔ چاند اور تارے

تعارف

عزیز طلبہ و طالبات! ہم اب دوسری نظم کا مطالعہ شروع کرتے ہیں آپ کو گذشتہ یونٹوں میں بتایا گیا ہے، علامہ اقبال ہمارے قومی شاعر ہیں اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کی سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر کے ان میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ اس نظم میں بھی انہوں نے چاند اور تاروں کے درمیان ایک فرضی مکالمے کی صورت میں عمل کی تعلیم دی ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی عمل اور جدوجہد کا نام ہے اور دنیا میں صرف وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے فرائض سے جی چرائے بغیر مسلسل کام کرتے رہتے ہیں یہی لوگ اپنی محنت کے صلے کے طور پر دنیا میں بلند مقام حاصل کرتے ہیں۔ عمل کا یہ اصول صرف افراد ہی کے لئے نہیں بلکہ قوموں کے لئے بھی ہے۔ یعنی جو قومیں مصروف عمل ہیں اور دنیا میں کچھ کام کر رہی ہیں وہ ترقی کرتی ہیں اور جو بے عمل ہیں وہ فنا ہو جاتی ہیں۔

علامہ اقبال نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا، وہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تاریخ کا ایک نازک دور تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست نے ان کے حوصلے پست کر دیئے تھے اور ان پر مایوسی اور افسردگی کا عالم طاری تھا۔ خود اقبال نے اس کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　　مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

چونکہ مسلمان قوم مایوسی اور افسردگی کا شکار تھی اس لئے وہ عمل کی قوت سے بھی محروم ہو چکی تھی۔ لیکن علامہ اقبال نے اپنی ولولہ انگیز اور پر امید شاعری کے ذریعے قوم کو مایوسی کی اس حالت سے اور ان میں کھوئی ہوئی عمل کی قوت بحال کی۔ یہ نظم بھی جس میں بظاہر چاند اور ستاروں کا مکالمہ ہے دراصل مسلمانوں ہی کی طرف مخاطب ہو کر کہی گئی ہے اس میں انہیں اس قانون فطرت سے آگاہ کیا گیا ہے کہ بے عملی کا مطلب سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں ہے اگر دنیا میں تمہیں کچھ نام پیدا کرنا ہے تو غفلت کی نیند سے جاگو اور دنیا میں اپنے عمل سے کچھ کر کے دکھاؤ یہاں اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ تم جس مقصد کے

لئے بھی جدوجہد کرو، تمہیں اپنے مقصد اور نصب العین ۔۔ عشق کی حد تک لگاؤ ہونا چاہئے جب تک تمہیں اپنے مقصد سے عشق نہ ہو جائے تم کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتے۔ یہاں اقبال نے حسن کو کامیابی ۔۔ معنوں میں استعمال کیا ہے اس لئے کہ مسلسل جدوجہد کے بعد جو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

۱۰۳۔ چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے ۔۔۔ تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے وہی رہے فلک پر ۔۔۔ ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا ۔۔۔ چلنا، چلنا، مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے ۔۔۔ کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کش سفر سب ۔۔۔ تارے، انسان، شجر، حجر سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئے گی نظر کیا
کہنے لگا چاند ہم نشینو! ۔۔۔ اے مزرع شب کے خوشہ چینو
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی ۔۔۔ یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ ۔۔۔ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے ۔۔۔ پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں! ۔۔۔ جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

۲.۳۔ توضیحات

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے: تارے صبح سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ صبح ان کے لئے موت کا پیغام لاتی ہے۔

مدام: ہمیشہ

ستم کشِ سفر: سفر کی مصیبت برداشت کرنے والا

شجر: درخت

مزرعِ شب: رات کی کھیتی

اشہب: گھوڑا

مقام: ٹھہرنا

اجل: موت

حجر: پتھر

ہم نشینو: ساتھیو

خوشہ چینو: خوشے چننے والو

تازیانہ: چابک

قرار: رُکنا، ٹھہراؤ، سکون

خرام: چال

۳.۳۔ تشریحات

ایک رات ستاروں نے چاند سے یہ سوال کیا کہ ہم ایک مدت سے آسمان کی بلندیوں پر چمک رہے ہیں لیکن ہمارے چمکنے سے آسمان پر کوئی تبدیلی آج تک نہیں ہوئی۔ آسمان اور اس کے نظارے ویسے ہی ہیں جیسے کہ پہلے تھے۔ ہمارے ذمے بس یہی کام ہے صبح وشام چلتے ہیں اور ہمیشہ سے اسی طرح گردش

کر۔۔۔ آ رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز حرکت میں ہے اور سکون واطمینان کی ہر جگہ بہت کمی ہے تارے، انسان، درخت اور پتھر سب کسی نہ کسی صورت میں متحرک ہیں اور کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔ یہ مسلسل سفر کبھی ختم بھی ہوگا؟ کیا ہم کبھی کسی منزل پر پہنچ بھی سکیں گے؟

چاند نے جواب دیا اے میرے دوستو! اے رات کے وقت آسمان پر چمکنے والے ستارو! اس دنیا کی بنیاد حرکت اور عمل پر ہے۔ یہ اس دنیا کا بہت پرانا قاعدہ ہے۔ خدا نے ہر مخلوق کے سپرد کوئی نہ کوئی ذمہ داری کر دی ہے کہ وہ مخلوق اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے عمل کرنے پر مجبور ہے۔ زمانہ ایک تیز رفتار گھوڑے کی طرح ہے جو ہماری خواہشات کا چابک کھا کر آگے کی طرف دوڑ رہا ہے (یعنی جس طرح گھوڑا چابک کھانے سے تیز دوڑتا ہے اسی طرح دنیا کی ترقی کا انحصار بھی انسان کی طلب پر ہے انسان کے دل میں نئی نئی چیزیں بنانے اور ایجاد کرنے کی طلب پیدا ہوتی ہے تو وہ اس کے لئے کوشش کرتا ہے۔ اور انسان کی کامیابیاں زمانے کو ترقی کے راستے پر آگے کی طرف لے جاتی ہیں) یہ دنیا ایک ایسا راستہ ہے کہ اس پر چلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ یہاں جو لوگ مسلسل چلتے رہتے ہیں (یعنی اپنی کوششوں اور عمل کو جاری رکھتے ہیں) وہ کامیاب ہیں۔ زندگی کے اس راستے پر کہیں رک جانا یا ٹھہر جانا سخت نادانی کی بات ہے اور اگر کوئی ذرا دیر کے لئے رک جائے یعنی محنت اور کوشش کرنا چھوڑ دے تو یہ گویا خود اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا اسی بات کو ایک اور شاعر اصغر گونڈوی نے ایک شعر میں یوں کہا ہے۔

یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یعنی پرندہ اگر اڑنے میں سستی کرے گا تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا ہے اس لئے کہ وہ جیسے ہی اڑنا چھوڑ کر اپنے پر سمیٹ کر زمین کی طرف آئے گا، شکاری اسے اپنے جال میں گرفتار کر لے گا اور وہ بلندی پر پرواز کرتا رہے گا تو اس کی آزادی محفوظ رہے گی۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کی اس دوڑ میں جو مسلسل حصہ لے رہے ہیں یعنی برابر اپنا کام کئے جا رہے ہیں وہ ترقی کر کے بہت آگے نکل گئے ہیں اور جو آرام کرنے یا ستانے کے لئے ذرا دیر کو رک گئے

ین وہ ترقی کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں اس لئے کہ رک جانے والے کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔اس کے لئے مستقل محنت اور مسلسل جدو جہد کی ضرورت ہوتی ہے اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے کہ ایک بہت بڑا مجمع کسی ایک سمت کی طرف بھاگ رہا ہو اور اس کے درمیان کوئی آدمی گر پڑے تو ہجوم کے پیرون تلے آ کر روندا اور کچلا جاتا ہے یہی حال انسانوں اور قوموں کا بھی ہے۔

۴.۳۔ خود آزمائی

(۱) (الف) پرندہ چمکتی ہوئی چیز کو کیا سمجھ کر اڑا تھا؟

(ب) جگنو نے منقار ہوس تیز کرنے سے کسے منع کیا تھا؟

(ج) پتنگوں کے جہاں کا طور کسے کہا گیا ہے؟

(د) گلزار کی مشعل پرندے ہیں یا جگنو؟

(ہ) سوز کس کا ہم نشین ہوتا ہے؟

(و) اوج اور پستی ہم معنی ہیں یا ایک دوسرے کی ضد؟

(ز) قیام بزم ہستی ساز سے ہے یا سوز سے یا دونوں سے؟

(ح) اس نظم میں زیادہ مفصل گفتگو پرندے کی ہے یا جگنو کی؟

(ط) دنیا کی محفل کس چیز سے جمتی ہے؟

(ی) ہم آہنگی کے علاوہ اس نظم کے دو دوسرے عنوانات تحریر کریں۔

۲۔ ذیل میں دیئے گئے الفاظ کے معنی لکھیں۔

نغمہ پیرا، مرغ نوا ریز، منقار ہوس، مستور، صدائے دلربا، قیام بزم ہستی، ظہور اوج وپستی، ہم آہنگی

۳۔ مندرجہ ذیل میں صحیح نشان ☑ لگایئے۔

(۱) اقبال کی نظم ''پرندہ اور جگنو''

(الف) کہانی کی صورت میں ہے۔ (ب) مکالمے کی صورت میں ہے۔

(۲) اقبال کے نزدیک اس دنیا میں طاقتور اور کمزور کے درمیان

(الف) تعاون ہونا چاہئے (ب) نہیں ہونا چاہئے۔

(۳) باہمی تعاون کا کام

(الف) صرف افراد کی سطح پر ہونا چاہئے (ب) افراد اور اقوام دونوں کی سطح پر ہونا چاہئے۔

۴۔ نظم ''پرندہ اور جگنو'' میں

(الف) پندرہ شعر ہیں (ب) بارہ شعر ہیں

۵۔ علامہ اقبال نے نظم ''پرندہ اور جگنو''

(الف) انگلستان جانے سے قبل لکھی تھی (ب) انگلستان جانے کے بعد لکھی تھی۔

۴۔ ۱۔ نظم ''چاند اور تارے''

(الف) محض تفریح طبع کے لئے لکھی گئی ہے۔

(ب) کسی مقصد کے پیش نظر لکھی گئی ہے۔

(ج) اس نظم کے لکھنے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

۲۔ اس نظم میں سوال پوچھنے والا

(الف) ستارے ہیں۔ (ب) چاند ہے۔ (ج) کہکشاں ہے۔

۳۔ اس نظم میں سوال کا جواب

(الف) سورج نے دیا ہے (ب) ہواؤں نے دیا ہے (ج) چاند نے دیا ہے۔

۴۔ نظم ''چاند اور تارے''

(الف) مذہبی نوعیت کی ہے (ب) جنگی نوعیت کی ہے (ج) اصلاحی نوعیت کی ہے۔

۵۔ اس نظم میں زمانے کو

(الف) گھوڑے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

(ب) شیر سے تشبیہ دی گئی ہے۔

(ج) بلی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۶۔ اس نظم میں

(الف) جدوجہد اور کوشش کی تلقین کی گئی ہے۔

(ب) عبادت کی تلقین کی گئی ہے۔

(ج) جہاد کی تلقین کی گئی ہے۔

۷۔ اس نظم میں چاند نے ستاروں کو

(الف) اپنا دشمن کہا ہے۔

(ب) اپنا دوست کہا ہے۔

(ج) ان سے کوئی تعلق ظاہر نہیں کیا۔

۸۔ اس نظم میں دراصل

(الف) ستاروں سے خطاب کیا گیا ہے۔

(ب) برصغیر کے مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے۔

(ج) دونوں میں سے کسی سے خطاب نہیں کیا گیا ہے۔

۹۔ لفظوں کے معنی بتایئے۔

مدام، ستم کش سفر، شجر، مزرعِ اشہب

۴۔ جوابات

1۔ الف۔ جگنو

ب۔ طائر

ج۔ جگنو کو

د۔ جگنو

ہ۔ ساز کا

و۔ ضد

ز۔ دونوں

ح۔ جگنو کی

ط۔ ہم آہنگی

ی۔ تعاون، ایک دوسرے کی مدد وغیرہ

2۔ معانی یونٹ سے دیکھئے

3۔ 1۔ ب

2۔ الف

3۔ ب

4۔ ب

5۔ الف

4۔ 1۔ ب

2۔ الف

3۔ ج

4۔ ج

5۔ الف

6۔ ب

7۔ ب

8۔ مدام: ہمیشہ

ستم کش سفر: سفر کی تکلیف اٹھانے والا

حجر: پتھر

مزرع: کھیتی

اشہب: گھوڑا

یونٹ ۔ ۷

اقبال اور نئی نسل

(نظمیں)

۱۔ خطاب بہ جوانانِ اسلام

۲۔ ایک نوجوان کے نام

تحریر:

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین

فہرست

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
230	تعارف	
230	مقاصد	
231	اقبال اور نئی نسل	۱۔
237	نظم ۔خطاب بہ جوانان اسلام	۲۔
237	۲.۱۔ تعارف	
237	۲.۲۔ نظم کا متن: خطاب بہ جوانان اسلام	
239	۲.۳۔ توضیحات وتشریحات	
248	نظم ''ایک نوجوان کے نام''	۳۔
248	۳.۱۔ تعارف	
248	۳.۲۔ نظم کا متن: ایک نوجوان کے نام	
249	۳.۳۔ توضیحات وتشریحات	
253	۳.۴۔ خود آزمائی	
255	۳.۵۔ جوابات	

تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

اقبال کو نوجوانوں سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ ان کی عمدہ تعلیم وتربیت کے لئے فکر مند تھے۔ انہوں نے نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے متعدد نظمیں لکھیں اور کئی متفرق اشعار میں بھی ان کو نصیحتیں کیں۔ ان نظموں اور شعروں کے مطالعے سے ملت کے نوجوان فکری اور اخلاقی ترقی کے راستے پر گامزن ہو سکتے ہیں اس یونٹ میں اقبال کی دو نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ جن میں اقبال نے اپنے مخصوص پیرائے میں نوجوانوں کو پند ونصیحت کی ہے۔

مقاصد

اس یونٹ کو پڑھنے کے بعد امید ہے آپ اس قابل ہوسکیں گے کہ:

(۱) نوجوانوں کے لئے اقبال کے ہمدردانہ رویے کو ملاحظہ کریں۔

(۲) اپنے شاندار ماضی پر فخر کر کے حال اور مستقبل کو بہتر بنانے کی فکر کریں۔

(۳) تن آسانی کو ترک کر کے محنت اور جفاکشی کی وہ روش اپنائیں جس کی اقبال نے بار بار تلقین کی ہے۔

(۴) اقبال کی شاعری کی فنی خصوصیات جان سکیں اور اس پر یونٹ میں شامل نظموں کے اشعار کی تشریح کرسکیں۔

۱۔ اقبال اور نئی نسل

اقبال کو شاعرِ فردا کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں "کل کا شاعر" یعنی اقبال کی توجہ حال سے زیادہ مستقبل پر ہے ان کا دل اس یقین سے مالا مال ہے کہ آنے والا کل زیادہ روشن اور اجلا ہوگا۔ حال کی محرومیوں اور ناکامیوں سے وہ پست ہمت ہونا نہیں جانتے اور ہر حالت میں مستقبل کے روشن امکانات پر نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ہر عمر کے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی نوجوانوں سے ہمکلام ہونے میں خاص کشش محسوس کرتے ہیں وہ اگر ایک طرف اپنے دور کے بوڑھے لوگوں سے مایوس تھے تو دوسری طرف ملت کے نوجوانوں سے انہیں امید تھی کہ وہ عزم و ہمت سے کام لے کر حالات کو بہتر بنا سکیں گے۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کہ نوجوان ان کے پیغام کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ اس سلسلے میں ان کی دعائیں ان کے دل کی تمنا کی ترجمانی کرتی ہیں۔

ایک مقام پر اس طرح دعا کرتے ہیں۔

جوانوں کو پیروں کا استاد کر (۱)

اسی نظم میں کہتے ہیں

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے (۲)

ایک جگہ وہ خدا کے حضور جوانوں کے لئے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جوانوں کو میری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے (۳)

---

(۱) کلیاتِ اقبال، اردو ص ۴۱۶ (۲) ایضاً ص ۴۱۶ (۳) کلیاتِ اقبال اردو ص ۳۷۸

اقبال نوجوانوں پر اس لئے بھی توجہ دیتے ہیں کہ ان میں کسی پیغام کو قبول کرنے کی نہ صرف صلاحیت ہوتی ہے بلکہ اس کے مطابق زندگی کو تعمیر کرنے کا جذبہ اور عزم بھی ہوتا ہے۔ عمر رسیدہ اور بوڑھے لوگ بے شک پختہ کاری اور تجربے کی وسعت کے اعتبار سے فضیلت رکھتے ہیں۔ ان کا ادب احترام اپنی جگہ پر لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ زندگی کی ایسی منزل پر ہوتے ہیں جہاں ان کے لئے کسی بڑی تبدیلی کو خوش آمدید کہنا عام طور پر مشکل ہوتا ہے۔ وہ ہر مرحلے پر نفع اور نقصان کے احساس میں ڈوبے رہتے ہیں جس سے حرکت وعمل پر منفی اثر پڑتا ہے۔ ان میں کسی بڑے مقصد کے لئے جان و مال کی قربانی کا جذبہ بھی سرد ہوتا ہے اس کے برعکس جوانوں میں امنگ اور ولولے کی فراوانی ہوتی ہے وہ کسی نئے سانچے میں ڈھلنے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں۔ جوانوں کی طاقت اور ہمت انہیں اس قابل بناتی ہے کہ وہ مخالف حالات کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ ان کی بے قرار طبیعت انہیں ہر دم حرکت پر آمادہ رکھتی ہے اس لئے ملت کی تعمیر نو میں ان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے خیال میں کسی قوم کی ترقی وعروج کا باعث مال و دولت کی کثرت نہیں ان نوجوانوں کا وجود ہے جو ذہنی اور جسمانی اعتبار سے صحتمند ہوں اور پاکیزہ اخلاق و کردار کے مالک ہوں۔

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر	نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مال او فرزند ہائے تندرست	تر دماغ وسخت کوش وچاق وچست[1]

ترجمہ: اے صاحب نظر قوم کا سرمایہ روپیہ پیسہ، لباس، چاندی اور سونا نہیں ہوتا۔ اس کی اصل دولت تندرست، ذہین، محنتی، چاق و چوبند نوجوان ہوتے ہیں۔

ذہین اور محنتی نوجوان ہی ہمیشہ زندگی کے اعلیٰ اصولوں کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہوتے ہیں ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس میں طاقت اور قوت کے بغیر رہنا محال ہے محض اچھے نظریات اور نیک خواہشات سے آبرومندانہ زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ فرد ہو یا قوم اس کی بقاء اور استحکام کا دارومدار اس کی قوت پر ہے۔ اسے ہر

---

(۱) کلیات اقبال، فارسی، ص ۱۵۱

قدم پر مخالف حالات سے دو چار ہونا پڑتا ہے اگر وہ دفاع کی صلاحیت سے محروم ہے اور حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت اس میں نہیں تو اس کا وجود کبھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ کمزور کے لئے بچاؤ کا صرف یہی راستہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمانے کے تیز دھارے کے سپرد کر دے اور اپنے آپ کو ماحول کے سانچے میں ڈھال لے جبکہ قوی اور طاقتور ماحول کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ اس لئے اقبال انقلاب کی دعوت دیتے ہیں اور کشمکش اور پیکار کی تلقین کرتے ہیں ان کے خیال میں اس کے بغیر زندگی ارتقاء کی منزلیں طے نہیں کر سکتی (۱)۔ لیکن اس پیکار کا مقصد سیاسی اور مادی غلبہ نہیں بلکہ اخلاقی اصولوں کا غلبہ ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے محض اخلاقی زاویہ نگاہ سے تصادم و پیکار کو ضروری قرار دیا ہے (۲)۔ یہ اخلاقی اصول دین اسلام کے عطا کردہ ہیں ان کے فروغ کے لئے تلقین اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ عملی جدوجہد بھی کرنا پڑتی ہے اگر غلبہ دین کے لئے حرکت و عمل سے کنارہ کشی اختیار کی جائے گی اور محنت و مشقت سے کام نہ لیا جائے تو باطل قوتوں کا مقابلہ ممکن نہ ہوگا۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ "مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے" (۳)۔ اور یہ کہ جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے" (۴)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال قوت برائے قوت کے قائل نہیں وہ قوت کو انسانیت کی حفاظت اور اچھے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے حامی ہیں۔

اقبال کا خیال ہے کہ نوجوانوں میں یہ قوت زیادہ پائی جاتی ہے وہ مخالف قوتوں اور ناموافق حالات سے ٹکر لینے کی ہمت رکھتے ہیں ان میں کشمکش اور تصادم کی جرأت ہوتی ہے ان کے رگ و پے میں جو تازہ اور گرم خون دوڑ رہا ہے وہ انہیں یہ اہلیت بخشتا ہے کہ وہ ان خطرات کا مقابلہ کریں، مشکلات پر قابو پائیں اور سخت کوشی سے زندگی کی تلخیوں کو خوشگوار بنائیں۔

---

(۱) اقبال نامہ، حصہ اول ص ۴۶۵ (۲) ایضاً ۴۷۲ (۳) شذرات فکر اقبال، ص ۱۳۲ (۴) اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۴۶۱، ۴۶

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبین (۱)

سخت کوشی اور خطر پسندی کو فکر اقبال میں جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خودی کی نشو ونما کے لئے قوت اور حرکت کا وجود لازمی ہے۔ ضعف اور کمزوری سے خودی کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ امر یقیناً دلچسپ ہے کہ اقبال نے جب خودی کا نظریہ تخلیق کیا جس میں قوت کے حصول پر زور دیا گیا ہے تو اس وقت اقبال کی جوانی کا زمانہ تھا یہی نظریہ مثنوی اسرار خودی (۱۹۱۵ء) کی صورت میں منظر عام پر آیا اور ان کی باقی عمر اس کی تشریح و توضیح کرتے گزری دور جوانی کے ساتھ اس نظریہ کی وابستگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ جوان لوگ ہی اس پر صحیح معنوں میں عمل کر سکتے ہیں فکر اقبال کو عہد شباب اور جوانوں سے جو گہرا تعلق ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں۔

''جاوید نامہ'' ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر آیا جبکہ جاوید اقبال کی عمر آٹھ سال سے زیادہ نہ تھی یعنی اگر ''جاوید نامہ'' فارسی کے بجائے اردو میں ہوتا تو بھی جاوید کے لئے اس کا پڑھنا اور سمجھنا ممکن نہ تھا اس کے باوصف انہوں نے فارسی کے اس مجموعہ کلام کا نام ''جاوید'' کی نسبت سے ''جاوید نامہ'' رکھا اس کے آخر میں ''خطاب بہ جاوید'' کے عنوان سے ایک طویل دعائیہ نظم بھی شامل کی ہے۔ اس نظم کا مخاطبہ (۲) جاوید سے ہے اور یقیناً علامہ اقبال یہ بھی چاہتے تھے کہ اس کا بیٹا اس نظم کے مطالب سے بے نیاز نہ رہے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد اس کو پڑھے، دوسروں سے سمجھے اور اپنے فکر و عمل کا جزو بنائے لیکن جاوید کا نام محض علامت یا مثال کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ حقیقت میں اقبال کا تخاطب اس نظم میں جاوید کے حوالہ سے پوری نژاد نو (۳) سے ہے۔ یہ بات یونہی نہیں کہی جا رہی بلکہ ''خطاب بہ جاوید'' کے نیچے قوسین کے اندر ''سخنے بہ نژاد نو'' کے الفاظ بھی درج ہیں۔ (۴)

---

(۱) تلخ زندگانی، زندگی کی تلخی یعنی دکھ اور مصیبت۔ انگبین، شہد دل پسند (۲) خطاب (۳) نئی نسل

(۴) اقبال سب کے لئے ص ۴۹۰، ۴۹۱

خطاب بہ جاوید یعنی ''سخنے بہ نژادِ نو'' میں اقبال نے نئی نسل کی حالت و کیفیت کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اور نوجوانوں کی خامیوں پر روشنی ڈال کر انہیں اخلاق و کردار کی تعمیر کی طرف توجہ دلائی ہے اور تلقین کی ہے وہ مایوسی کی بجائے امید اور بے یقینی کی بجائے یقین کی دولت سے مالا مال ہوں۔ بے مقصد زندگی گزارنے کی بجائے بامقصد زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں۔ نفس پرستی ترک کر کے ضبطِ نفس کی روش اختیار کریں۔ مغربی تہذیب کی تقلید کے بجائے وہ اخلاقی اصول اپنانے پر آمادہ ہوں جن کی تلقین مشرق کے داناؤں نے کی ہے، اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کریں، علم و حکمت کی تحصیل میں سرگرم ہوں، آدمیت کا احترام اور رسولؐ اللہ کی محبت کو شعارِ زندگی بنائیں۔ اس جامع نظم میں اقبال نے وہ تمام نصیحتیں شامل کر دی ہیں جو ان کے نزدیک نوجوانوں کے لئے ضروری ہیں اور جن پر عمل کر کے وہ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں اور اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں جن کی بدولت کائنات میں تحقیق و جستجو کے کام کو آگے بڑھا کر تسخیرِ شمس و قمر کا فرض ادا کیا جا سکے جو اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے ان پر عائد ہوتا ہے۔

اقبال کو نوجوانوں سے گلے اور شکایتیں بھی ہیں۔ انہیں اس بات پر افسوس تھا کہ مسلمان نوجوانوں کے ذہن مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہیں، نئی تعلیم نے انہیں ایمان کی لذت اور اسلام کی صداقت پر یقین سے محروم کر دیا ہے ان میں تنقیدی صلاحیت نہیں ہے۔ ان سے ذوقِ تحقیق رخصت ہو چکا ہے۔ اندھی تقلید کی عادت نے اس سے نئی باتیں دریافت کرنے اور نئی چیزیں ایجاد کرنے کی صلاحیت چھین لی ہے وہ تن آسان اور بے عمل ہو چکے ہیں عیش و راحت کی طلب نے ان کی قوتِ عمل کو زنگ آلود کر دیا ہے، روحانی اور اخلاقی پستی نے انہیں تن پروری (1) اور نفس پرستی ایسی بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ اقبال کے خیال میں نوجوانوں کی ان تمام خامیوں کا سبب یہ ہے کہ بوڑھے لوگوں نے ان کی مناسب تربیت نہیں کی اس لئے اقبال اپنے زمانے کے لوگوں کو اس اہم کام کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے'' یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی اکثر و بیشتر کتابوں میں نوجوانوں کی تربیت کی غرض سے اشعار اور نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں چند خاص نظمیں یہ ہیں خطاب بہ

---

(1) جسم کی پرورش کرنا

نو جوانانِ اسلام (بانگ درا) خطاب بہ جاوید (جاوید نامہ) ایک نوجوان کے نام (بال جبریل) جاوید کے نام (بال جبریل) ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام (ضرب کلیم) جاوید سے (ضرب کلیم) اس کے علاوہ بال جبریل کی نظم ''نصیحت'' ضرب کلیم کی نظم ''محراب گل افغان کے افکار، ارمغان حجاز کی نظموں ''نہنگ با بچہ خویش'' بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو'' میں بھی اقبال نے جو خیالات پیش کیے ہیں ان کا تعلق نوجوانوں کی تربیت ہی سے ہے۔ اقبال نے ان نظموں اور دیگر بہت سے متفرق اشعار میں نوجوانوں کو جو نصیحتیں کی ہیں ان کا نچوڑ کچھ اس طرح سے ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی خودی سے آگاہ ہوں۔ اپنی فطری صلاحیتوں سے واقف ہوں۔ اور ان کی نشو و نما کیلئے محنت کریں۔ سخت کوشی اور خطر پسندی کی عادت اپنائیں۔ تن آسانی سے گریز کریں۔ خطروں سے الجھنے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کریں۔ اسلام کے روحانی اور اخلاقی اصولوں کو اپنائیں اور شریعت کی عائد کردہ پابندیوں کو دل و جان سے قبول کریں صرف اسی صورت میں انہیں وہ آزادی مل سکتی ہے جو ان کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی فائدہ مند ثابت ہوگی۔ ناموافق حالات سے مایوس نہ ہوں۔ ملت کے روشن مستقبل پر یقین رکھیں اور دنیا میں عزت سے زندہ رہنا اور مرنا سیکھیں۔

اقبال نے نوجوانوں کو اپنی تاریخ سے آگاہ ہونے کی ہدایت بھی کی ہے۔ ان کے خیال میں تاریخ کسی قوم کے حافظے کی مانند ہے حافظے سے محرومی کا نتیجہ تباہی و بربادی ہے۔ آباؤ اجداد کے کارناموں سے واقفیت کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بیجا فخر میں مبتلا ہو کر نکمے بن کر بیٹھ جائیں بلکہ ہم میں یہ احساس پیدا ہونا چاہئے کہ ہم ایک عظیم قوم کی شاندار روایات کے وارث ہیں لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم ان روایات کو ترقی دیں تاکہ ہماری قوم از سر نو عظمت سے ہمکنار ہو سکے۔

اقبال نے نوجوانوں کو دوسری قوموں کی تہذیبی و علمی ترقی سے آگاہ ہونے کی ہدایات کی ہیں لیکن یہ بھی تاکید کی ہے کہ وہ کسی سے مرعوب نہ ہوں، کسی کی اندھی تقلید نہ کریں مشرق ہو یا مغرب وہ سب پر تنقیدی نظر ڈالیں اچھی چیزوں کو قبول کریں اور اسی سلسلے میں اسلام کی اخلاقی و روحانی تعلیمات کو ہرگز نظر انداز نہ کریں، عصر حاضر کی علمی و سائنسی ترقی کی داغ بیل مسلمانوں نے ہی ڈالی تھی اگر ہم اپنے آباؤ اجداد کی علم دوستی اور تحقیقی ذوق اپنے اندر پیدا کریں تو ہم علمی و سائنسی ترقی میں اپنا مقام پیدا کر سکتے ہیں۔

۲۔ خطاب بہ جوانانِ اسلام

۲.۱۔ نظم کا تعارف

بارہ شعروں کی یہ پر تاثیر نظم بعض دوسرے قطعات و اشعار کے ساتھ ۱۹۱۲ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی تھی یہ بانگ درا کے حصہ سوم میں شامل ہے۔ جو ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے اور اس سے اقبال کے جذبہ ملی کا اندازہ ہوتا ہے اس کے ذریعے اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں کو احساس دلائیں کہ زمانہ ماضی میں مسلمانوں کی ترقی و عروج کا باعث ان کا عمدہ اخلاق اور پختہ کردار تھا اور اس کی بدولت انہیں پوری دنیا میں امتیازی شان حاصل تھی لیکن نئی نسل اپنے بزرگوں کی تہذیبی روایت سے ناواقف ہے اس رویے نے مسلمانوں کو زوال سے دوچار کر رکھا ہے۔ نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی اور اپنے بزرگوں کی حالت کا موازنہ کریں اپنی اصلاح کریں اور نئے سرے سے عروج حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

۲.۲۔ نظم کا متن

خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ

سماں، الفقر فخری، کا رہا شانِ امارت میں
"بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را"

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

"غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را"

۲.۳۔ توضیحات وتشریحات

پہلا شعر: معانی: تدبر، غور وفکر، گردوں، آسمان مراد۔ قوم

تشریح: اقبال مسلمان نوجوان سے کہتے ہیں کہ کیا تو نے کبھی اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ تو کون سے آسمان کا ٹوٹا ہوا تارا ہے؟ یعنی تو کس قوم سے تعلق رکھتا ہے، تیرے آباؤ اجداد کون تھے؟ انہوں نے اپنے زمانے میں کیا کارنامے انجام دیئے؟ اس طرح اقبال نوجوانوں کی غفلت پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ انہوں نے کبھی یہ جاننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ ان کے بزرگوں نے ماضی میں تہذیب وتمدن کے میدان میں لائق رشک ترقی کی تھی۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شاعر نے ماضی میں مسلمان قوم کی بے مثال ترقی اور شان وشوکت کی بناء پر اسے آسمان کہہ کر پکارا ہے اور موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی حالت کے پیش نظر نوجوان کو "ٹوٹا ہوا تارا" قرار دیا ہے۔ جیسے تارا ٹوٹ کر آسمان سے دور اور زمین کی پستی کے قریب ہو جاتا ہے اور اپنا بلند مقام کھو دیتا ہے۔ اسی طرح مسلمان نوجوان اپنی قومی روایات سے ہٹ کر اپنے مقام سے محروم ہو چکے ہیں۔

دوسرا شعر　　معانی:　　آغوشِ محبت: پیار بھری گود

تاج سر دارا:　　دارا کے سر کا تاج مراد ایرانی حکومت و سلطنت، دارا ایران کا بادشاہ تھا جس کو سکندر اعظم نے شکست دی تھی۔

تشریح: پہلے شعر میں اقبال نے مسلمان نوجوان سے جو سوال کیا تھا اس شعر میں خود ہی اس کا جواب دے رہا ہے کہ اے نوجوان تجھے ایسی قوم نے اپنی پیار بھری گود میں پروان چڑھایا ہے جس نے دارا جیسے عظیم الشان فرمانروا کا تاج پاؤں میں روند ڈالا تھا۔ اس شعر میں اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے انتہائی بے سروسامانی اور قلتِ تعداد کے باوجود حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے دور میں اس ایرانی حکومت کو ختم کر دیا تھا جو اپنے وقت کی بہت بڑی طاقت تھی اور جس کے حکمران دارا کے وارث ہونے پر فخر کرتے تھے۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور مسلمانوں کا ایک حیرتناک کارنامہ تھا۔ اس کامیابی نے دشمن قوتوں پر مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی تھی۔

تیسرا شعر:　　معانی:　　تمدن آفریں: تمدن پیدا کرنے والا

خلاق آئینِ جہانداری:　　حکمرانی کا دستور اور طریقہ بنانے والے

خلاق:　　بہت پیدا کرنے والا

شتربان: اونٹ پالنے والا

گہوارہ: پنگھوڑا مراد ہے علاقہ اور وطن

تشریح: اقبال اس شعر میں ابتدائی دور کے مسلمانوں کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ وہ صحرا میں زندگی بسر کرنے والے لوگ تھے جن کا کام اونٹ چرانا تھا اور دنیا کے لوگ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن اسلام قبول کرنے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے سے ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ملا انہوں نے دنیا کو ایک نئی تہذیب اور نیا تمدن بخشا اور عالم انسانیت پر ایک احسان یہ کیا کہ حکمرانی کا ایسا دستور تیار کیا اور ایسے طرزِ حکومت کی بنیاد رکھی جس نے حکومت کو عام لوگوں کی خدمت کی

خدمت کی صورت دے دی۔ قانون کی حکمرانی کو رواج دیا اور عدل و انصاف کی شاندار روایت قائم کی۔

چوتھا شعر: معانی: الفقر فخری : ایک طویل حدیث نبوی کا جزو ہے۔

فقر میرے لئے باعث فخر ہے۔

امارت: امیری، دولتمندی

آب: چمک رنگ: مراد ہے غازہ اور سرخی

خال: تل، خط: ابرو کے مقام پر لکیر بنانا

روئے زیبا: خوبصورت چہرہ

با آب و رنگ و خال چہ حاجت روئے زیبا را: یہ مصرعہ مشہور فارسی شاعر خواجہ حافظ شیرازی کا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جو چہرہ فطری طور پر خوبصورت ہو اسے سجانے کے مصنوعی طریقوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تشریح: حضور نبی کریم ﷺ دین و دنیا کے خزانوں کے مالک تھے اگر چاہتے تو زندگی بے حد آرام و راحت سے گزار سکتے تھے۔ لیکن آپ کو دنیا کے ساز و سامان اور مال و دولت کی خواہش نہ تھی۔ آپ کی نظر ہمیشہ آخرت کی زندگی پر لگی رہتی تھی اس لئے ساری زندگی فقر و درویشی میں گزار دی فقر آپ کو دل سے پسند تھا لیکن اس فقر میں بھی آپ کی ایک شان تھی جس کے سامنے قیصر و کسریٰ کی عظمت بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ آپ نے عملی نمونے سے ثابت کر دیا کہ بڑائی اور بزرگی ظاہری شان و شوکت پر منحصر نہیں۔ ابتدائی دور کے مسلمان ہی آپ کی پیروی میں سادہ اور پر مشقت زندگی بسر کرتے تھے کردار کی پختگی اور اخلاق کی بلندی کی بناء پر انہیں کسی قسم کی آرائش و زینت کی ضرورت نہیں تھی۔ یوں بھی فطری حسن کے لئے بناوٹی آرائش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خواجہ حیدر علی آتش کا شعر ہے۔

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی

قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

خود اقبال نے ایک اور مقام پر یہ مفہوم اس مصرعہ میں ادا کیا ہے۔

چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش[1]

پانچواں شعر: معانی: گدائی، غریبی، محتاجی۔ غیور: غیرمند

منعم: امیر، دولتمند، سخی۔ یارا، ہمت

تشریح: وہ لوگ اس قدر غیرت مند اور خوددار تھے کہ اس قدر غربت اور تنگدستی کے باوجود وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا گوارا نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی دولتمند ان کی غریبی سے متاثر ہو کر ان کی مدد کرنے کا خواہشمند ہوتا تو اس کے دل میں فوراً یہ خیال گزرتا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ میری مدد کو قبول کرنے سے انکار کر دیں اس بنا پر وہ سخاوت اور بخشش سے باز رہتا گویا محتاجی کی حالت میں بھی وہ کسی کا احسان اٹھانے کے قائل نہیں تھے لہذا کسی امیر آدمی کو ان کی خدمت میں کچھ پیش کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اس سے اقبال نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ بھی غیرت اور خودداری کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ محنت اور مشقت اختیار کریں اور دوسروں کا دست نگر ہونا چھوڑ دیں اگر خودی کی حفاظت کریں تو غریبی کے باوجود بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک اور جگہ اقبال نوجوان سے کہتے ہیں۔

تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی[2]

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر[3]

---

(۱) گلگونہ بیچنے والا، گلگونہ سرخی مائل سفوف جو چہرے کی سجاوٹ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پاؤڈر

(۲) کلیات اقبال، اردو، ص ۳۸۱ (۳) کلیات اقبال، اردو، ص ۴۳۹

چھٹا شعر: معانی: صحرانشیں :صحرا میں رہنے والے لوگ

جہاں گیر: دنیا فتح کرنے والے

جہاں دار: دنیا پر حکومت کرنے والے

جہاں بان: دنیا کی نگہبانی کرنے والے

جہاں آرا: دنیا کو سجانے والے

تشریح: اقبال کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی صفات کو تفصیل سے بیان نہیں کر سکتا۔ ان کی زندگی دشت و صحرا میں گزری مگر حضورؐ کی تربیت نے بدوؤں اور شتربانوں کو دنیا کا رہنما اور حکمران بنا دیا۔ انہوں نے دنیا کا بہت بڑا حصہ فتح کر کے وہاں نئی طرز کی حکومت قائم کی۔ مفتوحہ علاقوں کے انتظام کو درست کیا، شہر آباد کیے۔ زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت کو ترقی دی، علوم وفنون کی سرپرستی کی، قوموں کو امن وسکون اور خوشحالی بخشی، عوام کی فلاح و بہبود کے کام کے لئے ایسے منصفانہ اصول وقوانین بنائے ن سے مظلوموں کی حق دہی میں آسانی پیدا ہوئی۔ ہر اعتبار سے یہ تاریخ انسانی کا سنہری دور تھا دوسرے مصرعے میں شاعر نے جہاں گیر، جہاں دار، جہاں بان اور جہاں آرا چار ایسے لفظ استعمال کیے ہیں جو بظاہر ہم معنی ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان میں نازک اور لطیف فرق دکھائی دے گا اور پھر ان چار لفظوں میں شاعر نے بہت وسیع معنی سمو کر کمال فن کا ثبوت دیا ہے۔

ساتواں شعر: معانی: تخیل: خیال، تصور

فزوں تر: بڑھ کر، زیادہ بلند، زیادہ وسیع

تشریح : اقبال کہتے ہیں کہ انہیں قدرت نے زبان و بیان کی ایسی صلاحیت بخشی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو لفظوں میں ان بزرگوں کی اعلیٰ صفات اور شاندار کارناموں کی تصویر کھینچ کر رکھ دیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ صفات اتنی بلند ہیں اور کارنامے اتنے بڑے ہیں کہ دور زوال میں آنکھ کھولنے والے نوجوان ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح اقبال نوجوانوں کو احساس دلاتے ہیں کہ

وہ اپنے آباؤاجداد سے کس قدر پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ اقبال کا کمالِ فن ہے کہ انہوں نے نہایت مختصر اور عمدہ انداز میں اسلاف کی عظمت بیان کردی ہے۔

آٹھواں شعر: معانی : آبا : باپ دادا، بزرگ
گفتار: بات چیت، محض باتیں ہی باتیں
ثابت: وہ ستارا جو گردش نہ کرے مراد بے عمل انسان
سیارہ: وہ ستارا جو گردش کرے مراد باعمل آدمی

تشریح: اقبال مسلمان نوجوان سے کہتے ہیں کہ تمھیں اپنے باپ دادا سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی ان کے اور تمہارے درمیان بہت فرق ہے تم محض باتیں بنانے کے عادی ہو اور ان سے نسبت پر اظہارِ فخر کو کافی سمجھتے ہو جبکہ وہ حرکت و عمل پسند کرتے تھے تم گفتار کے غازی ہو وہ کردار کے غازی تھے۔ تم نے محنت ومشقت سے ہاتھ اٹھالیا ہے اور بے عملی کا شکار ہوئے ہو جبکہ تمہارے بزرگ ہمیشہ اسلام کے غلبہ کے لئے حرکت میں رہتے تھے ان کی اس صفت نے انہیں ساری دنیا میں معزز بنا دیا تھا "جوابِ شکوہ" میں اقبال نے مسلمانوں کی اس خامی کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا ہے۔ ایک مقام پر کہتے ہیں۔

تم ہو گفتار سراپا وہ سراپا کردار[1]
تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستان بکنار
ہر کوئی مست مئے ذوق تن آسانی ہے
تم مسلمان ہو یہ اندازِ مسلمانی ہے[2]
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو[3]

---

(۱) کلیاتِ اقبال اردو ص ۲۰۴ (۲) کلیاتِ اقبال اردو، ص ۲۰۳ (۳) ایضاً، ص ۲۰۱

نواں شعر: معانی: اسلاف: سلف کی جمع مراد اگلے وقتوں کے لوگ، بزرگ، میراث، ورثہ

ثریا: سات ستارے جو پاس پاس چمکتے نظر آتے ہیں ان کو سات سہیلیوں کا جھرمٹ اور پروین بھی کہتے ہیں۔

تشریح: اقبال ملت کے زوال کا ایک اہم سبب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ملت اسلامیہ کو اپنی محنت کی بدولت عروج بخشا تھا۔ یہ چیز ہمیں ورثے میں ملی تھی اگر ہمیں اس کی قدر ہوتی تو ہم ہر حال میں اسکی حفاظت کرتے اور بزرگوں کی طرح مزید ترقی کرتے رہتے لیکن بدقسمتی سے ہم نے اس ورثے کی حفاظت سے غفلت برتی اور عیش وعشرت میں پڑ گئے۔ پختہ ایمان، بلند کردار اور عزم و ہمت کو خیر باد کہہ دیا جس کے نتیجے میں آسمان نے ہمیں ثریا کی بلندی سے زمین کی پستی میں گرا دیا ہم زوال کے شکار ہوئے۔ سلطنت ہمارے ہاتھ سے نکل گئی اور ہم غیروں کی غلامی میں مبتلا ہو گئے۔ شعر میں شاعر نے آسمان سے تقدیر یا قسمت مراد لی ہے جو روایتی شاعری کی رو سے عام طور پر انسانوں کے مصائب کا باعث بنتے ہیں اور ''ثریا'' سے بلندی اور عروج مراد لیا ہے۔ نظم ''جواب شکوہ'' میں اقبال کہتے ہیں:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو　　　پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو

دسواں شعر: معانی: عارضی: جو ہمیشہ رہنے والا نہ ہو، ناپائیدار

آئین مسلم: وہ قانون یا اصول جسے سب مانتے ہوں

چارا: علاج

تشریح: یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان کبھی حکومت وسلطنت کے مالک تھے۔ ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں بھی ان کی حکومتیں قائم تھیں لیکن اب یہ سب کچھ ان سے چھن چکا ہے۔ یہ محرومی قابل افسوس ہے لیکن دانشمند لوگ حکومت چھن جانے پر زیادہ پریشان نہیں ہوتے کیونکہ یہ عارضی اور ناپائیدار ہے۔ آج ی کے پاس ہے کل کسی اور کے پاس ہوگی یہ فطرت کا قانون ہے اور اس سے کوئی قوم نہیں بچ سکتی۔ اگر

حکومت کسی کے پاس ہو تو اسے مغرور نہیں ہونا چاہئے اور اگر چھن جائے تو اس پر رنجیدہ اور غمگین ہونا مناسب نہیں۔ انسانیت کی خدمت کرنے اور اپنی عظمت منوانے کے اور بھی طریقے ہیں مثلاً عمدہ اخلاق اور علم کی تلاش و جستجو وغیرہ۔ ہمیں چاہئے تھا کہ ہم ان طریقے کو ترک نہ کرتے لیکن ہم نہ اخلاقی برتری قائم رکھ سکے اور نہ علم کے فروغ اور ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکے۔

گیارہواں شعر: معانی: سیپارا: سی: تیس پارا: ٹکڑا: تیس ٹکڑے

قرآن کے ایک حصے کو بھی پارا کہتے ہیں اور دل کا سیپارا ہونے سے مراد دل کا شدید رنج و غم ہے۔

تشریح: اقبال کہتے ہیں کہ حکومت کھو جانے کا اتنا افسوس نہیں جتنا علمی ورثے کا ہاتھ سے نکل جانے کا ہے۔ یعنی مسلمان عالموں فلسفیوں اور سائنس دانوں نے مختلف موضوعات پر جو کتابیں تصنیف کی تھیں اور جن سے کسی زمانے میں ہماری لائبریریوں کی رونق قائم تھی ہمارے طالبان علم جن سے فائدہ اٹھاتے تھے ہماری غفلت کی بنا پر علمی و تحقیقی کتابوں کا یہ قیمتی خزانہ یورپ منتقل ہو گیا۔ اہل یورپ نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ان کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا۔ تعلیمی اداروں میں ان کی تدریس کا اہتمام کیا اور اس طرح یورپ کی علمی ترقی کی راہ ہموار کی۔ اقبال یورپ گئے تو انہوں نے وہاں کی بڑی بڑی لائبریریوں میں یہ کتابیں دیکھیں تو انہیں دکھ ہوا کہ ہم اپنے بزرگوں کے اس قیمتی سرمائے کی حفاظت نہ کر سکے۔

بارہواں شعر: معانی: پیر کنعان: کنعان کا بوڑھا مراد حضرت یعقوب علیہ السلام

نور دیدہ اش: اس کی آنکھ کا نور۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھ کا نور مراد حضرت یوسف علیہ السلام

تشریح: اقبال بعض اوقات بات سمجھانے کے لئے فارسی شاعروں کے شعر یا مصرعے اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں اس کو تضمین کرنا کہتے ہیں۔ اقبال نے اس نظم میں مشہور فارسی شاعر ملا محمد طاہر غنی کشمیری کا یہ ''شعر تضمین کیا ہے اس لیے اس کو واوین ('' '') میں دیا ہے۔ شعر کا ترجمہ یہ ہے ''اے غنی کنعان کے بوڑھے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بدنصیبی کو دیکھ کہ ان کی آنکھ کے نور یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن سے زلیخا کی آنکھ روشن ہو رہی ہے''۔

نظم کے موضوع کے حوالے سے یہ شعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جو کتابیں تصنیف کی تھیں ہم اپنی بدنصیبی سے ان کی حفاظت نہ کر سکے اور ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے نتیجہ یہ کہ یورپ والے ان کتابوں کو اپنے ہاں لے گئے اور انہوں نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس امر کو خود یورپ والے بھی مانتے ہیں کہ ان کی علمی و سائنسی ترقی مسلمانوں کی تحقیقات کی احسان مند ہے۔

۳۔ ایک نوجوان کے نام

۳.۱۔ تعارف

چھ شعروں کی یہ مختصر نظم بال جبریل میں شامل ہے۔ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے یہ نظم کسی خاص نوجوان کو مخاطب کر کے کہی ہے لیکن انہوں نے اس نظم میں جو باتیں کہی ہیں وہ عموماً ہمارے ان نوجوانوں میں صادق آتی ہیں۔ جو مغرب سے بہت زیادہ متاثر ہیں مغربی تہذیب کی اندھی تقلید نے ان کی صلاحیتوں کو ناکارہ کر دیا ہے۔ وہ مال و دولت کی فراوانی اور دنیاوی شان و شوکت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں جب کہ سچے مسلمانوں نے ہمیشہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ترجیح دی ہے اور اللہ پر ایمان کی بدولت بے نیازی کی روش اپنا کر بلند مقام حاصل کیا ہے۔

۳.۲۔ ایک نوجوان کے نام

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں!

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں!

۳.۴۔توضیحات وتشریحات

پہلا شعر: معانی: افرنگی: انگریزی، مغربی

لہو رلانا: خون کے آنسو رلانا۔ رنج وغم کی شدت مراد ہے۔

تشریح: اقبال کہتے ہیں اے نوجوان کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تو نے محنت ومشقت کی زندگی کو خیر باد کہہ دیا ہے اور عیش وراحت کی روش اختیار کرلی ہے۔ مال ودولت کی فراوانی نے تجھے راحت پسند بنا دیا ہے تو نے اپنے گھر کو دیدہ زیب اور آرام دہ چیزوں سے آراستہ کرلیا ہے انگریزی صوفوں پر آرام کرنے اور ایرانی قالینوں پر چلنے سے تو اپنی جفاکشی اور سخت جانی سے محروم ہو چکا ہے۔ تیری یہ حالت دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے اور میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

دوسرا شعر: معانی: شکوہ خسروی: خسرو کی شان وشوکت۔ خسرو ایران کے ایک بادشاہ کا نام ہے۔

زور حیدری: حضرت علیؓ کی شجاعت، حیدر حضرت علیؓ کا لقب ہے جس کے معنی شیر ہیں۔

استغنائے سلمانی: حضرت سلمان فارسیؓ کی بے نیازی۔ حضرت سلمان فارس کے رہنے والے تھے اور اپنے گھر بار، خاندان اور وطن کو چھوڑ کر مدینہ چلے آئے تھے۔ اسلام سے ان کی محبت ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔

تشریح: اے نو جوان تجھ میں نہ تو حضرت علیؓ کی شجاعت ہے اور نہ حضرت سلمان فارسیؓ کی بے نیازی۔ ان دونوں صفتوں کے بغیر اگر تجھے بکثرت مال و دولت میسر ہے یا شاہانہ شان و شوکت حاصل ہے تو اس کا کیا فائدہ؟ اقبال کے خیال میں عظمت کا راز اللہ پر پختہ ایمان پر پوشیدہ ہے جو تمام عمدہ صفات کا سرچشمہ ہے اس کی بدولت وہ دلیری اور بہادری حاصل ہوتی ہے جس کے لئے حضرت علیؓ مشہور تھے اور وہ بے نیازی پیدا ہوتی ہے جو حضرت سلمانؓ کے لئے خاص تھی۔ یہی وہ صفات تھیں جو دنیا میں اسلام کی اشاعت اور غلبہ کا باعث بنیں اقبال ان کو فقر کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔

تیسرا شعر: معانی: تہذیب حاضر: موجودہ تہذیب مراد مغربی تہذیب

تجلی: چمک معراج: عروج: بلندی

تشریح: اقبال کہتے ہیں اے نوجوان تو اگر عروج حاصل کرنا چاہتا ہے تو تجھے یہ نعمت مغربی تہذیب کو اپنانے سے نہیں مل سکتی۔ اس مقصد کے لئے تجھے بے نیازی کی صفت اختیار کرنا ہوگی۔ بے نیازی مرد مومن کی صفت ہے جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اس کے سوا کسی کا محتاج بننا پسند نہیں کرتا۔ یہی چیز اس کی قوت و طاقت کا باعث ہے وہ کسی کی ظاہری شان و شوکت سے مرعوب نہیں ہوتا اس کے برعکس تہذیب مغرب نے انسان کو حریص بنا دیا ہے اس تہذیب کی پیروی نے انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ ہمارے نوجوانوں کی نادانی ہے کہ وہ اس ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہو گئے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں ورنہ:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے[1]

---

(۱) کلیات اقبال، اردو ص ۲۷۴ (۲) ایضاً ص ۳۱۶

اقبال اس رویے کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور بے نیازی کی صفت پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبال نے بے نیازی اور استغنا کی اہمیت کو اپنے کلام میں جگہ جگہ بیان کیا ہے ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا[1]

چوتھا شعر: معانی: عقابی روح: بلند پروازی

تشریح: جوانوں میں جب عقابی روح پیدا ہوتی ہے تو اس روح کو یوں نظر آتا ہے کہ جیسے اس کی منزل بہت بلند ہے۔ عقاب کی بلند پروازی مشہور ہے" عقاب کی یہ صفت اقبال کو پسند ہے وہ چاہتے ہیں کہ ملت کے نوجوانوں میں بھی بلند پروازی کا عزم اور ارادہ جنم لے لے تا کہ ان کی پست ہمتی کا خاتمہ ہو اور ان میں جرأت پیدا ہو۔ عموماً لوگوں کی زندگی گھٹیا اور پست قسم کی خواہشات کی تکمیل میں گزر جاتی ہے۔ حالانکہ زندگی کا ہر لمحہ بہت قیمتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے اوقات کسی بلند اور اچھے مقصد کے لیے وقف ہوں۔ مقصد کی بلندی کے ساتھ ساتھ ہمارے طور طریقوں میں بھی تبدیلی آئے گی ہم اپنی سوچ اور عمل کو بہتر بنا سکیں گے اور بڑے بڑے مقاصد کی طرف متوجہ رہ سکیں گے۔ اقبال ایک اور مقام پر مردمومن کو شاہین کے نام سے پکارتے ہیں اور اس کے مقصد کی بلندی کی طرف یوں توجہ دلاتے ہیں۔

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں[2]

پانچواں شعر: معانی : نومید : ناامید، مایوس

زوال علم و عرفان: علم و معرفت کا خاتمہ، عرفان، معرفت کے معنی ہیں پہچان۔ مراد خدا کی پہچان۔

---

(۱) کلیات اقبال اردو ص، ۳۱۶ (۲) کلیات اقبال اردو، ص ۳۵۳

تشریح: اے نوجوان، ناامید نہ ہو کیونکہ ناامیدی علم ومعرفت کے زوال اور خاتمے کی دلیل ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ ناامیدی انسان کو اللہ کی رحمت سے دور اور اس کی معرفت سے محروم کر دیتی ہے انسان کی فکری اور اخلاقی ترقی کے لئے اللہ کی معرفت کا حاصل ہونا ضروری ہے علم کے میدان میں تلاش وجستجو میں کامیابی کے لئے یہ یقین رکھنا ضروری ہے کہ ہماری محنت کا مفید نتیجہ برآمد ہوگا شعر کے دوسرے مصرعے میں اقبال مردمومن کی امید کو خدا کا رازدان بتاتے ہیں مقصد یہ ہے کہ مردمومن کی امید قدرت کے اس راز سے آگاہ ہے کہ کامیابی انہیں نصیب ہوگی جو صدق دل سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کوشش کریں گے۔

چھٹا شعر: معانی: قصر سلطانی: شاہی محل

تشریح: اے نوجوان تو شاہین ہے تیرا ٹھکانہ شاہی محل کا گنبد نہیں تجھے پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنا چاہئے اقبال نے اپنے مثالی نوجوان کو شاہین کے نام سے پکارا ہے۔ کیونکہ شاہین میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جو اقبال کے خیال میں مسلمان نوجوان میں ہونی چاہئیں۔ شاہین کے بارے میں اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اس پرندے میں اسلامی فقر کی درجہ ذیل تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

ا۔ خوددار غیرت مند ہے کہ کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

۲۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔

۳۔ بلند پرواز ہے۔

۴۔ خلوت پسند ہے اور

۵۔ تیز نگاہ ہے

۴.۳۔ خود آزمائی

(الف)

۱۔ اقبال کی توجہ زمانہ حال پر زیادہ ہے یا مستقبل پر؟

۲۔ اقبال کس عمر کے لوگوں سے زیادہ پرامید تھے؟

۳۔ فرد اور قوم کی بقا اور استحکام کا دارومدار کس چیز پر ہے؟

۴۔ اقبال کے خیال میں کس چیز سے زندگی کی تلخیوں کو دلپسند بنایا جا سکتا ہے۔

۵۔ نظم خطاب بہ جاوید، اقبال کی کس کتاب میں شامل ہے؟

(ب)

جملوں کے سامنے دیئے گئے الفاظ میں سے موزوں الفاظ سے خالی جگہ پُر کیجئے۔

۱۔ اقبال نے اپنی نظم .... میں نوجوانوں سے متعلق تمام ضروری نصیحتیں درج کردی ہیں۔

(خطاب بہ جاوید، ایک نوجوان کے نام)

۲۔ اقبال نے نوجوانوں کو خطروں سے .... کی تلقین کی ہے۔ (الجھنے، بچنے)

۳۔ عصر حاضر کی علمی و سائنسی ترقی کا آغاز .... نے کیا تھا۔ (رومیوں، مسلمانوں)

۴۔ اقبال نوجوانوں کو عام طور پر .... سے تشبیہہ دیتے ہیں (شیر، شاہین)

۵۔ خودی کی نشوونما کے لئے .... ضروری ہے (قوت۔ ضعف)

۶۔ اقبال کی نظم ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' ان کی کتاب .... سے لی گئی ہے۔

(ضرب کلیم، ارمغان حجاز، بانگ درا)

۷۔ ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' اقبال کی شاعری کے ....دور سے تعلق رکھتی ہے۔

(تیسرے، پانچویں، دوسرے)

۸۔ اس نظم کے کل اشعار.................. ہیں۔(گیارہ، پندرہ، بارہ)

۹۔ نظم ''ایک نوجوان کے نام'' اقبال کے مجموعہ کلام.................. میں موجود ہے۔

(حیات جاوید، بانگ درا، بال جبریل)

۱۰۔ یہ نظم.................. نظم ہے۔ (طویل، مختصر، درمیانی)

(ج)

مندرجہ ذیل میں سے صحیح فقروں کی نشاندہی ☑ اس نشان سے کیجئے ؟

۱۔ بے نیازی مردمومن کی صفت نہیں ہے۔
۲۔ مغربی تہذیب کو اپنانے سے عروج حاصل ہوتا ہے۔
۳۔ مال و دولت کی فراوانی انسان کو راحت پسند بنا دیتی ہے۔
۴۔ اقبال کے نزدیک نوجوانوں کی تمام خامیوں کا سبب بزرگوں کی غلط تربیت ہے۔
۵۔ ''خطاب بہ جاوید'' بانگ درا میں شامل ہے۔
۶۔ اقبال کے نزدیک سخت کوشی اور خطر پسندی نوجوانوں کے لئے غیر ضروری ہے۔
۷۔ نوجوانوں کو اپنی تاریخ سے آگاہ ہونا چاہیے۔
۸۔ کسی کی اندھی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔
۹۔ ''خطاب بہ جوانان اسلام'' سے اقبال کے ملی جذبات جھلکتے ہیں۔
۱۰۔ اس نظم میں اقبال نے مسلمان قوم کو آسمان کہہ کر پکارا ہے۔

۳.۵۔جوابات

(الف)

۱۔مستقبل ۲۔نوجوانوں سے ۳۔قوت پر ۴۔سخت کوشی سے

۵۔''جاوید نامہ''میں

(ب)

۱۔خطاب بہ جاوید ۲۔الجھنے ۳۔مسلمانوں ۴۔شاہین ۵۔قوت

۶۔بانگ درا ۷۔تیسرے دور سے ۸۔ بارہ اشعار ۹۔بال جبریل ۱۰۔مختصر

(ج)

۱۔ X ۲۔ X ۳۔ ☑ ۴۔ ☑

۵۔ ☑ ۶۔ X ۷۔ ☑ ۸۔ ☑

۹۔ ☑ ۱۰۔ ☑

یونٹ ۔۸

عشقِ رسولؐ

(نظمیں)

۱۔ بلالؓ

۲۔ صدیقؓ

تحریر: ڈاکٹر توصیف تبسم

فہرست

صفحہ نمبر	نمبر شمار عنوانات
260	تعارف
260	مقاصد
261	۱۔ اقبال اور عشق رسولؐ
263	۲۔ ''بلالؓ'' تعارف اور تبصرہ
265	نظم کا متن، بلالؓ
266	توضیحات
269	تشریحات
272	۳۔ صدیقؓ تعارف اور تبصرہ
274	نظم کا متن، صدیقؓ
275	توضیحات
279	تشریحات
280	۴۔ خود آزمائی
281	۵۔ جوابات

تعارف

اس یونٹ کا موضوع عشق رسولؐ ہے۔ یہ اقبال کی شاعری کا ایک اہم موضوع اور ان کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو رہا ہے۔ اس یونٹ میں اقبال کی ایسی دو نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ جن میں انہوں نے حضرت بلالؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رسول اکرم ﷺ کے ساتھ عقیدت و محبت کا ذکر کیا ہے۔

مقاصد

اس یونٹ کو پڑھنے کے بعد امید ہے آپ اس قابل ہو سکیں گے کہ:

(۱) عشق رسولؐ کی اہمیت سے آگاہ ہو سکیں۔

(۲) صحابہ کرامؓ خصوصاً حضرت بلالؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جذبۂ حب رسولؐ سے واقف ہو سکیں۔

(۳) اپنے دل میں یہ جذبہ پیدا کر سکیں۔

(۴) اقبال کی دو نظموں کو عشق رسولؐ کے حوالے سے سمجھ سکیں اور ان کی تشریح کر سکیں۔

۱۔ اقبال اور عشقِ رسولؐ

اقبال کی ابتدائی تعلیم و تربیت کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ نوعمری ہی کے زمانے میں خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت ان کے رگ رگ میں سما چکی تھی۔ ان کے والد ایک خدا رسیدہ اور صوفی بزرگ تھے۔ والدہ بڑی عبادت گزار اور نیک خاتون تھیں جن کی تربیت سے اقبال کی شخصیت ایک سچے مسلمان کے سانچے میں ڈھل گئی۔

اقبال نے قرآن حکیم اور حدیثِ رسولؐ کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور آپ سے محبت کرنے ہی میں تمام مسلمانوں کی بھلائی ہے۔ اقبال نے اپنی فارسی اور اردو شاعری میں جا بجا رسول مقبولؐ سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔

اقبال اپنی شاعری کے ابتدائی دنوں میں کئی برس تک انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں باقاعدہ نظمیں پڑھتے رہے مثلاً ''نالہ یتیم'' ''ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے اور'' ''ابر گہر بار'' ''فریاد امت'' یہ نظمیں ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''بانگ درا'' ۱۹۲۴ء میں شامل نہیں ہیں مگر اس لحاظ سے یہ نظمیں بہت اہم ہیں کہ ان میں عشق رسول اور قوم کی محبت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس ابتدائی زمانے کے کچھ شعر دیکھئے۔ یہ شعر بھی اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کا دل عشق رسولؐ کے جذبے سے کبھی خالی نہیں رہا۔ اقبال کہتے ہیں:

میں نے سو گلشن جنت کو کیا اس پہ نثار
دشت یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجھ کو
لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا

زندگی تجھ سے ہے اے فخر ابراہیم اپنی
کر دعا حق سے کہ مشکل ہوا جینا اپنا

اقبال کا بنیادی پیغام اپنی خودی کی پہچان اور اس کو مضبوط بنانا ہے خودی کا مطلب اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو جانے اور اپنے عمل کے ذریعہ ان کو ترقی دے۔ خودی ہی کے سلسلے میں اقبال بار بار مردمومن کا ذکر کرتے ہیں۔ مردمومن، دراصل اقبال کے نظریہ خودی ہی کی ایک ٹھوس اور عملی شکل ہے مردمومن ایک ایسا فرد ہے جس کی خودی کا جوہر نمایاں ہو چکا ہے جس کا اعلیٰ ترین نمونہ رسول مقبولؐ کی ذات بابرکات تھا۔ گویا اس اعتبار سے اقبال کی شاعری اور اس کا مرکز رسول اکرمؐ کی ذات گرامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس یونٹ میں ہمارے زیر مطالعہ علامہ اقبال کی دو نظمیں ہیں۔ پہلی ''بلالؓ'' اور دوسری ''صدیقؓ''۔ یہ دونوں نظمیں دو بزرگ ہستیوں اور بڑے صحابیوں کے بارے میں ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ سے اقبال کی شاعری اور شخصیت کا ایک خاص گوشہ ہمارے سامنے آیا ہے اور وہ ہے رسول مقبولؐ سے ان کی والہانہ محبت۔ ان دونوں نظموں کو ہم اپنی سہولت کے لئے ''عشق رسولؐ'' کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اپنی نظموں کے لئے ان ہستیوں کا انتخاب اپنی جگہ رسولؐ خدا سے اقبال کے عشق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۲۔ بلالؓ

تعارف اور تبصرہ

نظم حضرت بلالؓ کے بارے میں ہے۔ایک مشہور صحابی اسلام کے پہلے مؤذن اور عاشق رسولؐ تھے۔آپ حبش کے رہنے والے تھے۔حضرت بلالؓ کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جو پہلے پہل ایمان لائے۔اسلام قبول کرنے سے پہلے آپ ایک کافر کے غلام تھے جس کا نام امیہ بن خلف تھا جب ان کے آقا کو حضرت بلالؓ کے مسلمان ہو جانے کا علم ہوا۔تو اس نے آپ پر انتہائی شدید ظلم توڑے مگر آپ کے ایمان میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے (جو ہماری دوسری نظم کا موضوع ہیں) آپؓ کو ان کے آقا سے خرید کر آزاد کرایا۔

حضرت بلالؓ، آنحضرتؐ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔آپؓ کی اذان کو حضورؐ نے پسند فرمایا۔آنحضرتؐ کی زندگی تک آپ برابر اذان دیتے رہے۔آنحضرتؐ کے وصال کے بعد آپ نے صرف ایک مرتبہ، حضرت عمرؓ (مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ) کے اصرار پر اذان دی۔جب حضورؐ کا اسم مبارک ان کی زبان پر آیا تو ان کے جذبہ محبت نے ان کو اتنا بیقرار کیا کہ آپؓ وہیں غش کھا کر گر پڑے۔حضرت بلالؓ نے دمشق کے مقام پر ۲۰ھ، بمطابق ۶۴۱ء کو وفات پائی۔

نظم بلالؓ کا تعلق اقبال کی شاعری کے پہلے دور (۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء) سے ہے۔اس نظم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حضرت بلالؓ کے جذبۂ عشق رسولؐ کو بیان کرتے ہوئے اس نظم میں کئی دوسرے بزرگ صحابیوں اور قابل احترام ہستیوں کا ذکر بھی آ گیا ہے۔اس نظم کے ذریعے اقبال نے بلالؓ کی شخصیت کو حقیقی اسلامی زندگی کے نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔

نظم پڑھ کر اس شدید جذبے کا پتہ بھی چلتا ہے جو اقبال کے دل میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت کے لئے موجود تھا۔اقبال نظم لکھتے ہوئے ذہنی طور پر اس زمانے میں پہنچ جاتے ہیں جب مدینہ کی گلیاں حضورِ پرنورؐ کے جلوؤں سے آباد تھیں۔اقبال کو ان لوگوں پر رشک آتا ہے جن کو صبح شام آنحضرت ﷺ کو دیکھنے کا موقع حاصل تھا۔

اقبال سمجھتے ہیں کہ عشق رسولؐ ایک ایسا جذبہ ہے جو آدمی کو ہمیشہ رہنے والی زندگی بخشتا ہے۔ حضرت بلالؓ ایک گمنام اور ادنیٰ غلام تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کی محبت نے ان کو غیر فانی بنادیا اور یہی وہ جذبہ محبت ہے جس کی بدولت اقبال کی شاعری ابدی اور لافانی بن چکی ہے۔

اس نظم میں کچھ مصرعے فارسی کے بھی آئے ہیں جو اس رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو بعد کے دور میں بھرپور انداز میں اقبال کے یہاں ظاہر ہوا اور انہوں نے اردو فارسی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا تاکہ ان کا پیغام دنیا کے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچ سکے۔

یہ نظم ''مثنوی'' کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ہر شعر کا قافیہ (ہم آواز مثلاً غم، کم، دم وغیرہ) بالکل الگ ہوتا ہے اور جس کا اپنے پہلے اور بعد کے شعر کے قافیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عام طور پر مثنوی کو کسی قصے یا واقعہ کو بیان کرنے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

بلالؓ

۲.۱۔ نظم کا متن

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا — حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی — تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے — کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزہ ہی نہیں

نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری — شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیمؑ سودا تھا — اویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا — ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید! — خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید
گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر — کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برقِ جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری — کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی — نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

۔۲۔۲۔۲ توضیحات

مقدر: تقدیر، قسمت

مقدر کا ستارہ چمکنا (محاورہ) خوش نصیب ہونا

حبش: براعظم افریقہ کا ایک ملک جس کو انگریزی میں ''ابی سینا'' کہتے ہیں۔ یہ ملک سوڈان اور صومالی لینڈ کے درمیان واقع ہے۔ آج کل آزادی کے بعد اس ملک کا نام ایتھوپیا ہے۔ عدلیس ابابا اس کا صدر مقام ہے۔ یہ قدیم مملکت ہے جو شاہ حبشہ کے ماتحت تھا۔ رسولؐ اللہ کے زمانے میں، مسلمانوں نے مکہ سے ہجرت کر کے یہاں پناہ لی تھی اور یہاں کے بادشاہ نجاشی نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ حبش کو حبشہ بھی کہتے ہیں۔

حجاز: سعودی عرب کا ایک صوبہ جو بحیرہ قلزم کے ساتھ مغربی ساحل پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ ڈیڑھ لاکھ مربع میل ہے۔ مکہ اور مدینہ کے شہر اس صوبہ میں ہیں۔ یوں حجاز سے مراد عرب بھی ہے۔

غم کدہ: غم کا گھر۔ مراد وہ دل جو محرومیوں اور ناکامیوں کا مسلسل شکار تھا۔

آستاں: آستانہ، دروازہ، چوکھٹ

دم: سانس، ذراسی دیر، طاقت

شوق: آرزو، محبت، عشق

ستم: ظلم، زیادتی

جفا: ظلم، ستم

سلمان فارسیؓ: مشہور صحابی اور رسولؐ اللہ کے سچے عاشق۔ آپؓ اصفہان (ایران) کے رہنے والے تھے آپؓ کا تعلق ایک آتش پرست خاندان سے تھا۔ آپؓ کا پہلا نام مابہ تھا۔ روحانی تسکین کے لئے آپؓ نے پہلے عیسائی مذہب قبول کیا لیکن سکون حاصل نہ ہوسکا۔ چنانچہ آپؓ نے مدینے کا رخ کیا تا کہ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوسکیں مگر راستے میں غلام بنالیے گئے اور فروخت ہوتے ہوتے مدینہ پہنچے

آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔غزوۂ خندق کے موقع پر آپؓ ہی کے مشورہ پر آنحضرتؐ نے خندق کھدوائی جو مسلمانوں کی فتح کا سبب بنی۔آپؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں وفات پائی اور مدائن میں دفن ہوئے۔آپؓ ہر وقت حضورؐ کے قریب رہتے۔انہیں آنحضرتؐ سے بہت اُنس تھا چنانچہ آپ بہت سی حدیثوں کے راوی ہیں۔

ادا شناس: مزاج کو سمجھنے والا

دید: دیکھنا

کلیم: حضرت موسیٰ کلیم اللہ۔جلیل القدر پیغمبر۔وادیٔ سینا میں طور پر جا کر چونکہ آپ خدا تعالیٰ سے باتیں کرتے تھے اسی لئے کلیم (کلام کرنے والا) کہلائے۔اللہ نے بنی اسرائیل کی اصلاح کے لئے فرعون کے زمانہ میں آپ کو مامور کیا۔آپ پر جو آسمانی کتاب اتری اس کا نام توریت ہے۔

سودا: دیوانگی، انتہائی شدید خواہش

اویس: حضرت اویس قرنیؓ۔حضور ﷺ سے محبت کرنے والوں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔حضرت اویسؓ کے حالات تاریخ کی کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں۔آپؓ یمن کے علاقہ قرن کے رہنے والے تھے۔آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے تھے مگر حضورؐ نے فرمایا کہ تم میری ملاقات کو مت آؤ بلکہ اپنی ضعیف ماں کی خدمت کرو اسی میں میری خوشی ہے۔چنانچہ آپؓ، حضورؐ کے دیدار کی خوشی سے محروم رہے۔حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مدینہ آئے۔حضرت عمرؓ نے دیکھتے ہی آپؓ کو پہچان لیا۔حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی حمایت میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

طور: طور کا پہاڑ جو وادیٔ سینا میں واقع ہے اور جہاں جا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا سے باتیں کرتے تھے۔

برق: بجلی، بجلی کی چمک

ناشکیبا: بے قرار، بے صبر

خندہ زن: ہنسنے والا (مذاق اڑانے والا)

ظلمت: اندھیرا، تاریکی (مراد حضرت بلالؓ کی سیاہ رنگت)

دستِ موسیٰ: موسیٰ کا ہاتھ۔ اشارہ حضرت موسیٰ کے معجزہ کی طرف۔ آپ جب اپنے ہاتھ کو اپنی بغل سے باہر نکالتے تھے تو آپؑ کی ہتھیلی چمکنے لگتی تھی۔ قرآن حکیم میں اس معجزہ کا ذکر آیا ہے۔

خاشاک: گھاس اور تنکے وغیرہ

حاصل: فصل جو کھیت سے حاصل ہو

تپش: گرمی

ادائے دید: دیکھنے کا انداز

سراپا: سر سے پاؤں تک، سب کا سب

نیاز: عاشقی، نیازمندی

ازل: وہ زمانہ جس کی ابتداء نہ ہو۔

ترانہ: نغمہ، خوشی کا گیت

نظارہ: دیکھنا

خوشا: بہت خوب (تعریف کے موقع پر بولا جاتا ہے)

یثرب: مدینہ منورہ کا پرانا نام ہے۔ یہ شہر یثرب بن قانیہ نے آباد کیا تھا جو حضرت نوحؑ کی اولاد میں سے تھا۔ رسول اللہ نے اس شہر کا نام "طابہ" اور "طیبہ" رکھا، حضورؐ کی ہجرت کے بعد اس شہر کو عام لوگ "مدینۃ النبی"، یعنی نبی ﷺ کا شہر کہنے لگے آج یہی نام (مدینہ) سب سے زیادہ مشہور ہے۔

دور: عہد، زمانہ

۲.۳۔تشریحات

اقبال حضرت بلالؓ سے مخاطب ہیں

۲۔۱۔ اے بلالؓ! آپؓ حبش (افریقہ کے ایک ملک کا نام) سے غلام کی حیثیت میں حجازِ مقدس (عرب کا وہ علاقہ جس میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ واقع ہیں) آئے تھے۔ دراصل آپ کا اس طرح آنا ایک بہت بڑی خوش نصیبی تھی کیونکہ آپؓ غلام بن کر یہاں نہ آتے تو آپؓ اس بزرگ ہستی تک کیسے پہنچتے جس کے عشق کا شعلہ آپؓ کے دل میں روشن ہوا اور آپؓ کے دل سے غم اور محرومی کی تاریکی ختم ہو کر رہ گئی اس میں دنیا جہاں کی خوشیاں آ کر آباد ہو گئیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے بلالؓ! آپ کی اس غلامی پر ہزار آزادیاں قربان کی جاسکتی ہیں جو قربِ رسولؐ کا سبب بنی۔

۴۔۳۔ اے بلالؓ! آنحضرت سے قریب ہو کر، آپؓ کو وہ سکون اور آرام ملا کہ آپؓ نے حضورؐ کے دروازے کو پھر کبھی نہیں چھوڑا۔ آپ پر کفارِ مکہ نے مسلمان ہونے کے بعد طرح طرح کے شدید ظلم ڈھائے لیکن آپؓ نے اس تمام ظلم و ستم کو ہنسی خوشی برداشت کیا اگر محبت کا جذبہ سچا ہو تو ستم بھی ستم محسوس نہیں ہوتا بلکہ اس کے برخلاف عین راحت بن جاتا ہے۔ محبت کی زندگی میں اگر یہ آزمائشیں نہ ہوں تو محبت کے جذبے کی اصل قدر و قیمت واضح نہیں ہوتی اور نہ محبت کرنے کا مزہ ہی آتا ہے۔

۵۔ اے بلالؓ! آپؓ کی نظر حضرت سلمان فارسیؓ کی طرح ہر ادا کو پہچاننے والی تھی کیونکہ آپؓ کی تمام زندگی اس برگزیدہ صحابیؓ (حضرت سلمانؓ) کی طرح آنحضرتؐ کی قربت میں بسر ہوئی۔ آپؓ رسولؐ اللہ کو جتنا دیکھتے ان کو دیکھنے کی خواہش اور بھی شدید ہو جاتی تھی۔ گویا آنحضرت کو دیکھنا آپؓ کے لئے ایسی شراب تھی۔ جو تسکین دینے کی بجائے پیاس کو اور بھی بھڑکا دیتی ہے۔

۶-۷۔ جس طرح حضرت موسیٰ کلیم اللہ کوہ طور پر خدا کا جلوہ دیکھنے کے لئے بیتاب رہتے تھے، وہی بیقراری، اے بلالؓ! رسولؐ کے دیدار کے لئے آپؓ کے دل میں رہتی تھی۔ آپ کس درجہ خوش نصیب تھے کہ بار بار اس ذات کو دیکھنے کی سعادت آپؓ کو حاصل رہی جبکہ حضرت اویس قرنیؓ باوجود آنحضرتؐ کی سچی محبت کے، آپؐ کو دیکھنے کی تمنا میں تڑپتے رہے (حضرت اویسؓ کو حضورؐ نے حکم دیا تھا کہ تم میری ملاقات کو مت آؤ بلکہ اپنی ضعیف ماں کی خدمت کرو اور یوں آپؓ کو حضور پرنورؐ کو دیکھنے کی مسرت حاصل نہ ہو سکی) اے بلالؓ! مدینہ کا شہر جہاں نبی صلعم موجود تھے آپؓ کے لئے وہی درجہ رکھتا تھا جو حضرت موسیٰؑ کے لئے کوہ طور تھا جہاں وہ خدا کا جلوہ دیکھتے اور اس سے باتیں کرتے تھے۔ اے بلالؓ! آپؓ جب ان گلیوں کو دیکھتے تھے جہاں رسول اکرمؐ گزرتے تھے تو محبت کے جذبے کے زیر اثر آپ کی نگاہوں میں روشنی پیدا ہو جاتی تھی۔ مدینہ کے اردگرد پھیلا ہوا ریگستان حضرت رسول اکرم ﷺ کی موجودگی کے سبب آپ کے لئے کسی طرح وادی سینا سے کم نہ تھا (وادی سینا میں طور کا پہاڑ واقع ہے)۔

۸۔ آپؓ اگرچہ حضورؐ کو دیکھتے رہتے تھے مگر آپؓ کی آنکھیں ان کی دید سے کسی طرح سیر ہی نہ ہوتی تھیں۔ آنحضرتؐ کو بار بار دیکھنے کے باوجود ان کو دیکھنے کی تمنا دل میں باقی رہتی تھی۔ اس (محبت بھرے) دل کے کیا کہنے جس کو حضورؐ کی محبت میں ایک لمحے کے لئے بھی سکون نہیں ملا اور جو عشق رسولؐ میں عمر بھر تڑپتا رہا۔

۹-۱۰۔ اے بلالؓ! آپؓ کی بیقرار جان پر "عشق رسولؐ" کی بجلی اس طرح گری کہ آپ کی کالی رنگت (حضرت بلالؓ حبشی تھے) اہل محبت کو، حضرت موسیٰؑ سے ہاتھ کی سفیدی سے بھی زیادہ دلکش اور حسین دکھائی دینے لگی (حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ عطا فرمایا تھا کہ وہ جب اپنے ہاتھ کو اپنی بغل سے باہر نکالتے تھے تو وہ بہت زیادہ روشن دکھائی دیتا تھا۔ شاعری میں اکثر "ید بیضا" کے الفاظ سے اسی معجزے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے) اے بلالؓ! جب آپؓ کو تخلیق کیا گیا ہوگا تو بنانے والے نے شعلہ سے گرمی لے کر، آپؓ کے دل میں بھر دی ہوگی (تب ہی آپ کی

جان عمر بھر محبت کی آگ میں جلتی رہی اور بیقرار رہی) محبت کی بجلی نے آپ کے جسم کو جلا کر، ایک راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا (حضرت بلالؓ کے عشق رسولؐ کی شدت کا بیان مقصود ہے۔ اقبال نے عشق رسولؐ کو بجلی اور حضرت بلالؓ کے جسم کو اناج کے اس ڈھیر سے تشبیہ دی ہے جو کھیت سے فصل حاصل کرنے کے بعد لگا دیا جاتا ہے)۔

۱۱۔ اے بلالؓ! آپؓ، آنحضرتؐ کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے تھے جس سے اس حد درجہ محبت اور عقیدت کا اظہار ہوتا تھا جو آپؓ کو رسول مقبولؐ کی ذات گرامی سے تھی گویا جذبہ محبت کے زیر اثر آنحضرت کو دیکھتے رہنا ہی آپؓ کے لئے عبادت کا درجہ رکھتا تھا (ایک محبت کرنے والے کے نزدیک اس کا محبوب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ یہی حال حضرت بلالؓ کا رسول اللہ کی محبت میں تھا)۔

۱۲۔ اے بلالؓ! آپؓ کی اذان میں جو سوز اور تاثیر پیدا ہوئی وہ بھی اس جذبہ عشق کی تسکین تھی گویا آپؓ کی درد اور اثر سے بھری ہوئی آواز سے آپؓ کے جذبۂ محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ آپ نماز کے لئے بے چین رہتے تھے کیونکہ اس بہانے آپ کو اپنی محبوب ہستی کو ہر بار قریب سے دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

۱۳۔ وہ وقت کتنا اچھا تھا جب وہ محبوب ہستی (آنحضرتؐ) یثرب (مدینہ کا پرانا نام) میں رہتی تھی اور وہ زمانہ کتنا اچھا تھا جب ہر شخص اس کے دیدار سے فیض یاب ہوتا رہتا تھا (آخری شعر میں اقبال اپنے دل میں رسولؐ اللہ کو دیکھنے کی چھپی ہوئی آرزو کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں)۔

تعارف اور تبصرہ

۴۔صدیقؓ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اصل نام عبداللہ تھا۔آپ کے ایثار اور سچائی کی بدولت ،صدیقؓ کا لقب، دربار رسالتؐ سے آپ کو ملا۔آپ صحابہ کرامؓ میں سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے۔اسلام قبول کرنے سے پہلے آپ کا نام ''عبدالکعبہ'' یعنی'' کعبے کا بندہ'' تھا۔اس نام سے چونکہ شرک جھلکتا تھا اس لیے آپ نے اس کو ترک کر دیا۔

آپؓ کی تمام زندگی رسول مقبولؐ کی رفاقت میں بسر ہوئی جب آنحضرتؐ کو کفار مکہ نے بہت پریشان کیا اور آپؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی آپ کے ساتھ تھے۔جس غار میں آنحضرت نے پناہ لی اس میں آپؓ بھی رسول اللہ کے ہمراہ تھے۔اسی وجہ سے آپ کو''یار غار'' بھی کہتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سچے عاشق رسول تھے انہوں نے اپنا سب کچھ اسلام کی خاطر لٹا دیا۔آپؓ کے بارے میں حضور اکرمؐ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ہر شخص کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے مگر صدیق کے احسانات کا بدلہ خدا ہی قیامت کے روز دے گا۔

حضرت صدیقؓ، آنحضرتؐ کے بعد، مسلمانوں کے پہلے خلیفہ مقرر ہوئے۔آپؓ کے زمانے میں بہت سے فتنے اٹھے جس میں نبوت کے جھوٹے دعویداروں کا فتنہ بھی شامل تھا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بڑے تدبر اور جرأت ایمانی کے ساتھ ان فتنوں کو دبایا۔آپؓ ہی کے زمانے میں عراق، ایران اور شام اسلامی مملکت میں شامل ہوئے۔۶۳ برس کی عمر میں آپ نے وفات پائی اور آنحضرتؐ کے برابر دفن ہوئے۔

اس نظم کا تعلق اقبال کی شاعری کے تیسرے دور (۱۹۰۸ء کے بعد) سے ہے۔

یہ نظم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایثار اور قربانی کے جذبے کو سامنے لاتی ہے جو واقعہ اس نظم میں پیش کیا گیا ہے (اس کا تعلق غزوہ تبوک سے ہے (غزوہ اس لڑائی کو کہتے ہیں جس میں رسول اکرمؐ خود شریک

ہوئے) یہ جنگ ۸ ہجری میں لڑی گئی (اس موقع پر آنحضرتؐ نے اپنے تمام صحابیوں سے جہاد کے لئے مال طلب فرمایا تھا، اس موقع پر حضرت عثمان غنیؓ (مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ) نے اس قدر مال و دولت اور سامان جنگ حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا کہ آپ نے ان کے جنتی ہونے کی بشارت سب کے سامنے دی لیکن ایثار کے سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ادا سب سے الگ اور نرالی تھی جس کا بیان اس نظم میں ہوا ہے۔اس نظم کے ذریعے اقبال نے مسلمانوں کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پیروی میں اسلام کی عظمتِ نو اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے لئے ایثار قربانی سے کام لینے کا سبق دیا ہے۔

نظم بہت سی شاعرانہ خوبیاں اپنے اندر رکھتی ہے جس میں مکالمے (باہمی بات چیت) کا حسن بہت نمایاں ہے کیونکہ اس بات چیت سے بات کرنے والے کی دلی کیفیت کا اندازہ بہت اچھی طرح ہو جاتا ہے۔

اقبال نے یہ نظم ''ترکیب بند'' کی شکل میں لکھی ہے۔ترکیب بند میں پہلے کچھ شعر، غزل کے ردیف قافیہ کے انداز میں لکھے جاتے ہیں یعنی ہر شعر کا دوسرا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے جب بند مکمل ہو جاتا ہے تو شاعر ایک ایسا شعر لکھتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور یہ قافیے اوپر کے شعروں کے قافیہ سے مختلف ہوتے ہیں۔

صدیقؓ

۳.۱ـ نظم کا متن

اک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا — دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مال دار
ارشاد سن کے، فرطِ طرب سے عمرؓ اٹھے — اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور — بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا رہوار
لائے غرض کہ مال رسولِ امینؐ کے پاس — ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار
پوچھا حضورِ سرورِ عالمؐ نے اے عمرؓ! — اے وہ کہ جوشِ حق سے تیرے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟ — مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گذار

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آ گیا — جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت — ہر چیز، جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس — اسپِ قمر سم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضورؐ، چاہیے فکرِ عیال بھی — کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار
اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر! — اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روز گار!

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

۲.۲۔ توضیحات

اصحاب :(واحد، صاحب) دوست، ساتھی (یہاں مراد صحابہ کرام سے ہے)

راہ: راستہ

حق: درست، سچا، خدا تعالیٰ کا ایک نام

راہ حق: خدا کے راستے میں

فرط: زیادتی، غلبہ

طرب: خوشی، مسرت (فرط طرب: خوشی کی زیادتی)

عمرؓ: حضرت عمر بن خطاب: مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ اور بزرگ صحابی آپ کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں آنحضرتؐ کے نسب سے مل جاتا ہے۔ قبول اسلام سے پہلے سپہ گری اور تجارت میں آپؓ کا بڑا نام تھا، آپؓ کے مسلمان ہونے سے پہلے مسلمان چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ آپؓ کے قبول اسلام کے بعد مسلمان علانیہ کعبہ میں نماز پڑھنے لگے۔ آنحضرت نے آپؓ کو "فاروق" کا لقب عطا فرمایا آپؓ کے دور خلافت میں، مسلمانوں کی سلطنت، ایران سے مصر تک قائم ہوگئی۔ ۲۳ھ بمطابق ۶۴۲ء میں وفات پائی اور حضورؐ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

درہم: چاندی کا سکہ

راہوار: گھوڑا

امین: امانت رکھنے والا، حضرت رسول مقبولؐ کا لقب

ایثار: قربانی: دوسروں کے فائدے کو اپنے ذاتی فائدے پر ترجیح دینا

دست نگر: محتاج

ابتدائے کار: کام کی ابتداء

سرور: سردار (سرور عالم: دنیا کے سردار)

جوش: جذبے سے زیادتی (جوش حق: خدا کی شدید محبت)

عیال: بیوی بچے

خویش: اپنا

اقارب: (واحد، اقرب معنی بہت نزدیک)

(خویش و اقارب: نزدیکی رشتہ دار)

حق دار: حق ادا کرنے والا

فرزند: بیٹا

زن: عورت (مراد بیوی)

فرزند و زن: (گھر کے لوگ)

ملت: یہ لفظ قرآن حکیم میں جگہ جگہ آیا ہے۔ قوم جس پیغمبر کی پیروی کرتی ہے وہ اسی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اب ملت کا مطلب مسلمانوں کی قوم ہے جو ملک، نسل اور زبان کا امتیاز کئے بغیر ایک خدا کی عبادت کرتی ہے (ملت بیضا سے مراد ملت اسلامیہ ہی ہے بیضا بمعنی روشن ہے اور کفر کے معنی تاریکی کے ہیں)۔

رفیق: ساتھی (رفیق نبوت: نبی کا ساتھی: مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ)

بناء: بنیاد، عمارت

استوار: مضبوط، مستحکم

وفا: (خلوص، محبت، کسی ایک کا ہو کر رہنا)

سرشت: فطرت، مزاج (وفا سرشت، وفا اور خلوص کے مزاج میں شامل ہو)

جہاں: دنیا، مراد اہل جہاں یعنی دنیا کے لوگ

(چشم جہاں یعنی دنیا کے لوگوں کی نگاہ میں)

اعتبار: معتبر ہونا، عزت

ملک: مال: جمع "املاک"

یمین: داہنے ہاتھ کا (ملک یمین: داہنے ہاتھ کی ملکیت: غلام اور کنیز وغیرہ)

دینار: ایک سکے کا نام

رخت: سامان

جنس: سامان (مراد کھانے پینے کا سامان)

اسپ: گھوڑا

قمر: چاند قمر سم (ایسا گھوڑا) جس کے سم چاند کی طرح خوبصورت ہوں۔

شتر: اونٹ

قاطر: خچر

حمار: گدھا

دیدہ: آنکھ

مہ: چاند

انجم: واحد: نجم، ستارے

دیدہ و مہ و انجم (چاند ستاروں کی آنکھیں)

فروغ: روشنی، چمک

(فروغ گیر: روشنی حاصل کرنے والا)

باعث: سبب

تکوین: پیدا کرنا، وجود میں لانا

روزگار: زمانہ (مراد، دنیا، کائنات)

(باعث تکوین روزگار: کائنات کی تخلیق کا سبب)

۳.۴۔ تشریحات

۱۔ ایک دن (غزوہ تبوک کے موقع پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابیوں کو بلایا اور ان سے جہاد کے لئے مال طلب فرمایا۔ آپؐ نے کہا کہ تم لوگوں میں جو مالدار ہیں انہیں چاہئے کہ وہ مال کو حق کے راستے میں خرچ کریں۔

۲۔۴۔ رسولؐ اللہ کا یہ فرمان سن کر حضرت عمرؓ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ اس روز اتفاق سے ان کے پاس کئی ہزار درہم (چاندی کا سکہ) موجود تھے۔ آپؓ نے سوچا کہ آج میں ضرور، ایثار و قربانی میں حضرت ابوبکرؓ پر بازی لے جاؤں گا۔ اس میدان میں آج میرا گھوڑا، حضرت صدیقؓ کے گھوڑے سے آگے نکل جائے گا غرض انہوں نے اپنی دولت اور مال کو حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا جو امانت و صداقت کے لئے تمام عرب میں مشہور تھے۔ شاعر نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جب تک قربانی کا جذبہ نہ ہو کوئی کام شروع ہی نہیں ہو سکتا۔

۵۔۶۔ حضورؐ نے جو تمام دنیا کے سردار ہیں، حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اے عمرؓ میں جانتا ہوں کہ آپ کے دل میں خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت بہت زیادہ ہے اور یہی بات آپ کے دل کے لئے سکون اور اطمینان کا سبب بھی ہے۔ کیا آپ نے مال و دولت کا کچھ حصہ اپنے بیوی بچوں کے لئے بھی رکھا؟ ایسا کرنا ضروری ہے کیونکہ ایک مسلمان پر اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں کا بھی حق آتا ہے۔

۷۔ حضرت عمرؓ نے آنحضرتؐ کے سوال کے جواب میں بتایا کہ میرے پاس جس قدر بھی مال تھا اس کے میں نے دو برابر حصے کیے ایک حصہ بیوی بچوں کے لئے رکھ چھوڑا ہے اور دوسرا حصہ ملت اسلامیہ کی بھلائی کے لئے حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔

۸۔۱۰۔ ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ نبوت کا وہ ساتھی (حضرت ابوبکر صدیقؓ) بھی آ گیا جس سے عشق و محبت کا بھرم قائم ہے اور جس کے ہونے سے محبت کی عمارت مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہے۔ اس وفا کے پتلے کے ہمراہ ہر وہ چیز تھی جس کے ہونے سے کسی شخص کو دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھا

جاتا ہے یعنی اس کے ساتھ کنیز و غلام تھے۔ سونے و چاندی کے سکے بھی اور ہر قسم کا سامان بھی۔ خوبصورت سموں والے گھوڑے، اونٹ، خچر اور گدھے۔ غرض اس کا کل اثاثہ، گھر کی ایک ایک چیز اس کے ہمراہ تھی۔

۱۱۔ آنحضرتؐ نے جب یہ دیکھا تو فرمایا کہ اے بندۂ خدا، کچھ گھر والوں کا بھی تو خیال کرنا چاہئے تھا۔ یہ بات سن کر وہ شخص جو عشق و محبت کی تمام چھپی ہوئی کیفیات سے باخبر تھا۔ یوں کہنے لگا۔

۱۳۔۱۲۔ اے وہ عظیم ہستی، جس کے نور سے چاند اور ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں اور اے وہ بزرگ ذات کہ اگر تو نہ ہوتا تو خدا اس کائنات کو تخلیق ہی نہ کرتا جس طرح پروانے کے لئے شمع کا ہونا کافی ہے اور جس طرح بلبل کو صرف پھول کی تمنا ہوتی ہے میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے صرف رسولؐ کی ذات ہی بہت ہے۔ یہ وہ دولت ہے کہ جس کے بعد اور کسی چیز کی طلب ہی دل میں نہیں رہتی۔

۴۔ خود آزمائی

۱۔ لفظ ''خندہ زن'' سے ملتے جلتے، کم سے کم تین لفظ آپ بھی لکھیں (مثال، طعنہ زن)

۲۔ صحیح ضد بتائیے۔

۱۔ قرار کی ضد	(الف) بے قرار	(ب) سکون
۲۔ ازل کی ضد	(الف) حذ	(ب) ابد
۳۔ نیاز کی ضد	(الف) ناز	(ب) دیدار

۳۔ صحیح جوابات بتائیے۔

(الف) حضرت بلالؓ اور حضرت صدیقؓ دونوں مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے۔

(ب) دونوں بڑے صحابی اور عاشق رسولؐ تھے۔

(ج) دونوں بزرگوں کو ''اسلام کا مؤذن'' کہا جاتا ہے۔

(د) جب آنحضرتؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو حضرت عمرؓ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔

(ر) علامہ اقبال کے فلسفہ خودی'' کی ظاہری شکل'' مردمومن ہے۔

۴۔ مدینہ منورہ کا پرانا نام کیا ہے؟

(الف) طیبہ

(ب) طابہ

(ج) یثرب

۵۔ قبول اسلام سے پہلے حضرت صدیقؓ کا نام کیا تھا؟

(الف) عبداللہ

(ب) عبدالکعبہ

(ج) عبدالمکہ

۶۔ جس انجمن کے سالانہ جلسوں میں علامہ اقبال نے اپنی نظمیں پڑھیں اس کا نام کیا تھا؟

(الف) انجمن پنجاب

(ب) انجمن حمایت اسلام

(ج) انجمن مسلمانان پنجاب

۷۔ نظم ''بلالؓ'' میں کن دو صحابہ کا ذکر آیا ہے؟

۸۔ نماز حضرت بلالؓ کے لئے کس کے نظارے کا بہانہ تھی؟

۹۔ ملک یمین سے کیا مراد ہے؟

۱۰۔ نظم ''بلالؓ'' اور ''صدیقؓ'' کا موضوع کیا ہے؟

۵۔جوابات

(۱) موجزن، نعرہ زن، شمشیر زن

(۲) (ب)، (ب)، (الف)

(۳) ۱۔غلط ۲۔صحیح ۳۔غلط ۴۔غلط ۵۔صحیح

(۴) (ج) (۵) (ب) (۶) (ب) (۷) حضرت سلمانؓ، حضرت اویسؓ

(۸) حضور اکرمؐ (۹) لونڈی غلام وغیرہ (۱۰) عشق رسولؐ

یونٹ ۔۹

ملت اسلامیہ
ماضی، حال اور مستقبل

۱۔ صقلیہ

۲۔ فاطمہ بنت عبداللہ

تحریر:
ڈاکٹر توصیف تبسم

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	تعارف	286
	مقاصد	286
۱۔	نظموں کا پس منظر	287
۲۔	صقلیہ (تعارف اور تبصرہ)	288
	نظم کا متن ''صقلیہ''	290
	توضیحات	292
	تشریحات	295
۳۔	فاطمہ بنت عبداللہ (تعارف اور تبصرہ)	299
	نظم کا متن ''فاطمہ بنت عبداللہؓ''	300
	توضیحات	302
	تشریحات	304
۴۔	خود آزمائی	307
۵۔	جوابات	309

تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

اس یونٹ میں آپ کے مطالعے کے لئے دو نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ "صقلیہ" کا تعلق ملت اسلامیہ کے ماضی سے ہے اور "فاطمہ بنت عبداللہ" میں اقبال ملت اسلامیہ کا حال اور مستقبل دیکھ رہے ہیں۔ دونوں نظموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کو اسلام اور مسلمانوں سے گہری وابستگی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان عزم و ہمت سے کام لے کر اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت دوبارہ حاصل کر لیں۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد امید ہے آپ اس قابل ہو سکیں گے کہ:

(۱) ان دونوں نظموں کے حوالے سے ملت اسلامیہ کے ماضی حال اور مستقبل سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

(۲) اقبال کی ان نظموں سے لطف اندوز ہو سکیں اور ان کو سمجھ سکیں۔

(۳) ان نظموں کے اشعار کی تشریح کر سکیں۔

ا۔ نظموں کا پس منظر

یہ دونوں نظمیں تقریباً چار سال کے دوران لکھی گئیں یعنی پہلی نظم "صقلیہ" جولائی ۱۹۰۸ء میں یورپ سے وطن واپس آتے ہوئے اور دوسری نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" ۱۹۱۲ء کے لگ بھگ یہاں آ کر لکھی۔ ان دونوں نظموں کو ہم اپنی سہولت کے لئے "ملت اسلامیہ ماضی و مستقبل" کا نام دے سکتے ہیں لیکن ان دونوں نظموں میں ایک فرق بھی ہے۔ پہلی نظم "صقلیہ" مسلمانوں کے شاندار ماضی کی تصویر ہے جب کہ دوسری نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" میں اقبال کے اپنے زمانے کے ایک واقعہ سے مسلمانوں کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے اور ان کے خوش آئند مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔

اسلامی دنیا کی حالت

اقبال کے کلام میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو تڑپ ملتی ہے اس کا سبب، دوسری باتوں کے علاوہ دنیا کے مسلمانوں کی وہ خراب حالت تھی جس میں وہ اس وقت مبتلا تھے۔ اقبال اپنے یورپ کے قیام کے دوران خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ یورپ کے رہنے والے مسلمانوں کو مٹانے کی کیا کیا کوشش کر رہے ہیں جنگ بلقان اور جنگ طرابلس کی صورت میں مسلمانوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ان سے تمام دنیا کے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اقبال کی اس دور کی نظموں میں مسلمانوں کے انہی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ۱۹۰۸ء اور اس کے بعد کا زمانہ مسلمانوں کے لئے کڑی آزمائش اور مصیبت کا زمانہ تھا۔ ۱۹۰۸ء ہی سے روس اور برطانیہ نے ایران کے داخلی معاملات میں مداخلت شروع کر دی تھی اور ۱۹۰۶ء میں ترک خلیفہ سلطان عبدالحمید کو حکومت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے تین برس بعد اٹلی کی حکومت نے برطانیہ کے اشارہ پر طرابلس پر بلاوجہ حملہ کر کے وہاں کے مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔

۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں نے برطانیہ کے اشارہ پر ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ برصغیر میں بھی انگریز حکمران مسلمانوں کو طرح طرح سے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو ۱۹۱۵ء میں ترکی بھی اس جنگ میں شامل ہو گیا لیکن انگریزوں نے بڑی چالاکی سے عربوں کو ترکوں کے خلاف لا کھڑا کیا اور یوں مسلمان مسلمان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔

۲۔ صقلیہ

تعارف اور تبصرہ

یہ نظم جولائی ۱۹۰۸ء میں اقبال نے یورپ سے واپس آتے ہوئے لکھی اس نظم سے اس ذہنی انقلاب کا پتہ چلتا ہے جو اقبال کے خیالات میں پیدا ہو چکا تھا۔

صقلیہ اٹلی کے جنوب میں بحیرۂ روم کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ انگریز اس جزیرے کو سسلی کہتے ہیں۔ اس جزیرہ کا رقبہ ۹۹۳۵ مربع میل اور آبادی ۴۰ لاکھ کے قریب ہے۔ اس جزیرے پر مختلف اقوام کی حکومت رہی۔ بنی اغلب کے حکمران زیادۃ اللہ نے ۸۲۳ء (بمطابق ۲۰۸ھ) سسلی پر چڑھائی کی اور ۸۳۱ء (بمطابق ۲۱۶ھ) میں اس پر قبضہ کر لیا تقریباً دو سو برس تک اس جزیرے پر عربوں کی حکومت رہی۔

نظم چار حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں جزیرہ صقلیہ کے قریب سے گزرتے ہوئے شاعر کا دل بھر آتا ہے اور وہ عرب حکمرانوں اور ان کے کارناموں کو یاد کر کے روتا ہے۔ دوسرے حصے میں جزیرہ صقلیہ سے خطاب ہے۔ شاعر اس کے قیام کے لئے دعا کرتا ہے اور وہ صرف اس لئے کہ یہ جزیرہ اس خطے میں عربوں کی عظمت کی ایک نشانی ہے۔ تیسرے حصے میں اقبال ان شاعروں کو یاد کرتے ہیں جنہوں نے مختلف اوقات میں مسلمانوں کے زوال پر اپنے غم کا اظہار کیا چوتھے اور آخری حصے میں شاعر صقلیہ سے اس قدیم زمانے کے واقعات سننا چاہتا ہے جب اس جزیرے پر عربوں کی حکمرانی تھی۔ اس آخری حصے کا موازنہ اگر اقبال کی شاعری کے پہلے دور (۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک) نظم "ہمالہ" کے آخری حصے سے کیا جائے تو اقبال کے خیالات میں جو تبدیلی آئی وہ اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ بانگ درا (۱۹۲۴ء) کی اس پہلی نظم میں اقبال نے کہا تھا۔

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انسان جب بنا دامن ترا

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

پہلے وہ ہمالہ سے اس قدیم زمانہ کے حالات جاننے کے لئے بیتاب تھے جب انسان کے آباؤ اجداد ہمالہ کے دامن میں آباد ہوئے ہوں گے لیکن اب ان کی آرزو بدل گئی ہے۔ وہ ان لوگوں کے حالات جاننے کی بجائے اولین مسلمان حکمران کے عہد اور ان کی زندگی کے واقعات سننے کے لئے بے قرار ہیں۔

....

یہ نظم مثنوی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جس میں قافیے (ہم آواز الفاظ برباد، فریاد، ناشاد وغیرہ) دو، دو ہو کر آتے ہیں۔ عموماً اس قسم کی نظموں میں کوئی واقعہ یا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

....

نظم اس درد و غم کی تصویر ہے جو اقبال کے دل میں اس جزیرے کو دیکھ کر پیدا ہوا۔

نظم کا متن ''صقلیہ''

(جزیرہ سسلی)

۱۔ رو لے اب دل کھول کر اے دیدہ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

۲۔ تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

۳۔ زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

۴۔ اک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور!
کھا گئی عصر کہن کو جن کی تیغ ناصبور!

۵۔ مردہ عالم زندہ جن کی شورش قم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیر توہم سے ہوا

۶۔ غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے ؟

۷۔ آہ! اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو

۸۔ زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحرِ پیما کو رہے

۹۔ ہو سبک چشم مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

۱۰۔ تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا

۱۱۔ نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر

۱۲۔ آسمان نے دولت غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی

۱۳۔ غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

۱۴۔ ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستان
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیان

۱۵۔ درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

۱۶۔ رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

۱۷۔ میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

۲.۲۔توضیحات

دل کھول کر: (محاورہ): خوب اچھی طرح
اس طرح کہ دل میں کوئی آرزو باقی نہ رہے۔

دیدہ: آنکھ

خونناب: خون اور پانی ملا ہوا۔ خوناب بار خون کے آنسو برسانے والی

تہذیب: لفظی معنی پاک کرنا یا اصلاح کرنا
مراد زندگی بسر کرنے کا بہتر انداز

حجازی: جس کا تعلق سرزمین حجاز سے ہو مراد۔ عربی

حجاز: سعودی عرب کا ایک صوبہ جو بحیرہ قلزم کے ساتھ مغربی ساحل پر واقع ہے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس شہر اسی صوبے میں واقع ہے۔

تہذیب حجازی کا مزار: اشارہ جزیرہ صقلیہ کی طرف ہے جسے عربوں نے فتح کیا اور اب جہاں ان کی عظمت کی نشانیاں موجود ہیں۔

صحرا نشین: ریگستان میں بسنے والے مراد عرب فاتحین

بحر: سمندر

بازی گاہ: کھیل کا میدان

سفینہ: کشتی، جہاز

آشیانہ: گھونسلا۔ ٹھکانہ

ظہور: ظاہر ہونا

عصر کہن: قدیم زمانہ

ناصبور: بے صبر (ان کی وہ تلوار جو بوسیدہ روایات کو ختم کرنے کے لئے بے قرار رہتی تھی)

شورش: غل، زور کی آواز، ہنگامہ

قم: امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں "اٹھ" اشارہ ہے حضرت عیسیٰ کے معجزے کی طرف، وہ جب مردہ شخص کے سرہانے کھڑے ہو کر فرماتے "قم باذن اللہ" تو مردہ جی اٹھتا تھا۔

توہم: وہم ہونا، خدشہ، ڈر۔ یہاں مراد شرک اور اوہام پرستی سے ہے جس میں دنیا ظہور اسلام سے پہلے گرفتار تھی۔

غلغلہ: شور، غل

لذت گیر: لذت اور لطف حاصل کرنے والا

گوش: کان

تکبیر: خدا کی عظمت اور توحید کا اعلان

آبرو: عزت (لفظی مطلب چہرے کی چمک)

زیب دینا: اچھا لگنا (خوبصورتی میں اضافے کا سبب)

خال: تل، چھوٹا سا سیاہ نشان جو چہرے یا بدن پر ہو

رخسار: گال

شمعوں: روشنیوں (مراد لائٹ ہاؤس)

بحر پیما: (لفظی مطلب سمندر کو ناپنے والے) سمندر کا سفر کرنے والے

سبک: ہلکا، مراد، اچھا لگنے والا

مدام: ہمیشہ

رقصاں: (رقص سے) ناچتے ہوئے

گہوارہ: بچے کا جھولا۔ پرورش کی جگہ

عالم سوز: دنیا کو روشن کرنے والا، دنیا پر اثر ڈالنے والا

آتش نظارہ: نظارہ کی آگ، نظارہ کو جلا دینے والی آگ، مراد یہ ہے کہ اس سے دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

نالہ کش: زوروزور سے رونے والا، فریاد کرنے والا

شیراز کا بلبل: مراد سعدی شیرازی (۱۱۸۴ء تا ۱۲۹۱ء) مشہور فارسی شاعر اور حکیم جو ایران کے شہر شیراز میں پیدا ہوئے ان کی کتابیں گلستان (۱۲۵۸ء اور بوستان ۱۲۵۷) بہت مشہور ہیں۔ بغداد کی تباہی پر جو مرثیہ سعدی نے لکھا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس مرثیہ کا پہلا مصرع ہے۔

''آسماں را حق بود گر خوں ببارو برز میں''

داغ: نواب مرزا داغ (۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵) اردو کے مشہور شاعر اور اقبال کے استاد۔ انہوں نے دہلی کی تباہی پر ایک ''شہر آشوب'' لکھا ہے۔

غرناطہ: اسپین کے ایک شہر کا نام

دولت غرناطہ: مراد اسپین میں مسلمانوں کی حکومت

جہاں آباد: مراد دہلی

ابن بدروں: اصل نام ابن عبدوں ہے، اندلس کا مشہور ادیب اور شاعر جس نے غرناطہ کی تباہی پر دردناک مرثیہ لکھا

آسمان: مراد تقدیر

ناشاد: غم زدہ، ملول

غم نصیب: غم جس کی تقدیر میں ہو، غمگین

محرم: آشنا، واقف

آثار: واحد اثر، مراد آثار قدیمہ، پرانی عمارتیں وغیرہ

انداز بیاں: گفتگو کا انداز

سراپا: سر سے پاؤں تک۔ سب کا سب

سلف: قدیم۔ گزرا ہوا

کہن: پرانا

۲.۴۔ تشریحات

(پہلا حصہ)

۱۔ اے میری رونے والی آنکھ! جو مسلمانوں کے زوال پر خون کے آنسو بہاتی رہی ہے، اب خوب جی بھر کے رولے کیونکہ سامنے وہ جزیرہ (صقلیہ) دکھائی دے رہا ہے جہاں پہلے کبھی عرب کے رہنے والے بستے تھے۔ آج یہ جزیرہ اس قدیم عرب تہذیب کا مزار بن چکا ہے۔ یہاں جگہ جگہ وہ نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر مسلمان حکمرانوں کی یاد دل میں تازہ ہو جاتی ہے جس طرح ایک قبر کسی مرنے والے کی یاد دلاتی ہے۔ یہ صورت اب اس جزیرے کی ہے۔

۲۔۵۔ جب وہ ریگستان کے رہنے والے یہاں بستے تھے تو ان کی بھرپور سرگرمیوں سے یہاں کی فضائیں ہر وقت آباد تھیں وہ اگرچہ ریتلے علاقے کے رہنے والے تھے مگر ان کے حوصلوں کے سامنے، ریت اور سمندر ایک تھے جس طرح ریگستان میں ان کے اونٹ دوڑتے تھے۔ اس طرح ان کی کشتیاں اور جہاز سمندر کے سینے پر رواں دواں رہتے تھے۔ وہ عرب کے رہنے والے اگرچہ ظاہری شان و شوکت نہیں رکھتے تھے مگر ان کو وہ روحانی عظمت حاصل تھی دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ ان کا نام سن کر کانپ جاتے تھے۔ وہ اپنے بہادر تھے کہ ان کی تلواروں کی تیزی اپنے دشمنوں کو اس طرح فنا کر دیتی تھی جس طرح بجلی، تنکوں کے ڈھیر کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ کہ وہ دنیا کے لئے ایک نئے دور اور ایک نئی زندگی کا پیغام لے کر آئے۔ ان کی تلواریں مردہ روایات کو فنا کرنے کے لئے بیتاب رہتی تھیں ان ہی لوگوں کی بدولت پرانا دور ختم ہوا اور دنیا میں ایک نئے دور اور نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ مسلمان مردہ دنیا کے لیے حضرت عیسیٰ ثابت ہوئے وہ مردے کے سرہانے کھڑے ہو کر ''قم باذن اللہ'' (اللہ کے حکم سے زندہ ہو جا) فرماتے اور مردہ جی اٹھتا گویا مسلمانوں نے اس مردہ دنیا کو نئی زندگی کا پیغام دیا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے دنیا والے باطل خیالات میں مبتلا رہتے تھے۔ مسلمانوں نے ان کو ان باطل خیالات سے نجات

دلائی۔ انہوں نے دنیا کو توحید کا سبق دے کر جھوٹے خداؤں کے خوف اور ڈر کو ان کے دلوں سے نکال باہر کیا۔

۶۔ وہ تکبیر کی آواز جس سے خدا کی عظمت اور بڑائی کا اظہار ہوتا تھا۔ ابھی تک کانوں میں اس کی گونج بسی ہوئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ گونج اب تک کانوں کو لذت بخش رہی ہے۔ اس کے بعد اقبال سوال کرتے ہیں کہ کیا وہ تکبیر کی آواز کبھی اس جزیرے پر نہیں گونجے گی۔ کیا اب وہ آواز پھر کبھی نہیں سنائی دے گی۔

(دوسرا حصہ)

۷۔۹۔ اقبال سسلی کے جزیرے سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے سسلی کے جزیرے! اس سمندر میں تیرے ہونے کے سبب یہ سمندر ہمارے لئے زیادہ قابل احترام ہو گیا ہے تو اس پانی کے صحرا میں بھولے بھٹکوں کو راستہ بتا رہا ہے۔ سمندر پر سفر کرنے والے جب پھیلے ہوئے سمندر اور نیلے آسمان کے نیچے سفر کرتے ہیں، تو ان کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں لیکن جب وہ تیرے قریب سے گذرتے ہیں تو ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب ان کو کس طرف جانا چاہیے۔ اے سسلی! خدا کرے تو سمندر میں ہمیشہ یونہی قائم رہے۔ تیرا وہاں ہونا اس طرح سمندر کے حسن میں اضافہ کا سبب بنا رہے جیسے کسی حسین رخسار پر سیاہ تل، اس کی خوبصورتی میں اضافے کا سبب ہوتا ہے۔ جب سمندر پر سفر کرنے والے روشنی کے ان میناروں کو دیکھیں جو تیرے ساحل پر تعمیر کیے گئے ہیں تو ان کے پریشان دل اسی طرح مطمئن ہوتے رہیں جیسے کہ وہ اب ہوتے ہیں۔ اے سسلی! تیرا منظر دیکھنے والے مسافر کی آنکھ کو بھلا لگے اور تیرے ساحل کی پتھریلی چٹانوں پر ناچتی موجیں اسی طرح اپنی خوشی کا اظہار کرتی رہیں۔

۱۰ اے سسلی! تیری سرزمین پر وہ تہذیب پروان چڑھ چکی ہے جس کی دلکشی اور اچھی باتوں سے دنیا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ایک ایسی تہذیب جس کے حسن نے ایک دنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا تھا۔

(تیسرا حصہ)

۱۳۔۱۱۔ ان شعروں میں اقبال ان شاعروں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے مختلف موقعوں پر مسلمانوں کی سلطنتوں کی تباہی اور زوال پر اپنے غم کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب بغداد میں عباسیہ حکومت کا زوال ہوا تو شیخ سعدی شیرازی نے اس کا مرثیہ لکھا اور جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شکست کے بعد برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو نواب مرزا داغ دہلی کی تباہی پر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا اور اس نے مشہور "شہر آشوب" (وہ نظم جس میں کسی شہر کی تباہی اور خرابیوں کا ذکر کیا جائے) لکھا اور جب تقدیر کے ہاتھوں ہسپانیہ کی اسلامی حکومت کا زوال ہوا تو غرناطہ کی تباہی پر ابن بدروں نے درد ناک اشعار لکھے جس طرح ان شاعروں نے مسلمانوں کے زوال پر خون کے آنسو روئے ہیں۔ اقبال یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے زمانے میں یہی فرض قدرت کی طرف سے ان کو سونپا گیا ہے وہ اسلام کی اس عظمت سے باخبر رہیں جو مدت ہوئی فنا ہو چکی ہے اور اب جس کی کچھ نشانیاں صقلیہ میں موجود ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ صقلیہ کے موضوع پر اردو زبان میں، اقبال کے علاوہ اور کسی شاعر نے اظہار خیال نہیں کیا ہے۔

(آخری حصہ)

۱۷۔۱۴۔ پہلے شعر میں اقبال تجاہل عارفانہ (جان بوجھ کر انجان بن جانا۔ شاعری میں اس انداز سے بات کرنے کو ایک خوبی سمجھا گیا ہے) سے کام لیتے ہیں اور صقلیہ سے پوچھتے ہیں کہ تیرے پرانے کھنڈر کس دور کی کہانی سنا رہے ہیں۔ تیرے ساحل بظاہر خاموش ہیں مگر اس خاموشی میں کس قوم

کی داستان چھپی ہوئی ہے۔ یعنی صقلیہ کے کھنڈر اور وہاں کی ہر چیز پر عربوں کی داستان لکھی ہوئی ہے۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ اے صقلیہ! تجھ پر کیا گذری۔ مجھے وہ درد بھری کہانی سنا کیونکہ میں اس کو سننے کے لئے بے قرار ہوں۔ ایک دکھی شخص کی مصیبت کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو خود بھی ایسے حالات سے دو چار رہا ہو۔ اقبال خود کو ایسا ہی دردمند انسان سمجھتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ صقلیہ! تو جن مسلمان فاتحین کی قیام گاہ رہا ہے۔ میرا تعلق بھی اسی قوم سے ہے۔ وہ کارواں کی مانند ہر وقت منزل کی طرف گامزن رہے تھے۔ میں بھی اسی قافلے میں شامل ہوں مگر میری حیثیت اس کے گرد کی سی ہے جو قافلے کے گذرنے سے اڑتی ہے اور پھر کروٹ لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ خود کو گرد کہہ کر، اقبال نے اپنے عہد کے مسلمانوں کی بے چارگی کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ اقبال پھر کہتے ہیں کہ اے صقلیہ! تو مجھے اس پرانے زمانے کی ایسی تصویر دکھا دے جس پر حقیقت کا رنگ چڑھا ہوا ہو۔ میں جب اس قدیم زمانے کی باتیں سنوں گا تو اس محبت کے سبب، جو مجھے ملت اسلامیہ سے ہے اور بھی بے تاب ہو جاؤں گا۔ میں یورپ سے ہندوستان کو واپس جا رہا ہوں۔ اگر تو نے اس قدیم زمانے کی باتیں مجھے بتائیں تو میں ان کو تحفے کے طور پر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے وطن میں اور بھی مجھ جیسے لوگ ہیں جنہیں اسلام سے دلی محبت اور لگاؤ ہے۔ وہ جب ان باتوں کو سنیں گے تو وہ بھی میری طرح روئیں گے کیونکہ اسلام کی عظمت کا وہ زمانہ خواب و خیال ہو چکا ہے۔

۳۔ فاطمہ بنت عبداللہ

تعارف اور تبصرہ

یہ نظم علامہ اقبال نے ۱۹۱۲ء میں لکھی۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں انگریزوں کے اشارے پر اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر حملہ کر دیا۔ ترکی طرابلس والوں کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس قدر طاقتور نہ تھا کہ مصر پر حکمران انگریزوں کی ناکہ بندی کو توڑ سکے۔ طرابلس کے دینی اور سیاسی رہنما شیخ سنوسی نے اس جنگ کو جہاد قرار دے دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی طرابلس کے مسلمان بے سروسامانی کے باوجود میدان میں نکل آئے۔ فاطمہ بنت عبداللہ بھی ان میں شامل تھی۔ اس وقت فاطمہ کی عمر ۱۴ سال تھی۔ اس نے کمزور ناتواں ہونے کے باوجود جہاد میں حصہ لیا اور زخمیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی۔

یہ نظم اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں غم اور خوشی دونوں جذبے مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ کسی کا مرنا اپنی جگہ ایک المناک واقعہ ہے اور اگر مرنے والا جوان ہو تو یہ دکھ اور بھی شدید ہو جاتا ہے لیکن علامہ اقبال فاطمہ بنت عبداللہ کی شہادت پر مغموم بھی ہیں اور خوش بھی۔ مغموم اس لئے کہ مرنے والی ایک نوجوان اور معصوم لڑکی ہے اور خوش اس لئے کہ اس کی شہادت میں ملت اسلامیہ کی نئی زندگی کی خوشخبری پوشیدہ ہے۔ اس کی شہادت اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قوم ابھی پوری طرح مردہ نہیں ہوئی ہے اور اس میں خدا کے رسولؐ کے لئے جان دینے والے موجود ہیں۔

اس نظم سے علامہ اقبال کی بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت پہلے طرابلس (لیبیا) کی خاک سے ایک نئی قوم کو جنم لیتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

نظم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں پانچ شعر اور دوسرے حصے میں سات شعر ہیں۔ نظم کے دونوں حصوں میں فاطمہ بنت عبداللہ سے خطاب کیا گیا ہے۔

۱.۳۰۔ نظم کا متن

فاطمہ بنتِ عبداللہ

(عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی) (۱۹۱۲ء)

۱۔ فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

۲۔ یہ سعادت، حور صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی

۳۔ یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر

۴۔ یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی

۵۔ اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشید ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

۶۔ فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمہ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

۷۔ رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

۸۔ ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں

۹۔ بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

۱۰۔ تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موج نور

۱۱۔ جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانہ ایام سے
جن کی ضو نا آشنا ہے قید صبح و شام سے

۱۲۔ جن کی تابانی میں انداز کہن بھی نو بھی ہے
اور تیرے کوکب تقدیر کا پرتو بھی ہے

....

۱۴۔ توضیحات

آبرو: عزت (لفظی مطلب چہرے کی چمک)

مرحوم: رحم کیا گیا۔ مراد ملت اسلامیہ جس کو خدا نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔

مشت: مٹھی۔ خاک یعنی ایک مٹھی مٹی مراد فانی جسم۔ اشارہ اس بیان کی طرف کہ ہم نے آدمی کو ایک مٹھی مٹی سے بنایا۔

معصوم: گناہ سے پاک

سعادت: نیکی۔ بڑائی، نیک بختی

حور: جنت کی مخلوق، نہایت خوبصورت عورت۔ حور صحرائی سے مراد فاطمہ بنت عبداللہ ہے جو ریگستانی علاقے کی رہنے والی لڑکی تھی۔

غازیاں: واحد غازی۔ مراد اللہ کے لئے لڑنے والے

سقائی: پانی پلانا (سقہ: پانی پلانے والا)

جہاد: اللہ کے لئے جنگ کرنا ''جہاد اللہ کے راستے میں'' جہاد فی سبیل اللہ کا اردو ترجمہ ہے۔

تیغ: تلوار

سپر: ڈھال

جسارت آفریں: جسارت (ہمت، حوصلہ) آفریں (پیدا کرنے والا) جسارت آفریں: حوصلہ اور ہمت پیدا کرنے والا۔

شوق شہادت: اللہ کے نام کی سربلندی کے لئے جان دے دینے کا جذبہ

آہو: ہرن

خوابیدہ: سویا ہوا

شبنم افشاں: شبنم بکھیرنے والا۔ مراد آنسو برسانے والا

نغمۂ عشرت: خوشی کا گیت

نالۂ ماتم: مردہ شخص کو یاد کر کے، زور سے رونا اور اظہارِ غم کرنا

رقص: ناچ

نشاط انگیز: خوشی پیدا کرنے والا۔

سوز: حرارت، گرمی

لبریز: اپنے کناروں تک بھرا ہوا

ہنگامہ: ہلچل

تربت: قبر

آفرینش: پیدا ہونا۔ پیدائش۔

مرقد: قبر

انجم: (واحد نجم) ستارے

ظہور: ظاہر ہونا، نمایاں ہونا

دیدہ: آنکھ

نامحرم: ناواقف، ناآشنا

موجِ نور: نور کی لہر

ظلمت خانہ: تاریکی کا گھر

ایام: (واحد یوم) زمانہ، وقت

ضو: [illegible] روشنی [illegible]

قید صبح و شام: [illegible] وقت اور زمانے کی قید [illegible]

تابانی: [illegible] چمک [illegible]

اندازِ کہن: [illegible] (پرانا انداز) [illegible]

نو: [illegible]

کوکب: [illegible] ستارہ (کوکبِ تقدیر یعنی تقدیر کا ستارہ) [illegible]

پرتو: عکس، جھلک، چمک

تشریحات

(پہلا حصہ)

ا۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے فاطمہ! تو نے ملت اسلامیہ کی بقاء کے لئے اپنی جان دے کر ہم سب کے سر فخر سے بلند کر دیئے ہیں تو اس اُمت کی بیٹی ہے جس کو خدا نے ہمیشہ اپنے کرم سے نوازا اور جس پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دیئے (امت مرحوم) اے فاطمہ! تو اگر چہ شہید ہو چکی ہے اور تیرا فانی جسم خاک ہو چکا ہے مگر اس خاک کا ذرہ ذرہ گناہ کی آلودگی سے پاک ہے کیونکہ شہید کا مرتبہ دنیا اور عاقبت میں انتہائی بلند ہے جس کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

۲۔ اے فاطمہ! یہ کتنی بڑی نیکی تھی جو خدا نے ابتداء ہی سے تیری قسمت میں لکھ دی تھی کہ تو ان مجاہدوں کو پانی پلائے گی جو اللہ کے راستے میں باطل کے خلاف جہاد کریں گے۔

۳۔ اے فاطمہ! تو اگر چہ ایک نوعمر لڑکی تھی جنگ کے میدان میں نہ تو تیرے پاس تلوار تھی اور نہ دشمن کے حملوں کو روکنے کے لئے ڈھال لیکن اس کے باوجود تو نے جہاد میں حصہ لیا اور تیرے قدم اللہ کے راستے میں پیچھے نہیں ہٹے شہادت کا جذبہ جب دل میں جاگتا ہے تو آدمی ایسے کارنامے سرانجام دیتا ہے جو انسان کی عقل میں نہیں آتے۔ اے فاطمہ! تیری شہادت کا واقعہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

۴۔۵۔ اقبال کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ آج ایک ایسے باغ کی مانند ہے جس پر خزاں چھائی ہوئی ہے۔ یہ باغ پہلے ہرا بھرا اور سرسبز شاداب تھا مگر اب راکھ کا ڈھیر بن چکا ہے۔ اقبال حیران ہے کہ خزاں کی لپیٹ میں آئے ہوئے باغ (ملت اسلامیہ) میں ایک ایسی کلی (فاطمہ) بھی موجود تھی لیکن وہ ابھی تک لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔ اسی راکھ کے ڈھیر (ملت اسلامیہ) میں ایک ایسی چنگاری (فاطمہ) بھی چھپی ہوئی تھی اور لوگ اس سے بے خبر تھے۔ اقبال سوچتے ہیں کہ اگر آج فاطمہ بنت عبداللہ اپنی شہادت کی بدولت (لوگوں کی نظروں میں آئی ہے تو اس ملت (صحرا) میں

اور بھی کتنے اس جیسے افراد (آہو) موجود ہوں گے۔ جن کو لوگ ابھی تک نہیں پہچانتے۔ملت اسلامیہ دیکھنے میں ایک برسے ہوئے بادل کی طرح ہے جس کے فیض سے دنیا کی کھیتیاں لہلہا اٹھی تھیں لیکن اس بادل میں جو برس چکا ہے اور دنیا کو سیراب کر چکا ہے ابھی تک کچھ بجلیاں (جاں فروش اور باعمل لوگ) دیکھنے والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں جس طرح کلی، بہار کی پیغامبر ہوتی ہے۔اقبال بھی فاطمہ کو ملت اسلامیہ کی نئی زندگی کی پہلی نشانی خیال کرتے ہیں۔راکھ کے ڈھیر میں اگر ایک بھی چنگاری موجود ہو تو پھر کوشش اور عمل سے اس کو دوبارہ ایک دہکتے ہوئے الاؤ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے یعنی جب تک ملت اسلامیہ میں فاطمہ بنت عبداللہ جیسے لوگ موجود ہیں کسی کو بھی ملت کی نئی زندگی سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

(دوسرا حصہ)

۶۔ اے فاطمہ! میں اگر چہ تیری موت پر رو رہا ہوں لیکن میرے اس رونے میں خوشی بھی شامل ہے۔ جب تیری جواں موت کا خیال آتا ہے تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو (شبنم) گرنے لگتے ہیں لیکن جب میں تیرے مقصد کی بلندی پر غور کرتا ہوں تو میرا دل خوشی کے احساس سے ناچنے لگتا ہے۔

۷۔ اے فاطمہ! تو اگر چہ اب خاک ہو چکی ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تیری یہ خاک خوشی سے ناچ رہی ہو جیسے تو نے ملت کے لئے جان دے کر اپنے مقصد حیات کو پا لیا ہو اور تیری خاک کا یہ رقص اسی خوشی کے سبب ہو۔یہ بات پیش نظر رہے کہ شہیدوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار سے روزی پاتے ہیں۔تو بھی ایک شہید ہے اس لئے تیری خاک اپنے اندر بھرپور زندگی کی حرارت لیے ہوئے ہیں۔

۸-۹۔ اے فاطمہ! تیری قبر بظاہر خاموش دکھائی دیتی ہے لیکن اس قبر کی گود میں ایک نئی قوم پرورش پا رہی ہے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس نئی نسل کے لوگوں کی زندگی کے مقصد کس قدر بلند ہوں گے لیکن ایک بات جس کا اعلان میں پورے یقین کے ساتھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ تیری اس قبر سے ایک نئی قوم نمودار ہو رہی ہے۔

۱۰-۱۲۔ ان شعروں میں طرابلس کی نئی نسل کے لوگوں کو ستاروں کی مانند قرار دیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ آسمان کی فضا میں نئے ستارے پیدا ہو چکے ہیں جن کی روشنی کی لہر ابھی عام آدمی کی آنکھ تک نہیں پہنچی لیکن میری آنکھ ان نئے ستاروں کو آسمان کی وسعت میں نمودار ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ یہ ستارے زمانے کی تاریکیوں سے ابھی ابھی ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ زمانے کو ظلمت خانہ یعنی تاریک گھر سے تشبیہہ دی گئی ہے اور اس تشبیہہ میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ نئی نسل کے لوگ دنیا میں ظلم وستم کی پھیلی ہوئی تاریکی میں روشنی کے پیغامبر ہیں۔ یہ ستارے عام ستاروں سے مختلف ہیں کیونکہ زمانے کی گردش ان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکے گی۔ آسمان کے ستارے سرِ شام پیدا ہوتے ہیں اور ہر صبح مر جاتے ہیں لیکن یہ ستارے ایک بار چمکے ہیں تو پھر اسی طرح ہمیشہ چمکتے رہیں گے۔ یہ افراد اپنے اندر پرانے اور نئے دونوں انداز رکھتے ہیں یعنی وہ اپنی تاریخ اور اپنی زندہ اور روشن روایات سے بھی باخبر ہیں اور اس کے ساتھ ہی نئے زمانے کے تقاضوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی چمک میں اے فاطمہ بنت عبداللہ تیری قسمت کے ستارے کی چمک بھی شامل ہے۔ ان میں بھی ایثار وقربانی کا یہی جذبہ ہے جس نے تجھے شہادت کا رتبہ عطا کیا۔

۴۔ خود آزمائی

۱۔ صقلیہ یا سسلی کا جزیرہ کہاں واقع ہے؟

ا۔ بحیرہ عرب میں

ب۔ بحیرہ روم میں

ج۔ بحیرہ قلزم میں

۲۔ علامہ اقبال کے نزدیک صقلیہ کی اہمیت اس لئے ہے کہ

ا۔ وہ ایک خوبصورت جزیرہ ہے۔

ب۔ قدیم اسلامی تہذیب کا مرکز رہ چکا ہے۔

ج۔ وہاں اعلیٰ علمی درسگاہیں قائم تھیں۔

۳۔ نام اور شہر جن کا باہمی تعلق ہے ان کو اکٹھا کر دیجئے۔

داغ، ابن بدروں۔ بغداد۔ جہاں آباد۔ سعدی۔ غرناطہ

۴۔ نظم صقلیہ کب لکھی گئی؟

ا۔ ۱۹۰۵ء سے پہلے

ب۔ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کی درمیانی مدت میں

ج۔ ۱۹۰۸ء کے بعد

۵۔ نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کس سنہ میں لکھی گئی؟

ا۔ ۱۹۰۸ء میں

ب۔ ۱۹۱۰ء میں

ج۔ ۱۹۱۲ء میں

۶۔ طرابلس کا نیا نام کیا ہے؟

مراکش۔ سوڈان۔ لیبیا

۷۔ طرابلس کس علاقے میں واقع ہے؟

ا۔ افریقہ

ب۔ ایشیا میں

ج۔ مشرق وسطیٰ میں

۸۔ درج ذیل لفظوں کے معنی تقریباً ایک ہیں

تابانی

نور

ضو

پرتو

ایسے ہی دو لفظوں کا اضافہ اس فہرست میں آپ بھی کیجئے۔

۹۔ غلط/ درست بتائیے۔

ا۔ اقبال ایک عظیم شاعر ہیں۔ غلط/ درست

ب۔ اقبال ایک وطن پرست شاعر ہیں غلط/ درست

ج۔ اقبال کی شاعری عمل پر ابھارتی ہے۔ غلط/ درست

د۔ اقبال نے متحدہ قومیت کا پیغام کبھی نہیں دیا۔ غلط/ درست

۱۰۔ نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کے پانچویں شعر میں اقبال نے صحرا اور برسے ہوئے بادل کے الفاظ کس کے لئے استعمال کئے ہیں۔

۵۔جوابات

۱۔ ب ۲۔ ب

۳۔ داغ ...... جہاں آباد

ابن بدروں ...... غرناطہ

سعدی ...... بغداد

۴۔ ب ۵۔ ج ۶۔لیبیا

۷۔ ج ۸۔ چمک، روشنی، جلوہ، تجلی، تابندگی

۹۔ (ا) درست ب۔ غلط ج۔ درست د۔غلط

۱۰۔ ملت اسلامیہ کے لئے

یونٹ ۔ ۱۰

فرد و ملت

نظمیں

۱۔ بزم انجم
۲۔ پیوستہ رہ شجر سے

تحریر:
مرزا رفیق بیگ

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	تعارف	314
	مقاصد	314
۱۔	فرد اور جماعت کا باہمی تعلق	315
۲۔	بزم انجم	318
۲.۱۔	تعارف	318
۲.۲۔	پہلا بند	319
	۲.۲.۱۔ توضیحات	319
	۲.۲.۲۔ تشریحات	321
۲.۳۔	دوسرا بند	123
	۲.۳.۱۔ توضیحات	323
	۲.۳.۲۔ تشریحات	324
۲.۴۔	تیسرا بند	326
	۲.۴.۱۔ توضیحات	326
	۲.۴.۲۔ تشریحات	326
۳۔	نظم کا تجزیہ	327
۴۔	پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ "تعارف"	331
۴.۱۔	متن	332
		333

۴.۲۔ توضیحات 334

۴.۳۔ تشریحات 336

۵۔ خودآزمائی 341

۶۔ جوابات 343

ا

تعارف

قومی زندگی کی بقا اور ترقی کا انحصار جن باتوں پر ہے ان میں ایک یہ ہے کہ افرادِ قوم کو فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کا علم ہو۔ اقبال نے اس موضوع پر جو کچھ کہا ہے وہ فکری اور عملی سطح پر ہمارے لئے بہت مفید ہے اس یونٹ میں آپ اقبال کی دو نظمیں پڑھیں گے جن میں فرد اور جماعت کے موزوں تعلق پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

مقاصد

۱۔ اس یونٹ کے مطالعے سے اس قابل ہو سکیں گے کہ

۲۔ فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کے بارے میں اقبال کے خیالات سے آگاہ ہوں۔

۳۔ اقبال کے خیالات کی روشنی میں اپنی قومی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

۴۔ اقبال کی دو نظموں کو سمجھیں اور ان سے لطف اندوز ہوں۔

۵۔ اقبال کی ان نظموں کے اشعار کی تشریح کریں۔

ا۔ فرد اور جماعت کا باہمی تعلق

اقبال کے نظامِ فکروفن میں فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ افراد جب اپنی تربیت کرتے ہیں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے اپنی شخصیت کی تعمیر اور تکمیل کرتے ہیں تو اقبال اس عمل کو خودی کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ انسان تنہا نہیں رہتا مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ اس لیے اس طرح مل جل کر رہنے سے جماعت وجود میں آتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرد اور جماعت کا ساتھ یا تعلق کس قسم کا ہونا چاہیے؟ افراد کو محض اپنے مفادات کے لیئے کام کرنا چاہیے یا قوم اور جماعت کے وسیع تر مفادات کے لیئے خود کو قربان کر دینا چاہیے!

علامہ اقبال کے خیال میں افراد کی شخصیت اور خودی کی تعمیر اور نشو ونما اجتماعی ماحول اور جماعت کے مؤثر نظم وضبط اور آئین کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم فرد کو نظم وضبط یعنی ڈسپلن سے آشنا کرتی ہے اس کی صلاحیتوں کے لیئے میدان عمل مہیا کرتی ہے جس کے ذریعے اس کی شخصیت نکھرتی ہے سنورتی ہے اور سب کی توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ گویا جماعت کے اس تعلق کی وجہ سے فرد کی فطرت کا جوہر کمال تک پہنچتا ہے اور وہ ایک مکمل باصلاحیت، باوقار اور ذمہ دار انسان بنتا ہے۔

مختصر یہ کہ افراد کی شخصیت اور انکی تمام دماغی اور جسمانی صلاحیتیں اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتیں جب تک جماعت نہ ہو۔ لہذا افراد کو بھی جماعت کے استحکام اور قوم کی ترقی کی خاطر اپنے مفادات کو فراموش کر کے ایثار اور قربانی سے کام لینا چاہیے یہ اقبال کا نظریہ بےخودی ہے۔

فرد اور جماعت کے تعلق کو بالکل اس طرح سمجھیے جیسے ہمارا جسم اور ہمارے دیگر اعضاء جیسے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک وغیرہ ہیں اگر ہمارے جسم کے یہ حصے مضبوط، تندرست اور توانا ہوں گے تو ہمارا جسم بھی مضبوط، تندرست اور توانا ہوگا۔ لہذا ہمیں ان اعضاء کی تندرستی اور مضبوطی کے لیے ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ (یہ خودی ہے) لیکن یہ حصے جسم سے کٹ جائیں تو پھر ان کی تمام طاقت، صلاحیت اور توانائی ختم ہو

جاتی ہے۔اور یہ ناکارہ اور بےکار ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں پورے جسم کو بھی بے حد نقصان پہنچتا ہے وہ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔اور اس کی صلاحیت اور توانائی بھی کم ہو جاتی ہے۔ پس ان تمام اعضاء کو اپنی قوت، توانائی اور صلاحیت کو برقرار رکھنے کے لیے جسم کے ساتھ پیوستہ (جڑا ہوا) رہنا چاہیے۔(یہ بے خودی ہے)۔

اس ایک مثال سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ افراد اور جماعت کا وجود ایک دوسرے کے لیے لازم اور ضروری ہے۔اگر افراد نہ ہوں تو قوم (جماعت) کا وجود مٹ جاتا ہے اگر قوم نہ ہو تو افراد کی ہستی بے معنی اور ناممکن ہو جاتی ہے۔آیئے آپ کو چند مثالوں اور جماعت کے اس تعلق کو سمجھائیں۔آپ نے اقبال کا مشہور شعر سنا ہوگا کہ:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں!
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

ظاہر ہے موج کا دریا کے بغیر ہونا ناممکن ہے بالکل فرد بھی قوم کے بغیر اپنے وجود کی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔اب ایک مثال پر غور کیجئے شاخ کو اگر درخت سے کاٹ دیا جائے تو کیا وہ دوبارہ ہری ہو سکتی ہے؟ کیا اس پر پتے نکل سکتے ہیں؟ پھول اور پھل لگ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ شاخ پر صرف اسی صورت میں بہار آسکتی ہے جب وہ درخت کے ساتھ مضبوطی سے جڑی رہے بالکل اسی طرح فرد بھی اگر جماعت سے علیحدہ ہو جائے تو نقصان اٹھاتا ہے اور جماعت کی ترقی اور خوشحالی میں اس کا حصہ نہیں رہتا۔اس مسئلہ کو ذرا دوسری طرح دیکھئے قافلہ افراد کے اکٹھا ہونے اور سفر پر روانہ ہونے کی شکل میں بنتا ہے۔اگر یہ افراد اکٹھے نہ رہیں اور قافلہ کا مسافر اپنی منزل بدل لے تو کیا قافلے کا وجود رہ سکتا ہے؟ ظاہر ہے قافلے کا نام و نشان مٹ جائے گا۔گویا جماعت کا وجود افراد کی وجہ سے ہے اور افراد کی بقا اور ترقی جماعت کے دم سے۔دونوں ساتھ ساتھ رہیں، ساتھ ساتھ چلیں، ایک دوسرے کے نفع و نقصان میں شریک رہیں تب ہی دونوں ترقی کرتے ہیں۔دونوں کو استحکام حاصل ہوتا ہے اور ایک خوشحال اور صحت مند معاشرہ سوسائٹی یا قوم وجود میں آتی ہے۔

فرداور جماعت کا تعلق جس پر اقبال نے اتنا زور دیا ہے اور جس کو ہم نے مثالوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اسلام میں فرد کی ذاتی تربیت کو بھی اہمیت دی ہے لیکن زیادہ تاکید اور زور اجتماعی یعنی مل جل کر رہنے اور اکٹھے ہو جانے پر دیا ہے آپ اگر صرف نماز کے احکام پر غور کریں تو اجتماع کی اہمیت آپ پر واضح ہو جائے گی، احادیث میں جماعت کے قیام اور مرکز کی مضبوطی پر بہت زور دیا ہے۔ جیسے حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ کا ہاتھ مضبوطی پر ہے شیطان جماعت سے بھاگتا ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ اے مسلمانو! جماعت کے ساتھ رہو۔ کیونکہ ''جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ دوزخ میں جا گرا''۔ آپ اگر اسلامی تاریخ پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ جب تک مسلمانوں نے اسلام کی اس روح کو اپنی اجتماعی زندگی میں برقرار رکھا، انکی ملی قوت اور وحدت برقرار رہی، لیکن جب مسلمانوں میں رنگ، نسل، ملک اور وطن کے امتیازات اہمیت حاصل کر گئے تو ملت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور مسلمان دنیا میں اپنی تمام قوت اور عظمت سے محروم ہو کر ذلیل اور محکوم ہو گئے۔

فرداور جماعت کا یہی تعلق اس یونٹ کا موضوع ہے، ہم آئندہ جماعت کی جگہ قوم کا لفظ استعمال کریں گے کیونکہ جماعت کے مقابلے میں قوم کے لفظ میں زیادہ وسعت ہے۔ جو بہت زیادہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں سے مل کر بنتی۔ اقبال نے افراد اور قوم کے تعلق کی دو صورتیں بیان کی ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ قومی نظام صرف اس حالت میں برقرار رہ سکتا ہے۔ جب قوم کے مختلف طبقوں، گروہوں، جماعتوں اور افراد کے درمیان ربط و ضبط موجود ہو اور جب محبت اور اتفاق کے رشتہ میں تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے ہوں، جب تک محبت اور اتحاد کا یہ مضبوط تعلق نہ ہو قومی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ اس خیال کو آپ علامہ اقبال کی نظم "بزمِ انجم" میں دیکھیں گے۔ قوم اور فرد کے تعلق کی دوسری صورت یہ ہے کہ قوم خواہ کسی بھی حالت میں ہو افراد کو اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اور اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ کیونکہ افراد اور قوم کا نفع و نقصان ایک ہے دونوں ایک دوسرے کی کامیابیوں اور ناکامیوں میں برابر کے شریک ہیں۔ جو افراد برے وقت میں قوم کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں وہ آخر کار نقصان میں رہتے ہیں، اس خیال کو علامہ اقبال نے اپنی مختصر سی نظم ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' میں سمجھایا ہے۔ آئندہ صفحات میں انہی دونوں نظموں کی تشریح پیش کی جائے گی۔

۲۔ بزمِ انجم

۲.۱۔تعارف

نظم کے عنوان کا مطلب ہے "ستاروں کی محفل" اس نظم میں علامہ اقبال نے اپنے خیالات ستاروں کی معرفت قوم تک پہنچائے ہیں۔اس نظم میں تین بند ہیں۔ پہلے بند میں دن ڈھلنے، شام ہونے، رات کی تاریکی چھا جانے اور آسمان پر ستاروں کے چمکنے کا خوبصورت منظر پیش کیا گیا ہے دوسرے بند میں ایک فرشتہ ستاروں سے خطاب کرتا ہے۔تیسرے بند میں ستارے فرشتے کے خطاب کے جواب میں کچھ باتیں کرتے ہیں، اسی بند میں علامہ اقبال نے اپنے افکار پیش کئے ہیں اور آخری شعر سے نظم کا مرکزی خیال واضح ہو جاتا ہے جو یہ ہے:

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

اس نظم کے افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ اقبال سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا چاہتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان قوم قدیم اور جدید کی کشمکش میں نہ الجھی رہے، اسے چاہیئے کہ وہ ماضی کے احترام کے ساتھ حال کے تقاضوں پر نظر رکھے اور وقت کی تیز رفتاری کا اس طرح ساتھ دے کہ کسی سے پیچھے نہ رہ جائے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی نظر میں وسعت پیدا کریں اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو ملت اسلامیہ کے ساتھ وابستہ سمجھیں۔سب سے اہم اور آخری بات یہ کہ وہ ستاروں کے نظام سے یہ نکتہ سیکھیں کہ قوم کا اجتماعی نظام صرف محبت اور اتفاق کے رشتے کی مضبوطی سے قائم رہ سکتا ہے، اگر یہ رشتہ قائم نہ رہے یا کمزور ہو جائے تو قوم کی وحدت کمزور ہو جاتی ہے اور اس کی حیات اور بقا خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

پہلا بند:

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے

محو: بھولا ہوا۔گم۔ یہاں مراد ہے مصروف، منہمک

فلک فروزی: آسمان کو روشن کرنا

انجمن فلک کی: ستاروں کی محفل

عرشِ بریں: فلک الافلاک، سب سے اونچا آسمان

ملک: فرشتہ

۲.۲.۲۔ تشریحات

پہلا شعر:

سورج نے غروب ہوتے ہوئے سیاہ قبا والی شام کو افق کے طشت (تھال) سے لالے کے پھول لے لے کر مارے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ شام کے وقت جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو اس کی کرنیں سنہری مائل ہو جاتی ہیں اور ان کا رخ زمین سے زیادہ آسمان کی طرف ہو جاتا ہے جس کی وجہ آسمان پر کافی دور تک سنہری روشنی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے، مغرب میں، جہاں سورج غروب ہو رہا ہوتا ہے، تمام افق سرخ سا ہو جاتا ہے۔ اسی سرخ افق کو شاعر نے لالے کے پھولوں سے (جن کا رنگ سرخ ہوتا ہے) بھرا ہوا تھال تصور کیا ہے چونکہ اس وقت شام کی سیاہی بھی تھوڑی تھوڑی ظاہر ہونی اور پھیلنی شروع ہو جاتی ہے اس لیے اس

شام کی سیاہی اور سورج کی سنہری کرنوں کی آنکھ مچولی کو شاعر اس طرح پیش کرتا ہے گویا افق لالے کے پھولوں سے بھرا ہوا ایک تھال ہے اور سورج انتہائی شوخ انداز میں اس تھال میں سے لالے کے پھول اٹھا اٹھا کر سیاہ لباس والی شام کو مارتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ سورج غروب ہو رہا ہے اور شام کی سیاہی آسمان پر پھیلتی جا رہی ہے۔

ذوسرا شعر:

قدرت نے چاندی کا سب زیور اتار دیا اور اس کی جگہ شفق نے اسے سونے کا زیور پہنا دیا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ دن کے وقت دھوپ کا رنگ بالکل سفید چاندی کی طرح ہوتا ہے۔ سورج کے ڈھلنے کے ساتھ دھوپ کا رنگ سنہرا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جس وقت شفق پھولتی ہے، یعنی سورج مغرب میں پہنچ جاتا ہے تو پھر دھوپ بالکل سنہری سونے کی مانند نظر آنے لگتی ہے۔

محمل میں خاموشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے

وہ دور رہنے والے ہنگامہ جہاں سے
کہتا ہے جن کو انسان اپنی زبان میں تارے

محو فلک فروزی تھی انجمن فلک کی!
عرش بریں سے آئی آواز اک ملک کی!

۳.۲.۲۔توضیحات وتشریحات

سیہ: دراصل سیاہ ہے یعنی کالا

قبا: ایک قسم کا کھلا کوٹ یا لباس

شام سیہ قبا: سیاہ قباوالی شام اس لیے کہا کیونکہ شام کے ساتھ سیاہی بھی آتی ہے اور چاروں طرف اندھیرا چھانے لگتا ہے۔

طشت: بڑا تھال، مراد افق، چونکہ افق گول نظر آتا ہے اس لیے اسے تھال کے برابر ٹھہرایا ہے۔

لالے کے پھول: شفق کی سرخی مراد ہے۔

افق: وہ مقام جہاں زمین اور آسمان ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

شفق: سورج کے نکلنے اور غروب ہونے کے وقت کی سرخی جو افق پر چھا جاتی ہے۔

سونے کا زیور: شفق کی سرخی جو شام کے وقت نظر آتی ہے۔

گہنا: زیور

چاندی کا گہنا: مراد دن کے وقت کی دھوپ

محمل: اونٹ کا ہودہ، کجاوہ، جو سواری کے بیٹھنے کے لیے اونٹ کی پیٹھ پر رکھا جاتا ہے

خامشی: خاموشی

لیلائے ظلمت: تاریکی کی لیلیٰ مراد سیاہ رات

عروس: دلہن

موتی: مراد ستارے

شاعر نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا کہ قدرت (کائنات) نے دن کے وقت جو چاندی کا زیور پہنا ہوا تھا شام کے وقت وہ اتار دیا اور اس کی جگہ سونے کا زیور پہن لیا تھا، شعر کا مطلب یہ ہوا کہ دن کی دھوپ ڈھل گئی اور تمام کائنات جب شام ہو جانے کی وجہ سے سورج کی سنہری کرنیں پھیل گئیں۔

تیسرا شعر:

رات کے اندھیرے کی لیلیٰ خاموشی کے محمل (کجاوے) میں بیٹھ کر آئی یعنی سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہی ہر طرف تاریکی چھانے لگی اور دن کے شور وغل اور ہنگاموں کی جگہ خاموشی پھیلنے لگی۔

اونٹ پر سواری کے بیٹھنے کے لیے جو کجاوہ رکھا جاتا ہے اس کی شکل گنبد نما سی ہوتی ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے کائنات کو محمل کے برابر قرار دیا ہے اور چونکہ محمل میں لیلیٰ بیٹھ کر سفر کیا کرتی تھی اس رعایت سے خاموشی کے محمل میں اندھیرے کی لیلیٰ کو بٹھایا گیا ہے۔

مصرعے کا مطلب یہ ہوا کہ جب فضا پر خاموشی چھا گئی اور رات کی سیاہی ہر طرف پھیل گئی تو (دوسرا مصرع) رات کی دلہن کے پیارے پیارے موتی چمکنے لگے یعنی ستارے روشن ہونے لگے۔

ستاروں کی چمک دمک سے چونکہ رات بن سنور جاتی ہے اس لیے اسے دلہن کہا گیا ہے۔

چوتھا شعر:

وہی موتی جو دنیا کے ہنگاموں سے بہت دور (یعنی آسمان پر) رہتے ہیں اور جنھیں انسان اپنی زبان میں تارے کہتا ہے۔

یہ شعر، شعر نمبر ۳ کے دوسرے مصرعے کی وضاحت کرتا ہے یعنی شاعر نے خود بتا دیا ہے کہ رات کی دلہن کے پیارے پیارے موتی ستارے ہیں۔

پانچواں شعر:

فلک کی انجمن یعنی ستارے آسمان کو روشن کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ستارے چونکہ بہت سارے اکٹھے نظر آتے ہیں اس لیے شاعر نے انھیں فلک کی انجمن قرار دیا ہے اور آپ نے دیکھا ہوگا جوں جوں رات بڑھتی جاتی ہے۔ ستارے زیادہ تعداد میں آسمان پر روشن ہوتے چلے جاتے ہیں اس کیفیت کو شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے گویا ستاروں کی محفل آسمان کو روشن کرنے میں محو اور مصروف تھی کہ ٹھیک اس وقت سب سے بڑے آسمان (یا سب سے اونچے آسمان) سے ایک فرشتہ کی آواز آئی۔

۲.۳۔ دوسرا بند:

اے شب کے پاسبانو اے آسماں کے تارو!
تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تاب جبیں تمہاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
شاید سنیں صدائیں، اہلِ زمیں تمہاری
رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

۲.۳.۱۔ توضیحات

پاسبان: محافظ، پہرہ دار
تابندہ: روشن
گردوں نشیں: آسمان پر بیٹھی ہوئی، بلند مقام
سرود: نغمہ
تاب جبیں: پیشانی کی چمک
اہلِ زمیں: زمین کے رہنے والے مراد انسان
خموشی: خاموشی
معمور: آباد، بھرا ہوا پُر، لبریز
نوا: آواز

۲.۳.۲۔ تشریحات

پہلا شعر:

اے رات کے پہرہ دارو، اے آسمان کے تارو، تمہاری ساری قوم آسمان پر بیٹھی ہوئی چمک رہی ہے۔

ستارے رات کو نکلتے ہیں، ساری رات آسمان پر چمکتے ہیں گویا بیدار رہتے ہیں اسی لیے فرشتے نے انہیں رات کا پہرہ دار کہا ہے، یہ بات تو واضح ہے کہ ستارے تو سب ہی روشن ہیں یا روشن نظر آتے ہیں، اسی وجہ سے فرشتے نے انہیں ''تابندہ قوم'' کہہ کر خطاب کیا ہے۔ یہ ایک قسم کا مدح کا شعر ہے یعنی اس میں فرشتے نے اپنی بات کہنے سے پہلے ستاروں کی تعریف کی ہے۔

دوسرا شعر:

(اے ستارو) کوئی ایسا نغمہ چھیڑو کہ سونے والے جاگ اٹھیں تمہاری پیشانی کی چمک قافلوں کو راستہ دکھاتی ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ ایک مدت انسانی قافلے ستاروں کی مدد سے اپنے راستوں کی سمت متعین کرتے اور منزل تک پہنچتے رہے ہیں، قافلوں کو راستہ دکھانا رہبر کا کام ہوتا ہے اور چونکہ یہ کام ستارے کرتے ہیں اس لیے انہیں بھی رہبر کہا گیا ہے۔

نغمہ اور موسیقی کا اثر انسانی طبیعتوں پر خوشگوار ہوتا ہے چونکہ مقصد سوتوں کو بیدار کرنا اور انہیں کچھ سمجھانا ہے اس لیے ضروری ہے کہ سونے والوں کو اس طرح بیدار کیا جائے کہ خوشگوار ماحول میں وہ باتیں سننے کے لیے تیار ہو جائیں اسی لیے نغمہ چھیڑ کر انہیں بیدار کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

تیسرا شعر:

(صرف یہی نہیں کہ انسان تمہیں اپنا رہبر سمجھتے ہیں بلکہ) یہ زمین پر بسنے والے تمہیں اپنی قسمتوں کے آئینے تصور کرتے ہیں شاید وہ تمہاری صدائیں سن لیں۔ آپ جانتے ہیں کہ انسان آج بھی اپنی قسمت ستاروں سے وابستہ سمجھتا ہے ستارہ شناس یا نجومی ستاروں کی گردش اور ان کے محل و مقام کو دیکھ کر لوگوں کی قسمتوں کا حال بتاتے ہیں۔ اس کے مقدر کا ستارہ روشن ہے یا اس کی قسمت کا ستارہ گردش میں ہے۔ اس قسم کے جملے عام گفتگو میں اب بھی سننے میں آتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ انسان ستاروں کو اپنی قسمت کا آئینہ تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی گردش قسمتوں پر اثرانداز ہوتی ہے یعنی اثر ڈالتی ہے۔

اب ستاروں کی اہمیت دگنی ہو جاتی ہے ایک اس لیے کہ وہ انسانوں کے رہبر ہیں، دوسرے اس لیے کہ انسانوں کی قسمتیں بھی ان سے وابستہ ہیں اس لیے فرشتہ ستاروں کو ان کے وجود کی اہمیت کا احساس دلا کر ان سے یہ درخواست کرتا ہے کہ

تم ہی ان سے یعنی سوئے ہوئے انسانوں سے خطاب کرو۔ ہوسکتا ہے وہ تمہاری بات غور سے سنیں، اسے اہمیت دیں اور غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائیں۔

چوتھا شعر:

فرشتے کی آواز بلند ہوتے ہی تاروں بھری فضا کی خاموشی ختم ہو گئی اور آسمان کی وسعت میں یہ آواز گونجنے لگی (یہ ستاروں کی آواز تھی جو فرشتے کے کہنے کے مطابق اب زمین پر رہنے والوں کے لیے کچھ باتیں کرتے ہیں)۔

۲.۴۔ تیسرا بند

حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیزگام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں اس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

۲.۴.۱ توضیحات

ازل: دنیا کی پیدائش سے پہلے کا وقت جس کی کوئی ابتداء نہ ہو۔
حسن ازل: حسن باری تعالیٰ، خدا کی ذات کا جلوہ
دلبری: دلکشی، خوبصورتی
آرسی: عورتوں کے انگوٹھے میں پہننے کا زیور جس میں شیشہ جڑا ہوتا ہے۔
شبنم آرسی: شبنم کا قطرہ جو شیشے کی مانند چمکتا ہے۔
آئینِ نو: نئے دستور، نئے طور طریقے
طرزِ کہن: پرانے طور طریقے، ماضی کے رسوم و رواج یا روایات

اُڑنا: جمنا، ضد کرنا

منزل: ٹھہرنے کی جگہ، مرحلہ

کٹھن: مشکل

کاروانِ ہستی: زندگی کا قافلہ

تیز گام: تیز رفتار

رواروی: چل چلاؤ، تیز رفتاری

برادری: رشتہ دار، بھائی بند، قوم کے لوگ

جذب باہمی: ایک دوسرے کو کھینچنا، کشش

پوشیدہ: چھپا ہوا

۲.۴.۲۔ تشریحات

پہلا شعر:

تاروں کی چمک دمک میں اللہ تعالیٰ کا حسن اس طرح نظر آتا ہے جس طرح شبنم کے قطرے میں پھول کا عکس نظر آتا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا جب فرشتے نے ستاروں سے خطاب کیا تھا تو تارے اس تابندگی، حسن اور نور کو خالق کائنات کی صفت قرار دیتے ہیں اور اپنے آپ کو ذاتِ باری تعالیٰ کی اس صفت کا مظہر (ظاہر ہونے کی جگہ) قرار دیتے ہیں یعنی وہ صرف آئینہ ہیں حسن اس ذات کا ہے جو اس ذات میں منعکس ہے۔ بالکل اس طرح جیسے شبنم کے قطرے میں پھول کا حسن جھلکتا ہے۔

دوسرا شعر:

زندگی کے لیے قاعدوں اور تقاضوں سے ڈرنا اور پرانے طور طریقوں ہی کو اختیار کیے رہنے پر اصرار کرنا۔ قوموں کی زندگی میں ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔

وقت اور زمانے کی گردش دنیا میں انقلاب برپا کرتی رہی ہے، ان انقلابات اور تغیرات (تبدیلیوں) کے ساتھ قوموں کے لیے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی میں مناسب تبدیلی پیدا کریں تاکہ وقت کا ساتھ دے سکیں۔ قدیم اور جدید کی اس کشمکش سے ہر قوم کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ کشمکش قوم کی قوتِ فیصلہ کے لیے بڑی آزمائش ہوتی ہے اس بات کے فیصلے پر اس کی بقاء کا انحصار ہوتا ہے جو قوم کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی میں مناسب تبدیلی لے آنے میں کامیاب ہو جاتی ہے وہ زندہ رہتی ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ قدم ملا کر ترقی کرتی جاتی ہے لیکن اس کے برعکس جو قوم جدید تقاضوں اور جدید تبدیلیوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور لکیر کی فقیر بن کر پرانے طور طریقوں ہی کے مطابق زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتی ہے وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہے اور اس کی بقاء خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

اس کشمکش کا سب سے زیادہ نقصان ملی وحدت اور اجتماعی قوت کو پہنچتا ہے کیونکہ قوم کی قوت فیصلہ کی کمی اس کو مختلف الخیال طبقوں میں تقسیم کر دیتی ہے یہ طبقے آپس میں بحث مباحثے کرتے ہیں، گالی گلوچ کا بازار گرم ہوتا ہے فتوے بازیاں ہوتی ہیں اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنے ہی افراد کے ہاتھوں قوم انتشار کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

زندگی کا قافلہ بہت تیز رفتار ہے، کتنی ہی قومیں اس کی تیز رفتاری میں کچلی جا چکی ہیں۔

اس شعر کا مطلب اس سے پہلے شعر کی تشریح میں تقریباً بیان ہو چکا ہے جو قومیں وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتیں اور پیچھے رہ جاتی ہیں، انہیں ان کے پیچھے آنیوالی قومیں جو وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ دے رہی ہوتی ہیں روندتی اور کچلتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔

چوتھا شعر:

(ستارے کہتے ہیں کہ) اگرچہ ہزاروں ستارے ہماری نظروں سے اوجھل اور غائب ہیں لیکن ہم پھر بھی انہیں اپنی برادری یا قوم میں شمار کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے ستاروں کی زبانی انسانوں اور خصوصاً مسلمانوں کو یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ ہم صرف انہی کو انسان یا مسلمان نہ سمجھیں جو ہماری نظروں کے سامنے ہیں یا ہمارے قریب یعنی ہمارے شہر یا وطن میں رہتے ہیں بلکہ ساری دنیا میں انسان بستے ہیں اور وہ سب انسانی برادری کا حصہ ہیں، مسلمان تو یوں بھی آپس میں بھائی بھائی ہیں وہ تو روحانی رشتے میں منسلک ہیں اور دنیا میں جہاں کہیں بھی رہتے ہیں، بغیر کسی نسلی یا ملکی امتیاز کے ملتِ اسلامیہ کے جزو ہیں بس وہ کیوں اپنے آپ کو جغرافیائی حدود میں محدود سمجھیں اور اس بنیاد پر وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے علیحدہ یا جدا قرار دیں۔

علامہ اقبال اس شعر میں مسلمانوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اسلام میں جغرافیائی، ملکی، وطنی، نسلی یا لسانی امتیازات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مسلمان خواہ ہندی ہو یا خراسانی، ایرانی ہو یا شامی وہ اول و آخر مسلمان ہوتا ہے اور اسی رشتے سے وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا بھائی ہے۔ اسلام اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی کا درس دیتا ہے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کے اس بھائی چارے کی تعلیم کو اپنائیں، اپنی نظر میں وسعت پیدا کریں اور صرف انہی کو مسلمان اور اپنا بھائی نہ سمجھیں جو ان کے ملک یا وطن میں رہتے ہیں بلکہ ان مسلمانوں سے بھی اپنا رشتہ جوڑیں جو ان کے ملک یا وطن سے دور رہتے ہیں۔

پانچواں شعر:

ستارے اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ جس بات کو زمین پر رہنے والے آج تک نہ سمجھ سکے اسے ہم تھوڑی سی زندگی میں سمجھ سکیں۔

تھوڑی سی زندگی اس لیے کہا کیونکہ ستارے ٹوٹتے اور مٹتے رہتے ہیں۔

چھٹا شعر:

اور وہ بات اور وہ نکتہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام نظام آپس کی کشش کے باعث قائم ہیں تاروں کی زندگی میں یہی نکتہ چھپا ہوا (پوشیدہ) ہے، یہ بات بالکل واضح ہے کہ نظام کوئی بھی ہو جب تک اس کے مختلف حصوں میں مکمل ہم آہنگی اور نظم و ضبط نہیں ہوگا، وہ نظام قائم نہیں رہ سکے گا مثلاً چاند، سورج اور ستاروں ہی کے نظام کو دیکھئے یہ نظام صرف اس لیے قائم ہے کہ ان سب کے درمیان ایک خاص کشش ہے جس نے انہیں فضا میں روکا ہوا ہے اور یہ نظم و ضبط کے ساتھ اپنے اپنے دائرے میں گردش کر رہے ہیں اگر اس کشش میں ذرہ بھر بھی فرق آجائے یا اس نظام میں ذرا سا بھی خلل واقع ہو جائے تو پلک جھپکنے میں یہ نظام درہم برہم ہو جائیگا بالکل اسی طرح قومی زندگی کا نظام ہے اگر اس نظام کے مختلف حصے (افراد یا گروہ یا جماعتیں) محبت کے رشتے میں منسلک نہ ہوں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے محبت کی کشش محسوس نہ کریں یا ان کے درمیان ہم آہنگی اور ربط و ضبط نہ ہو تو یہ قومی زندگی کا نظام بھی قائم نہیں رہ سکتا اور ایسی صورت میں قوم کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

۳۔ نظم کا تجزیہ

آپ نے پوری نظم پڑھ لی آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبال نے کس خوبصورتی سے ستاروں کی زبانی اپنا پیغام قوم تک پہنچایا۔ آپ کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہو گیا ہو گا کہ اتنی اچھی باتیں علامہ صاحب نے قوم سے براہ راست کیوں نہ کیں آخر ستاروں کی معرفت اپنے خیالات پہنچانے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کا سوال اپنی جگہ درست ہے لیکن یہ بات بھی غالباً آپ جانتے ہوں گے کہ براہ راست نصیحتیں انسانی طبیعت پر ناگوار گزرتی ہیں اور ان کا اثر بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی باتیں عموماً کسی واسطے سے کی جاتی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ آپ نے پہلا بند پڑھا۔ کس قدر خوبصورت منظر کشی ہے۔ دن ڈھلنا، سورج کا ڈوبنا، شام کا آنا، رات کی تاریکی کا چھانا، خاموشی کا پھیلنا، ستاروں کا نکلنا، غرض اس دلفریب منظر میں ہم کھو جاتے ہیں، پھر اچانک ایک فرشتے کی آواز نظم کی دلچسپی اور ہماری دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیتی ہے۔ ساری فضا پراسراری ہو جاتی ہے۔ ہم یہ جاننے کے لیے بے تاب سے ہو جاتے ہیں کہ دیکھیں فرشتہ ستاروں سے کیا کہتا ہے اور کیوں کہتا ہے جب فرشتہ ستاروں سے یہ کہتا ہے کہ چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے اور شاید سنیں صدائیں اہلِ زمین تمہاری تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ کوئی ہمارا ہی ہے جس کا چرچا آسمانوں اور فضاؤں میں ہو رہا ہے، ظاہر ہے یہ جاننے کے بعد ہماری دلچسپی اور محویت انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور ہم پوری توجہ کے ساتھ وہ باتیں سننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جو علامہ صاحب ہم تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

نظم کے تینوں بندوں میں سے سب سے زیادہ اہم بند آخری ہے جس میں علامہ اقبال نے اپنے افکار پیش کیے ہیں اور آخری شعر اس نظم کے مرکزی خیال میں پیش کرتا ہے۔ نظم لکھنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کو بیدار کیا جائے۔ انہیں احساس دلایا جائے کہ قومیں وقت کی دوڑ میں ان سے آگے نکلی جا رہی ہیں اس لیے وہ بھی قدیم اور جدید کی بحث میں نہ الجھے رہیں بلکہ وقت کا ساتھ دیں تاکہ اس دور میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کریں اور جغرافیائی یا علاقائی امتیازات کو ختم کر دیں۔ اپنے قومی نظام کو آپس کی محبت اور اتفاق و اتحاد کے جذبے سے مضبوط کریں۔ ستاروں کے نظام ہی کی مثال دے کر علامہ اقبال نے پوری نظم کو اس کے عنوان یعنی ''بزمِ انجم'' کے ساتھ مربوط کر دیا ہے اور ہم یہ سمجھ جاتے ہیں کہ نظم کا عنوان ''بزمِ انجم'' کیوں رکھا گیا اور ستاروں کی زبانی اپنے خیالات کیوں پیش کیے گئے۔

۴۔ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اس مختصر سی نظم میں علامہ اقبال نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ حالات خواہ کسی بھی قسم کے ہوں، افراد کو ملت کے ساتھ مضبوط رابطہ قائم رکھنا چاہیئے، قوموں پر اچھا بُرا وقت آتا رہتا ہے جو افراد صرف اچھے وقت میں قوم کے ساتھ رہتے ہیں وہ برا وقت پڑنے پر اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وقتی طور پر انہیں کچھ فائدہ حاصل ہو جائے لیکن انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قوموں پر زوال ہمیشہ نہیں رہتا، وہ ڈوب کر ابھر بھی آتی ہیں۔ زوال کے بعد انہیں عروج حاصل ہوتا ہے یہ دنیا کا اٹل اصول ہے یہاں پستی کے بعد بلندی ہے۔ ہر خزاں کے بعد بہار بھی آتی ہے پس وہ افراد جو مصیبت میں قوم کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں جب اس قوم پر اچھا وقت آتا ہے، اس کو پھر عروج حاصل ہوتا ہے اور پھر بہار آتی ہے تو ایسے خود غرض افراد کا قوم کے اس عروج اور ترقی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ قوم کی خوشحالی اور بلند اقبالی کے حصہ دار نہیں ہو سکتے۔ اب ان کے مقدر مین سوائے خزاں کی محرومی کے اور کچھ نہیں ہے بالکل اس طرح جیسے ایک شاخ جو خزاں کے موسم میں درخت سے ٹوٹ جاتی ہیں جب موسم بہار میں اس درخت پر دوبارہ پھول پھل لگتے ہیں تو وہ بہار کے اس فیض سے محروم رہتی ہے اور پھر نہ پتے لگتے ہیں نہ پھول کھلتے ہیں اور نہ پھل آتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے خشک ہو جاتی ہے۔

اس نظم میں علامہ اقبال نے درخت اور اس ٹوٹی ہوئی شاخ کی مثال سے فرد اور جماعت کے تعلق کو بڑے موثر اور محسوس انداز میں سمجھایا ہے اس نظم میں درخت یا شجر سے مراد ملت ہے اور شاخ سے مراد فرد ہے جس طرح شاخ درخت سے علیحدہ ہو کر اپنی زندگی سے محروم ہو جاتی ہے اسی طرح فرد ملت سے کٹ کر اپنی ہستی اور اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے اگر غور کیا جائے تو اس صورت میں زیادہ نقصان فرد ہی کا ہوتا ہے کیونکہ جس طرح درخت سے دو چار شاخیں ٹوٹ جائیں تو درخت کو کوئی فرق نہیں پڑتا، شاخوں ہی کو نقصان پہنچتا ہے اسی طرح افراد آتے جاتے ہیں ملت قائم رہتی ہے اگر ملت سے کچھ افراد علیحدگی بھی اختیار

کر لیں تو ملت کو اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا ان افراد کو جو اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اس لیے علامہ صاحب نے افراد کو خبردار کیا ہے کہ تمہارا وجود، تمہاری زندگی، تمہاری بقاء ملت کے دم سے ہے اس کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ پیوستہ رہو اور اگر برے دن ہیں تو متحد رہ کر حالات کا مقابلہ کرو اور اچھے دنوں کا انتظار کرو، نظم کا آخری شعر پوری نظم کے مضمون کی وضاحت کر دیتا ہے جو یہ ہے۔

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ　　　پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

۱.۴　نظم کا متن

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے

ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

ہے تیرے گلستان میں بھی فصلِ خزاں کا دور
خالی ہے جیب گل زر کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوت اوراق میں طیور
رخصت ہوئے تیرے شجر سایہ دار سے

شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدہ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!

۴،۴ توضیحات

مشکل الفاظ کی تشریح

شعر نمبر ۱:

فصل:	موسم
خزاں:	پت جھڑ کا موسم (مراد برے دن)
سحاب:	بادل

شعر نمبر ۲:

لازوال: ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اچھا

عہد:	دور
واسطہ:	تعلق
برگ و بار:	برگ (پتے) بار (پھل)

شعر نمبر ۳:

گلستان:	باغ، یہاں مراد ملک و قوم
جیب:	جیب، گریبان
زر:	سونا
عیار:	کسوٹی، وہ پتھر جس پر سونے کو پرکھتے ہیں
کامل:	پورا
زر کامل عیار:	کسوٹی پر کھرا یا پورا اترنے والا سونا مراد سچا جذبہ عشق یا وہ اعلیٰ انسانی صلاحیتیں جو قوم کی ترقی کا باعث بنتی ہیں

شعر نمبر ۴:

نغمہ زن: نغمہ گانے والا

خلوت: تنہائی

اوراق: جمع ورق کی، پتے، درخت کے پتے: مراد تنہائی کے گوشے

طیور: جمع طائر کی ہے: پرندہ

پرندے: نظم میں مراد جذبہ عشق سے سرشار افراد

شجر سایہ دار: سایہ دار درخت، ہرا بھرا درخت

مراد ملت جب اسے عروج حاصل تھا

شعر نمبر ۵:

بریدہ: کٹی ہوئی

شاخ بریدہ: کٹی ہوئی شاخ

سبق اندوز ہونا: سبق حاصل کرنا

ناآشنا: ناواقف

آئین: دستور، طریقہ

روزگار: زمانہ، طریقہ

شعر نمبر ۶:

رابطہ: تعلق

استوار: مضبوط

پیوستہ: پیوستہ سے مراد جڑا ہوا، ملا ہوا

امید بہار: بہار کی امید یعنی اچھے دنوں کی امید

تشریحات

شعر نمبرا: موسم خزاں میں جو شاخ درخت سے ٹوٹ جاتی ہے پھر ممکن نہیں کہ وہ بہار کے بادل سے سرسبز ہو جائے یعنی موسمِ بہار آنے پر بھی وہ خشک ہی رہتی ہے۔

شعر نمبر۲: اس ٹوٹی ہوئی شاخ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خزاں آجاتی ہے اور اس کا پتوں اور پھلوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا کیونکہ اس کا تعلق اس درخت سے ٹوٹ جاتا ہے جس کی جڑ سے اس کی زندگی قائم تھی۔

پہلے دو شعر ایک بات کو سمجھانے کے لیے مثال کے طور پر لکھے گئے۔ اب ایک بات ذہن نشین کرانے کے بعد علامہ اقبال اسی قسم کی ایک اور صورتحال کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

شعر نمبر۳: (اے مسلمان نوجوان) تیرے ملک اور قوم پر بھی خزاں کا دور آیا ہوا ہے اور قوم کے افراد کے دامن جذبہ عشق یا اعلیٰ انسانی صلاحیتوں سے خالی ہیں (زرِ کامل عیار کی مشکل الفاظ کے ضمن میں تشریح کی جا چکی ہے) آپ نے دیکھا ہوگا کہ پھول جب کھلتا ہے تو اس کے اندر اور درمیان میں چھوٹے چھوٹے ریشے ہوتے ہیں جو پھول کے خشک ہونے پر بیج بن جاتے ہیں ان ریشوں کو پھول کا زیرہ کہتے ہیں اور انہی کو زرِ گل بھی کہتے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ پھول کے سینے میں یہ زیرہ جو بعد میں بیج بنتا ہے اس کی افزائش کا ذریعہ ہوتا ہے اس کی زندگی کا سامان ہوتا ہے۔

اس شعر میں پھول سے مراد قوم کے افراد ہیں جب قوم کو زوال آیا تو افراد کے سینے بھی جذبہ عشق سے خالی ہو گئے جو ان کی اور ان کی قوم کی زندگی کی افزائش، ترقی اور بقاء کا ذریعہ تھا۔ شعر کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ قوم پر جب زوال آتا ہے تو قوم اعلیٰ انسانی صلاحیتوں کے افراد سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کو قحط الرجال کہتے ہیں یعنی ذہین، دانشمند اور باصلاحیت افراد کا قحط یا کمی۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کے سینے اس جذبہ عشق سے آباد رہے یعنی احکام الٰہی کی روشنی میں اعلیٰ مقاصد کے حصول کی سچی تڑپ اور لگن ان کے دل میں کروٹیں لیتی رہی۔ بہترین صلاحیتوں کے افراد پیدا ہوتے رہے اور ملت بھی ترقی کرتی رہی لیکن چونکہ اب افراد کے دلوں میں عشق کی

وہ تڑپ اور مقاصد کے حصول کی وہ جستجو نہیں رہی، اس لیے قوم کو بھی زوال آ گیا ہے۔ (زر کامل عیار سے مراد سچا اور خالص جذبہ عشق ہے)

شعر نمبر۴:

جو پرندے پتوں کی تنہائیوں میں بیٹھ کر نغمے گاتے تھے وہ اب اس شجر سایہ دار (یعنی ملتِ اسلامیہ) سے رخصت ہو گئے۔

طیور سے مراد وہ افراد ہیں جن کا عشق اور عمل قوم کے وجود کی رونق تھا۔ پتوں کی تنہائی میں بیٹھ کر نغمے گانے سے مراد گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر ذکر و فکر کرنا ہے، آپ کو معلوم ہے ایسے ذہین اور بہترین صلاحیتوں کے افراد قوم کا دل اور دماغ ہوتے ہیں یہ لوگ دنیا کے ہنگاموں سے دور ہیں اور تنہائی میں بیٹھ کر غور و فکر کرتے ہیں۔ عالم، فلسفی، دانشور اور صاحبِ نظر لوگوں ہی سے قوموں کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور وہ ترقی کرتی ہیں انہیں عروج حاصل ہوتا ہے جب قوم میں یہ لوگ نہ رہیں تو قوم کی ترقی رک جاتی ہے اور وہ زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس شعر میں علامہ صاحب نے یہ بات بیان کی ہے کہ جب تک قوم میں ایسے صاحبِ عشق، صاحبِ دل و دماغ اور صاحبِ نظر لوگ موجود رہے قوم بھی ترقی کرتی رہی لیکن اب چونکہ قوم سے ایسے اعلیٰ صلاحیتوں والے افراد رخصت ہو چکے ہیں اس لیے قوم کو بھی زوال آ گیا ہے اور اس کی ماضی کی تمام شان و شوکت ختم ہو گئی ہے۔

شعر نمبر۵:

قوم کی حالت بتانے اور دکھانے کے بعد علامہ صاحب پھر نظم کے پہلے دو شعروں کی طرف سے لوٹے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے نوجوان۔ تو درخت سے کٹی ہوئی شاخ سے سبق حاصل کر چونکہ تو ابھی ناتجربہ کار ہے اس لیے زمانے کے طور طریقوں سے واقف نہیں ہے۔

شعر نمبر ۶:

(وہ سبق یہ ہے کہ) اپنی ملت کے ساتھ مضبوط رابطہ قائم رکھ اور اچھے دنوں کا انتظار کر، بالکل اس طرح جیسے شاخ درخت سے جڑی رہ کر ہی بہار کی امید کر سکتی ہے۔

اس شعر کا پہلا مصرع نظم کے پورے مضمون کو بیان کر دیتا ہے، یہ نظم درحقیقت اسی ایک مصرع کی وضاحت کے لیے لکھی گئی، دوسرا مصرع نظم کے دو پہلے شعروں کی طرف ذہن کو لے جانے کے لیے لایا گیا ہے اس آخری مصرے کو (یعنی پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ) نظم کے دو پہلے شعروں کے ساتھ ملا کر پڑھئے تو نظم کا مضمون خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح ایک شاخ درخت سے علیحدہ ہو کر سوکھ جاتی ہے اس پر کبھی بہار نہیں آتی اسی طرح جو افراد برے وقت میں قوم کا ساتھ نہیں دیتے وہ بھی سخت نقصان میں رہتے ہیں کیونکہ جب قوم کے دوبارہ دن پھرتے ہیں اور اسے ترقی اور عروج حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اس کی ترقی اور خوشحالی سے محروم رہتے ہیں جیسا کہ آپ ابتداء مین پڑھ چکے ہیں کہ فرد کا وجود قوم کے بغیر بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کی تکمیل اور صلاحیتوں کی نشوونما صرف قوم کے وجود کے ذریعہ ہو سکتی ہے جب قوم ہی سے اس نے اپنا رابطہ ختم کر لیا تو پھر اس کی شخصیت کے امکانات اور صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع ختم ہو گئے اور اس طرح اس کی ہستی اور اس کا وجود بے معنی ہو گیا لہٰذا اقوام پر خواہ کتنا ہی برا وقت کیوں نہ آیا ہو افراد کو اس کے ساتھ اپنا رابطہ ہر صورت میں مضبوطی کے ساتھ برقرار رکھنا چاہیے اور صرف اسی صورت میں وہ ترقی اور خوشحالی کی امید رکھ سکتے ہیں۔

۴.۴۔ نظم کا تجزیہ

اس نظم کے مطالعہ کے بعد آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ نظم اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے معنی بہت وسیع اور گہرے ہیں یہ الفاظ درحقیقت علامتیں ہیں اور جب الفاظ اس صررت میں الفاظ ہو رہے ہوں تو ان کے معنوں کا تعین بہت غور اور توجہ چاہتا ہے۔ نظم کے دو پہلے اشعار

میں الفاظ اپنے اصل معنوں میں استعمال ہوئے ہیں یعنی ڈالی سے مراد شاخ ہی ہے اور فصلِ خزاں سے مراد خزاں کا موسم ہے لیکن تیسرے شعر سے الفاظ اپنے اصل معنون کے بجائے کچھ اور معنی دینے لگتے ہیں جنہیں ہم نے گزشتہ سطور میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اب بہار اور خزاں سے مراد موسم نہیں ہیں بلکہ قوم کے عروج اور زوال کا زمانہ ہے گلستان کا مطلب باغ نہیں ہے بلکہ ملک اور قوم ہے۔ پھول افراد کے معنی دیتا ہے طیور پرندے نہیں بلکہ صاحبِ نظر اور عاشق لوگ ہیں۔ شجر سایہ دار ملت کے عروج اور اقبال کی علامت ہے غرض ان دو شعروں میں علامہ اقبال نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے یعنی قوم کے عروج و زوال کی داستان سنا دی ہے۔ قوم کس قسم کے حالات میں ترقی کرتی ہے کس قسم کے لوگ اس کی عظمت اور عروج کا باعث ہوتے ہیں۔ مسلمان قوم کیوں ذلیل اور خوار ہو گئی اسے کیوں زوال آ گیا۔ قوم کے افراد کی حالت کیسی ہے، وہ کن صلاحیتوں سے محروم ہیں؟ غرض یہ سب باتیں صرف دو شعروں میں بیان کر دی گئی ہیں۔

پانچویں شعر میں علامہ اقبال نے پھر درخت سے ٹوٹی ہوئی شاخ کا ذکر کیا ہے لیکن اب یہ ٹوٹی ہوئی شاخ ایک نئے مطلب اور مفہوم لے کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اب وہ محض شاخ نہیں رہتی بلکہ فرد اور قوم کے تعلق کو واضح کرنے کی ایک عمدہ مثال بن گئی ہے اور آخری شعر کو پڑھ کر یہ بات ہماری سمجھ میں آجاتی ہے کہ علامہ اقبال نے درخت، فصلِ خزاں، درخت سے ٹوٹی ہوئی ڈالی وغیرہ کا ابتداء میں کیوں ذکر کیا۔

اس نظم کا اگر نفسِ مضمون کے اعتبار سے نظم ''بزمِ انجم'' کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نظم میں علامہ اقبال نے فرد کے ملت کے ساتھ مضبوط رابطہ کی اہمیت بتائی ہے اور یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ افراد کی بہتری اور بھلائی اسی میں ہے کہ وہ ملت کے ساتھ وابستہ اور پیوستہ رہیں خواہ قوم کتنی ہی مصیبت میں کیوں نہ ہو۔ آپ ''بزمِ انجم'' کے مطلب سے آگاہ ہو ہی چکے ہیں جہاں علامہ صاحب نے یہ بات سمجھائی ہے کہ قومی نظام آپس کی محبت اور اتفاق کے سہارے چلتا ہے، قائم رہتا ہے اور مستحکم ہوتا ہے اب آپ اگر دونوں نظموں کو ساتھ ملا کر پڑھیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ

اجتماعی نظام کی کامیابی اور ایک صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے مختلف طبقوں، گروہوں، جماعتوں اور افراد کے نام کسی قسم کا اختلاف اور انتشار نہ ہو، صوبائی تعصب نہ ہو، نسلی امتیاز اور علاقائی خودمختاری کا مسئلہ نہ ہو، لسانی اور تہذیبی جھگڑے نہ ہوں بلکہ قومی مفاد اور قومی ترقی اور استحکام کی خاطر اس قسم کے مسائل کو ختم کر دینا چاہیے اور تمام افراد اور طبقوں کو باہمی محبت! اتفاق اور اتحاد کے ساتھ قومی نظام کو چلانا چاہیے صرف اسی صورت میں قومی وحدت برقرار رہ سکتی ہے۔

یہ تو عام حالات میں قومی زندگی کو انتشار اور کمزوری سے بچائے رکھنے کی صورت ہوئی لیکن اگر قوم زوال کا شکار ہو اور مصیبت میں گرفتار ہو، تو ایسی صورت میں افراد کو کیا کرنا چاہیے، قوم کا ساتھ دیتے رہنا چاہیے یا قوم سے علیحدہ ہو جانا چاہیے؟ اس سوال کا جواب ظاہر ہے یہی ہے کہ افراد کو اس حالت میں بھی قوم کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ ان کا نفع یا نقصان قوم کے نفع نقصان سے وابستہ ہوتا ہے انہیں ہر صورت میں اپنے مفادات سے زیادہ قوم کے مفادات کا خیال رکھنا چاہیے یہی ایثار اور حوصلہ مندی ہے، اور قوم کے ساتھ رابطہ اور تعلق رکھنے ہی میں ان کی فلاح اور بہتری ہے۔

۵۔خود آزمائی

(الف) ان سوالوں کا جواب ہاں یا نہیں کی صورت میں دیجیے۔

۱۔ قوم افراد کا مجموعہ ہوتی ہے جی ہاں / جی نہیں
۲۔ افراد کو قومی مفادات کی خاطر ایثار سے کام لینا چاہیے۔ جی ہاں / جی نہیں
۳۔ قوموں کو حال کے تقاضوں سے منہ موڑ کر قدیم طور طریقوں کو اختیار کرنا چاہیے۔
جی ہاں / جی نہیں
۴۔ قوموں کو وقت اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی میں تبدیلی لانی چاہیے۔ جی ہاں / جی نہیں
۵۔ جو لوگ ہم سے دور دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں وہ انسانی برادری کا حصہ نہیں ہیں۔
جی ہاں / جی نہیں
۶۔ اگر ستاروں کے درمیان باہمی کشش باقی نہ رہے تو کیا یہ نظام قائم رہ سکتا ہے۔
جی ہاں / جی نہیں
۷۔ اگر قوم کے افراد کے نام باہمی کشش اور محبت کا جذبہ باقی نہ رہے تو کیا قومی نظام برقرار رہ سکتا ہے۔
جی ہاں / جی نہیں
۸۔ قوم پر اگر برا وقت آن پڑے تو افراد کو اس کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔ جی ہاں / جی نہیں
۹۔ مصیبت کے وقت قوم کا ساتھ دینے سے قوم مضبوط رہتی ہے۔ جی ہاں / جی نہیں
۱۰۔ قوم کا نفع و نقصان فرد کا بھی نفع و نقصان ہوتا ہے کہ نہیں۔ جی ہاں / جی نہیں

(ب) صحیح جواب پر نشان لگائیے۔

۱۔ کٹی ہوئی شاخ سے ہمیں کیا سبق حاصل ہوتا ہے	مصیبت میں قوم کے ساتھ رہنا چاہیے
مصیبت میں قوم سے علیحدہ ہونا چاہیے۔

۲۔ نظم پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ
کا مرکزی خیال کون سے شعر میں بیان ہوا ہے۔	پہلے شعر میں / پانچویں شعر میں / آخری شعر میں

۳۔ اجتماعی نظام سے اتحاد اور استحکام پر کونسی نظم میں زور دیا گیا ہے۔	بزمِ انجم / پیوستہ رہ شجر سے

۴۔ فرد اور ملت کے تعلق پر کونسی نظم میں توجہ دلائی گئی ہے۔	بزمِ انجم / پیوستہ رہ شجر سے

۵۔ ستاروں کے نظام سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے۔	محبت اور اتفاق کے ساتھ رہنا چاہیے
سب کو الگ الگ رہنا چاہیے۔

(ج) نظم میں ان الفاظ کا مطلب کیا ہے۔

ا۔	شجر	درخت / قوم / زمین
ب۔	گلستان	باغ، چمن / ملک و قوم
ج۔	فصلِ خزاں	پت جھڑ کا موسم / سردی کا موسم / قوم کے زوال کا زمانہ
د۔	طیور	پرندے / صاحبِ عشق افراد
ر۔	زرِ کامل عیار	خالص سونا / کسوٹی پر کھرا اترنے والا سونا / اعلیٰ اور بہترین صلاحیتیں

۶۔ جوابات

(الف)

۱۔ جی ہاں	۷۔ جی نہیں
۲۔ جی ہاں	۸۔ جی نہیں
۳۔ جی نہیں	۹۔ جی ہاں
۴۔ جی ہاں	۱۰۔ جی ہاں
۵۔ جی نہیں	
۶۔ جی نہیں	

(ب) ۱۔ مصیبت میں قوم کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ۲۔ آخری شعر میں

۳۔ بزم انجم ۴۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

۵۔ محبت اور اتفاق کے ساتھ رہنا چاہیے۔

(ج)

ا۔ قوم ب۔ ملک اور قوم ج۔ قوم کے زوال کا زمانہ

د۔ صاحب عشق افراد ر۔ اعلیٰ اور بہترین صلاحیتیں

یونٹ......۱۱۔۱۲

نثرِ اقبال

تحریر:
ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی

فہرست

عنوان	صفحات
تعارف	348
یونٹ کے مقاصد	348
۱۔ علامہ اقبال کی اردو نثر	349
۱.۱۔ علامہ اقبال کا سفرنامہ	351
۲۔ اقبال کے خطوط	353
۲.۱۔ توضیحات	370
۲.۲۔ خودآزمائی نمبر 1	374
۳۔ خطبہء عیدالفطر	376
۳.۱۔ خطبے کے اہم نکات	377
۳.۲۔ خطبے کا متن	378
۳.۳۔ توضیحات	383
۳.۴۔ خودآزمائی نمبر 2	385
۴۔ جوابات	387

یونٹ کا تعارف

علامہ اقبال کی بنیادی حیثیت تو شاعر ہی کی ہے لیکن وہ مختلف موضوعات پر نثر بھی لکھتے رہے ہیں ان کی نثر بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے اس سے ان کی شاعری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ان کی نثر میں سب سے بڑا سرمایہ ان کے خطوط کا ہے جس کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

یونٹ کے مقاصد

ان یونٹوں کے مطالعے کے بعد امید ہے آپ اس قابل ہو سکیں گے کہ:

۱۔ علامہ کی نثر اور اس کی قدر و قیمت کا جائزہ لے سکیں۔

۲۔ ان یونٹوں میں شامل علامہ کے نثر کے نمونوں کی وضاحت کر سکیں۔

۳۔ علامہ کی نثر اور ان کی شاعری کے تعلق کو سمجھ سکیں۔

1۔علامہ اقبال کی اردو نثر

علامہ اقبال کی شہرت زیادہ تر ان کی شاعری کی وجہ سے ہے اور خود انہوں نے بھی شاعری پر زیادہ توجہ دی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے کبھی نثر نہیں لکھی بلکہ یہ بات شاید تعجب خیز معلوم ہو کہ علامہ نے اپنی پہلی کتاب ''علم الاقتصاد'' نثر میں لکھی۔ انہوں نے نثر میں زیادہ نہیں لکھا لیکن اس کے باوجود وہ نثر میں بھی باقاعدگی سے لکھتے رہے ہیں۔ ان کا پہلا نثری مضمون ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' کے عنوان سے ۱۹۰۲ء میں رسالہ ''مخزن'' لاہور میں شائع ہوا اور ان کا آخری مضمون ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ''جغرافیائی حدود اور مسلمان'' کے موضوع پر شائع ہوا۔ علامہ اس دوران کبھی کبھار نثر میں بھی لکھتے رہے لیکن علامہ کی شاعری کے مقابلے میں ان کی نثر کو وہ اہمیت نہیں مل سکی جو اسے ملنی چاہیے تھی۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کی نثر کے مقابلے میں زیادہ دلآویز ہے۔ نثر میں ''علم الاقتصاد'' کے سوا علامہ کی کوئی مستقل تصنیف بھی نہیں ہے۔ ان کے مقالات اخباروں اور رسالوں میں چھپے۔ لوگ ان سے متاثر بھی ہوئے لیکن وہ لوگوں کے حافظے میں زیادہ دیر تک نہ رہ سکے۔ علامہ کے خطبات اور مقالات کو پہلی بار ۱۹۴۴ء میں تصدق حسین تاج نے حیدرآباد سے ''مضامین اقبال'' کے نام سے شائع کیا اور ۱۹۶۳ء میں انہی کی بنیاد پر سید عبدالواحد معینی نے کچھ اضافوں کے ساتھ ''مقالات اقبال'' کو شائع کیا۔

علامہ اقبال کا نثری سرمایہ:

علامہ اقبال کے نثری سرمائے کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(الف) مکاتیب اقبال

علامہ اقبال نے خطوط کا ایک بیش بہا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں یہ اقبالیات کے موضوع پر معلومات کا ایک گرانقدر خزینہ ہیں۔ ان میں ''اقبالنامہ'' مرتبہ شیخ عطاالله خاص طور پر قابل ذکر ہیں باقی مجموعوں میں سے بعض کا ذکر آپ یونٹ نمبر ۳ میں پڑھ چکے ہیں۔

(ب) علم الاقتصاد

معاشیات کے موضوع پر علامہ اقبال کی یہ تصنیف ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ جدید معاشیات پر اردو زبان میں چند اولین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اقبال اکیڈمی کراچی نے ۱۹۶۱ء میں اس کا نیا ایڈیشن کراچی سے شائع کیا ہے۔ اس کی زبان کی اصلاح چونکہ مولانا شبلی نعمانی نے کی تھی اس لئے شبلی اور اقبال کے روابط کے سلسلہ کی یہ ایک اہم کڑی ہے۔

(ج) مقالات وخطبات

علامہ اقبال کے مقالات، خطبات اور متفرق تحریروں پر مبنی کئی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن

میں سے کچھ مجموعوں کے بارے میں آپ یونٹ نمبر ۳ میں پڑھ چکے ہیں۔

علامہ اقبال کا نثری سرمایہ اپنی مقدار کے اعتبار سے بھی کم نہیں اور اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر محمد عثمان نے ایک مقالے میں اقبال کی نثر کو عظیم نثر قرار دیا ہے اور ان کے بقول شاعری کے ساتھ ساتھ ہر دوسرے یا تیسرے سال یا یوں کہنا چاہیے کہ زندگی کے ہر اہم موڑ پر علامہ نے اردو یا انگریزی میں ایک نہ ایک طویل اور جامع مضمون قریب قریب باقاعدگی کے ساتھ سپرد قلم فرمایا۔ علامہ کی ان تحریروں نے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے ذہنوں پر گہرے نقوش چھوڑے بلکہ پاک وہند کی پوری سیاسی اور معاشرتی فضا ان سے متاثر ہوئی۔ ان تحریروں کی قوت نے درحقیقت وقت کے پہاڑ اور تاریخ کا رخ متعین کرنے میں اہم حصہ لیا ہے۔

نثر اقبال کی تاریخی اور سیاسی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن یہ ادبی اعتبار سے بھی اردو نثر کے بلند پایہ نمونوں میں جگہ پاتی ہے۔ سید احمد خان نے اردو میں علمی نثر کا آغاز کیا، شبلی اور سید سلیمان ندوی نے اسے آگے بڑھایا اور علامہ کے ہاتھوں یہ نثر اپنے کمال کو پہنچی۔

علامہ اقبال کے خطوط میں نثر کے مختلف اسلوب ملتے ہیں۔ دراصل ان کے ہاں خط کا اسلوب خط کے مقصد مضمون اور مکتوب الیہ کے ساتھ ان کے تعلقات سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ مولانا گرامی جیسے بے تکلف دوست کو انھوں نے بڑے شگفتہ خط لکھے ہیں۔ جن خطوط کا موضوع علمی یا سیاسی ہے ان کا اسلوب نسبتاً سنجیدہ ہے۔ سیاسی مقالات میں علامہ نے موضوع کا تجزیہ بڑی دردمندی اور حقیقت پسندی سے کیا ہے اور مسئلہ کو ٹھوس دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ علمی مسائل میں ان کی تحریر بڑی سنجیدہ، متین اور پروقار ہوتی ہے۔ مشکل سے

مشکل مسائل پر لکھتے وقت بھی ان کی تحریر خشک معلوم نہیں ہوتی۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی سنجیدگی سے ملی ہوئی شگفتگی اور شادابی علامہ اقبال کے اسلوب نثر کی نمایاں ترین خصوصیت ہے اور یہ شادابی اقبال کے شاعرانہ مزاج کی دین ہے۔

۲۔اقبال کے دو خطوط

ایڈیٹر "وطن" کے نام

مخدوم و مکرم مولوی صاحب۔ السلام علیکم

آپ سے رخصت ہو کر اسلامی شان و شوکت کے اس قبرستان میں پہنچا جسے دہلی کہتے ہیں ریلوے اسٹیشن پر خواجہ سید حسن نظامی اور شیخ نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدراس موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے شیخ صاحب موصوف کے مکان پر قیام کیا۔ ازاں بعد [1] حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر حاضر ہوا اور تمام دن وہیں بسر کیا۔

اللہ اللہ، حضرت محبوب الٰہی کا مزار بھی عجیب جگہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دہلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون [2] ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔ شام کے قریب اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہیں ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنج معانی مدفون ہے۔ جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی حسن اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نامی تھا۔ اس ظالم نے مزار کے قریب بیٹھ کر

؎ دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں۔ بالخصوص اس نے جب یہ شعر پڑھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھیئے! بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں اور بے اختیار لوح مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ [3] سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے۔

---

(۱) اس کے بعد (۲) دفن (۳) جائے افسوس، قبرستان سے حسرت ٹپکتی ہے۔

اگر چہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامن دل کو کھینچتے ہیں[1] مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز[2] ہوتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں فاتحہ پڑھی۔ دارالشکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں سے ہوالموجود[3] کی آواز سنی اور دہلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوا جو صفحہ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔

۳ ستمبر کی صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی کو روانہ ہوا اور ۴ ستمبر کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل میں پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں مگر میں نے ٹامس کک کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربہ سے معلوم کیا کہ یہ ہوٹل ہندوستانی طلبہ کے لئے جو ولایت جا رہے ہیں نہایت موزوں[4] ہے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے قریب ہے۔ گھاٹ[5] یہاں سے قریب ہیں۔ ٹامس کک کا دفتر یہاں سے قریب۔ غرض کہ ہر قسم کا آرام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہر کے باقی تمام ہوٹلوں کی نسبت ارزاں[6] ہے۔ صرف تین روپے یومیہ[7] دو اور ہر قسم کا آرام حاصل کرلو۔ یہاں کا منتظم ایک پیر پارسی مرد ہے جس کی شکل سے اسقدر تقدس[8] ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے خشور (نبی) یاد آجاتے ہیں۔ دکانداری نے اسے ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علماء میں باوجود عبادت اور مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے کبھی ویسا انکسار[9] پیدا نہیں ہوتا۔ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے کہ

"محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے"

---

(۱) متوجہ کرتے ہیں (۲) عبرت حاصل کرنا (۳) وہ (خدا) موجود ہے، ایک صوفیانہ جملہ ہے۔ (۴) مناسب

(۵) سمندر بندرگاہ (۶) سستا (۷) روزانہ (۸) پاکیزگی (۹) عاجزی

میرے دل پر اس پیر مرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی تھی کہ بعض اوقات اسے دیکھ کر میری آنکھیں پر نم ہو جاتی تھیں لیکن جب اس کی وقعت[1] میرے دل میں اندازہ سے زیادہ ہو گئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا بیان بعض وجوہ سے ضروری ہے۔ میں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیر مرد کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی۔ جب اس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو چھپانے کی کوشش کی اور میں نے دور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب ہم سے کیوں چھپاتے ہو؟ خوشی سے اس کا شوق کرو۔ ذرا مسکرایا اور کچھ پیے ہوئے بھی تھا۔

بولا: سراب شوک پینے سے بھی گم دور ہو جائے[2]

میں نے سن کر کہا واہ رے بڈھے خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوۂ نورس پیدا ہو کر بمبئی کھیت باڑی میں بکتا پھرے۔

اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آکر مقیم[3] ہوا جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بولتا تھا۔

میں نے ایک روز اس سے پوچھا۔ تم کہاں سے آئے ہو؟ بولا چین سے آیا ہوں اب ٹرانسوال جاؤں گا میں نے پوچھا تم چین میں کیا کام کرتے تھے؟ کہنے لگا سوداگری کرتا تھا لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے میں نے سن کر اس سے کہا، ہم ہندوستانیوں سے تو یہ ایشی ہی عقلمند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں شاباش ایشیو! شاباش، نیند سے بیدار ہو جاؤ، ابھی تم آنکھیں مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی یہاں ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیاء کی تجارتی عظمت کو از سر نو قائم کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو۔

---

(۱) قدر و منزلت (۲) شراب شوق پینے سے بھی غم دور ہو جاتے ہیں۔ (۳) ٹھہرا

ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں، مولوی صاحب، میں بے اختیار ہوں، لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے، کیا کروں؟ اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات مجھے مجنوں سا کر دیا اور کر رہا ہے۔

ایک شب میں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین (۱) میرے سامنے آ بیٹھے۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یورپین ہیں۔ فرانسیسی میں باتیں کرتے تھے۔ آخر جب کھانا کھا کر اٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی جس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے۔ میری طبیعت بہت متاثر ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح ان سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں۔ یورپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا۔ میں نے پوچھا فارسی جانتے ہو؟ بولا بہت کم۔ پھر میں نے فارسی میں اس سے گفتگو شروع کی لیکن وہ نہ سمجھتا تھا۔ آخر بامجبوری (۲) ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں۔

یہ نوجوان ترک، ینگ ترک پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف ہے۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا شاعر بھی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ، کہنے لگا میں کمال بے (ترکی کا سب سے مشہور زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولیٹیکل (۳) معاملات پر لکھا کرتا ہوں۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے سب کے سب نہایت عمدہ تھے، لیکن جو شعر اپنے سنائے وہ سب کے سب سلطان کی ہجو (۴) میں تھے ان میں سے ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں۔

ظلم و جورن ترسفوجہ بر ملتے محوا یلیور
آدمیت ملک و ملت دشمن عبدالحمید

یعنی کبیر ظلم و جور نے تمام قوم کو مٹا دیا ہے۔ عبدالحمید آدمیت اور ملک و قوم سب کا دشمن ہے۔

---

(۱) شریف آدمی (۲) مجبوراً (۳) سیاسی (۴) مذمت

اس مضمون پر اس سے بہت گفتگو ہوئی اور میں نے اس کو بتایا کہ ینگ پارٹی کو انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ جس طریق سے رعایا انگلستان نے بتدریج (۱) اپنے بادشاہوں سے پولیٹیکل حقوق حاصل کئے وہ طریق سب سے عمدہ ہے۔ بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت وخون (۲) ہو جانا۔ کچھ خاک انگلستان ہی کا حصہ ہے۔ ایک روز سرِ شام میں اور یہ ترک جنٹلمین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ وہاں اسکول کی گراؤنڈ میں مسلمان طلبہ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک کو بلایا اور اسکول کے متعلق بہت سی باتیں اس سے دریافت کیں، میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس اسکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی۔ کیا فنڈ نہیں ہے۔ یا کوئی اور وجہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ فنڈ (۳) تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایک آن میں موجود ہو سکتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول (۴) سوداگر موجود ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان لڑکے پڑھنے کے لئے نہیں آتے۔ اس کے علاوہ اور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں اور جیسی تعلیم ان میں ہوتی ہے ویسی سر دست (۵) ہم یہاں دے بھی نہیں سکتے۔ یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا۔ میرا خیال تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہوگا کیونکہ یہاں کے مسلمان تمول (۶) میں کسی اور قوم سے پیچھے نہیں ہیں لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ تمول کے ساتھ ان میں عقل بھی ہے ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں۔ ہر چیز کو تجارتی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نفع ونقصان ہر پہلو پر غور کر لیتے ہیں۔

غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجب شہر ہے بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سربفلک (۷) عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمدورفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال (۸) ہو جاتا ہے یہاں ہر چیز مل سکتی ہے۔ یورپ وامریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کرو فوراً آ ملے گی۔ ہاں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی یعنی فراغت۔

یہاں پارسیوں کی آبادی نوے ہزار کے قریب ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر ہی پارسیوں کا ہے۔ اس قوم کی صلاحیت نہایت قابل تعریف ہے اور ان کی دولت وعظمت بے اندازہ مگر اس قوم کے لئے کسی اچھے

---

(۱) آہستہ آہستہ (۲) قتل وغارت (۳) سرمایہ (۴) دولت مند (۵) فی الحال (۶) دولت مندی (۷) بلندی (۸) مشکل

فیوچر[1] (Future) کی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ نہیں ڈال سکتے۔ علاوہ اس کے نہ کوئی اوران کی زبان ہے نہ ان کا لٹریچر ہے اور یہ کہ فارسی کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افسوس یہ لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر (۲) میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے بلکہ نہ زردشتی رنگ اس کے رگ وریشے میں ہے اور اسی پر اس کے حسن کا دارومدار ہے۔ میں نے اسکول کے دو پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا۔ چستی کی مورتیں تھیں مگر تعجب ہے کہ ان کی خوبصورت آنکھیں اسی فی صدی کے حساب سے عینک پوش تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عینک پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کے قومی ریفارمر (۳) اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔ اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا حجام ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔ گجراتی اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پوری طرح باخبر تھا۔ نوروجی دادا بھائی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، نوروجی انگلستان میں کیا کرتا ہے؟ بولا "حجور (۴)! کالوں کے لئے لڑتا ہے"۔ ہوٹل کے نیچے مسلمان دکاندار ہیں۔ میں نے دیکھا ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے۔ میں نے ایک روز ان سے پوچھا تم اردو پڑھ سکتے ہو؟ کہنے لگے "نہیں، سمجھ سکتے، پڑھنا نہیں جانتے"۔ میں نے پوچھا کہ مولوی جب تمہارا نکاح پڑھاتا ہے تو کون سی زبان بولتا ہے؟ مسکرا کر بولا "اردو"۔ یہاں ہر کوئی اردو سمجھ سکتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کا سیٹھ (وہی بوتل والا پیر مرد) کبھی ہندوستان نہیں گیا مگر اردو خاصی بولتا تھا۔

میں بمبئی یعنی باب لندن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں۔ خدا جانے لندن کیا ہوگا جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے۔ اچھا دیدہ خواہد شد (۵)۔ ۷ ستمبر کو ۲ بجے ہم وکٹوریہ ڈاک (۶) (گھاٹ) پر پہنچے جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں۔ اللہ اکبر! یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ کئی طرح کے جہاز اور سینکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر سے کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈرو۔ خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح سلامت منزل مقصود تک پہنچا دیں گی۔ خیر! طبی معائنہ کے بعد میں اپنے جہاز پر سوار ہوا۔ لالہ دھنپت رام وکیل لاہور، اوران کے ایک دوست ڈاکٹر صاحب اس روز حسن اتفاق سے بمبئی میں تھے۔ میں ان کا نہایت سپاس گزار (۷) ہوں کہ یہ دونوں صاحب مجھے رخصت کرنے کے لئے ڈاک پر تشریف لائے۔ بہت سے اور لوگ بھی

---

(۱) مستقبل (۲) ادب (۳) مصلح، اصلاح کرنے والا (۴) حضور (۵) دیکھا جائے گا (۶) بندرگاہ، گودی (۷) شکر گزار

جہاز پر سوار ہوئے۔ انکے دوستوں اور رشتہ داروں کا ایک ہجوم ڈاک پر تھا۔ کوئی ۴ بجے جہاز نے حرکت کی اور ہم اپنے دوستوں کو سلام کہتے اور رومال ہلاتے ہوئے سمندر پر چلے گئے یہاں تک کہ موجیں ادھر ادھر آکر ہمارے جہاز کو چڑ منے لگیں۔ فرانسیسی قوم کا مذاق (۱) اس جہاز کی عمدگی اور نفاست سے ظاہر ہے۔ ہر روز صبح کو کئی آدمی جہاز کی صفائی میں مصروف رہتے ہیں اور ایسی خوبی سے صفائی کرتے ہیں کہ ایک تنکا تک جہاز پر نہیں رہنے دیتے۔ ملازموں میں مصر کے چند حبشی بھی ہیں جو مسلمان ہیں اور عربی بولتے ہیں جہاز کے فرانسیسی افسر نہایت خوش خلق ہیں اور ان کے تکلفات کو دیکھ کر لکھنو یاد آجاتا ہے۔ ایک روز افسر تختہ جہاز پر کھڑا تھا کہ ایک حسین عورت کا ادھر سے گزر ہوا۔ اتفاق سے یا غالباً ارادتاً یہ عورت اس افسر کے شانے پر ہاتھ رکھتی ہوئی گزری۔ ہمارے نوجوان افسر نے اس توجہ کے جواب میں ایک ایسی ادا سے جنبش کی کہ ہمارے ملک کے حسین بھی اس کی نقل نہیں اتار سکتے۔

کھانے کا انتظام بھی نہایت قابل تعریف ہے۔ میز بھی فرانسیسی تکلف کی گواہی دے رہا ہے۔ مگر اس جہاز پر ہم ہندوستانیوں کے لئے ایک بڑی دقت یہ ہے کہ جہاز کے تقریباً تمام ملازم فرانسیسی بولتے ہیں انگریزی کوئی نہیں جانتا۔ جہاز کے تمام ملازم فرانسیسی بولتے ہیں اور بعض اوقات ان کو اپنا مطلب سمجھانے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اگرچہ فرانسیسی جہازوں میں ہر طرح کی آسائش ہے تاہم میری رائے یہ ہے کہ ہم لوگوں کو انگریزی کمپنیوں کے جہازوں میں سفر کرنا چاہیئے۔ ان کے مسافر سب کے سب انگریزی داں ہوتے ہیں اور علاوہ اس کے مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جہاز پر بڑی رونق ہوتی ہے۔ ہمارے اس جہاز میں ساٹھ سے زیادہ مسافر نہیں ہیں۔

ہم لوگ رات کو اپنے اپنے کمروں میں سوتے ہیں اور صبح سے شام تک تختہ جہاز پر کرسیاں بچھا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی پڑھتا ہے، کوئی باتیں کرتا ہے، کوئی پھرتا ہے، کیبن میں جہاز کی جنبش کی وجہ سے طبیعت بہت گھبراتی ہے مگر تختہ جہاز پر بہت آرام رہتا ہے۔ میرے تمام ساتھی دوسرے ہی روز مرض بحری میں مبتلا ہو گئے مگر الحمدللہ میں محفوظ رہا۔ مجھ سے اکثروں نے دریافت کیا ہے کہ کیا تم نے پہلے بھی بحری سفر کیا ہے؟ جب میں نے جواب دیا کہ نہیں تو وہ حیران ہوئے اور کہا تم بڑے مضبوط آدمی ہو۔ بمبئی سے آگے نکل کر سمندر کی حالت کسی قدر

---

(۱) ذوق

... کہ خدا ایک ... (۱) تھی۔ خواجہ خضر صاحب کچھ خفا سے معلوم ہوتے تھے۔ اتنی اونچی اونچی موجیں آتی تھیں کہ ... دیکھ ... دہشت (۲) آتی تھی۔ ایک شب ہم کھانا کھا کر تختہ جہاز پر آبیٹھے کچھ عرصہ کے بعد سمندر کی سرد ہوا نے ہم کو سلا دیا مگر دفعتاً ایک خوفناک موج نے اچھل کر ہم پر حملہ کیا اور تمام مسافروں کے کپڑے بھیگ گئے۔ عورتیں بچے اور مرد بھاگ کر اپنے اپنے کمروں میں جا سوئے اور ہم تھوڑی دیر کیلئے جہاز کے ملازموں اور افسروں کے تمسخر (۳) کا باعث بنے رہے۔ راستے میں ایک آدھ بارش بھی ہوئی جس سے سمندر کا تلاطم (۴) نسبتاً بڑھ گیا اور طبیعت ... نظارے کے یکسانیت سے اکتانے لگی سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے اور موجیں زور سے اٹھتی ہیں کہ ان کو سفید جھاگ چاندی کی ایک کلغی سی پہنا دیتی ہے اور دور دور تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے سطح سمندر پر روئی کے گالے بکھیر ڈالے ہیں۔ یہ نظارہ نہایت دلفریب ہے، اگر اس میں موجوں کی دہشت ناک کشاکش کی آمیزش نہ ہو۔ ان کی قوت سے جہاز ایک معمولی کشتی کی طرح جنبش کرتا ہے۔ آسمان اوپر تلے ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر آنکھیں چونکہ اس نظارہ سے کسی قدر مانوس ہوگئی ہیں اور نیز جہاز والوں کے چہروں کا اطمینان یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک معمولی بات ہے۔ اس واسطے ہم کو بھی خوف کا احساس نہیں ہوتا۔ یورپین لڑکے اور لڑکیاں تختہ جہاز پر دوڑتے پھرتے ہیں اور محسوس بھی نہیں کرتے کہ جہاز پر ہیں۔

ہمارا ہمسفر ایک پادری ہے جو جنوبی ہندوستان سے آیا ہے اور اب اٹلی کو جا رہا ہے گزشتہ رات مجھ سے کسی نے کہا۔ یہ فرانسیسی پادری بہت سی زبانیں جانتا ہے اور روسی زبان خوب بولتا ہے۔ میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پوچھا کہ کونٹ ٹالستائی کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے میرے سوال پر نہایت حیرانی ظاہر کی اور پوچھا کہ کونٹ ٹالستائی کون ہے؟ مجھے یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ یہ شخص روسی زبان جانتا ہے اور کونٹ کے مشہور نام سے واقف نہیں ہے۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ جہاز پر دیا سلائی استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تختہ جہاز کے ایک طرف کمرے کی دیوار پر پیتل کی ایک انگیٹھی سی لگا رکھی ہے جس میں چند لکڑیاں آگ لگا کر رکھ دیتے ہیں، جن لوگوں کو سگریٹ یا سگار دودی کرنا ہو اس انگیٹھی سے ایک لکڑی اٹھا لیں۔

---

(۱) طوفانی ہونا (۲) ڈر (۳) مذاق (۴) طوفانی کیفیت

جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوت لاانتہائی (۱) کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں ان سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ (۲) محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ شارع اسلام (۳) کی ہر بات قربان ہو جانے کے قابل ہے۔

بابی انت و اُمی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

آج ۱۲ ستمبر کی صبح ہے۔ میں بہت سویرے اٹھا ہوں۔ جہاز کے جاروب کش (۴) ابھی تختے صاف کر رہے ہیں۔ چراغوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے۔ آفتاب چشمہ آب (۵) میں سے اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسا ہمارا دریائے راوی (۶) شاید صبح کے پر تاثیر نظارے نے اس کو سمجھا دیا ہے کہ سکون قلب بھی ایک نایاب شے ہے۔ ہر وقت کی اُلجھن اور بیتابی اچھی نہیں۔ طلوع آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دل کے لئے تلاوت کا حکم رکھتا ہے۔ یہی آفتاب ہے جس کے طلوع و غروب کو میدان میں ہم نے کئی دفعہ دیکھا مگر یہاں سمندر میں اس کی کیفیت ایسی ہے کہ

نظارہ ز جنبیدن مژگان گلہ دارد

حقیقت میں جن لوگوں نے آفتاب پرستی کو اپنا مذہب قرار دے رکھا ہے، میں ان کو قابل معذوری سمجھتا ہوں۔ ناسخ مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں۔

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھیے
تصویر کس کی ہے ورق آفتاب میں

کوئٹے کے ڈپٹی کمشنر صاحب جو اٹھارہ ماہ کی رخصت لے کر ولایت جا رہے ہیں اور وہ پادری صاحب جو ٹالسٹائی کے نام سے ناواقف معلوم ہوتے تھے، اس وقت جہاز کی اوپر کی چھت پر کھڑے اس نظارے کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ یہ پادری صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ ان میں ایک خاص ہنر ہے اور وہ یہ کہ ہر کسی کو باتوں میں لگا لیتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں مگر بہت شکستہ اور مجھ کو جب بلاتے ہیں

---

(۱) نہ ختم ہونے والی (۲) بالکل ناچیز (۳) نبی اکرمؐ (۴) صفائی کرنے والے (۵) مراد سمندر (۶) راوی کی طرح پرسکون

تو ٹالسٹائی کے نام سے۔ کل مجھ سے پوچھتے تھے تم ہندوستان کا ٹالسٹائی بننا چاہتے ہو۔ میں نے جواب دیا ٹالسٹائی بن جانا آسان نہیں ہے۔ زمین سورج کے گرد لاکھوں چکر لگاتی ہے تب کہیں جا کے ایک ٹالسٹائی پیدا ہوتا ہے۔

کوئٹہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب بڑے باخبر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کل رات ان سے ہندوستان کے پولیٹیکل معاملات پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ عربی اور فارسی جانتے ہیں۔ سر ولیم میور کی تصانیف کے متعلق گفتگو ہوئی تو کہنے لگے کاش یہ شخص ذرا کم متعصب ہوتا۔ عمر خیام کے بڑے مداح ہیں مگر میں نے ان سے کہا کہ اہل یورپ نے ابھی سحابی نجفی کی رباعیات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ عمر خیام کو کبھی کے فراموش کر گئے ہوتے۔

اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحل عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں۔

اللہ رے خاک پاک مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو ادھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین، تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے (۱) نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پرواہ نہ کی مگر اے پاک زمین تو وہ جگہ ہے جہاں باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود (۲) پنجوں سے آزاد کرے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں (۳) کو تمازت (۴) آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت

(۱) نبی اکرم (۲) نامبارک (۳) مراد پیغمبروں (۴) گرمی

کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے۔ اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحرا میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔

از عدن مورخہ ۱۲ ستمبر

راقم

محمد اقبال

(اخبار وطن لاہور، جلد ۵، شمارہ نمبر ۳۹، مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء)

(۲)

مولوی صاحب مخدوم ومکرم۔ السلام علیکم

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ سویز پہنچ کر دوسرا خط لکھوں گا مگر چونکہ عدن سے سویز تک کے حالات بہت مختصر تھے۔ اس واسطے میں نے بھی مناسب سمجھا کہ لندن پہنچ کر مفصل عرض کروں گا۔ میرے پاس ایک کاغذ تھا جس پر میں نوٹ لیتا جاتا تھا مگر افسوس ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ کر وہ کاغذ کہیں کھو گیا۔ یہی وجہ میرے اب تک خاموش رہنے کی تھی۔ شیخ عبدالقادر صاحب کی معرفت آپ کی شکایت پہنچی۔ کل ایک پرائیویٹ خط میں نے آپ کو لکھا تھا دونوں خط آپ کو ایک ہی وقت ملیں گے۔

عدن میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے بنائے ہوئے تالاب ہیں اور یہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک دفعہ بارش کا پانی ہر جگہ سے ڈھل کر ان میں جا گرتا ہے۔ چونکہ ملک خشک ہے اس لئے ایسی تعمیر کی سخت ضرورت تھی۔ میں بوجہ گرمی کے اور نیز قرنطینہ کے، عدن کی سیر نہ کر سکا۔ انجینئری کے اس حیرت ناک کرشمے کی دید سے محروم رہا۔ جب ہم سویز پہنچے تو مسلمان دکانداروں کی ایک کثیر تعداد ہمارے جہاز پر آموجود ہوئی اور ایک قسم کا بازار تختۂ جہاز پر لگ گیا۔ ان لوگوں کی فطرت میں میلان تجارت مرکوز ہے اور کیوں نہ ہو۔ ان ہی کے آباؤ اجداد تھے جن کے ہاتھوں میں کبھی یورپ او رایشیاء کی تجارت تھی۔ سلیمان اعظم ان ہی میں سے ایک شہنشاہ تھا، جس کی وسعت تجارت نے اقوام یورپ کو ڈرا کر ان کو ہندوستان کی ایک نئی راہ دریافت کرنے کی ہدایت کی تھی۔

کوئی پھل بیچتا ہے، کوئی پوسٹ کارڈ دکھاتا ہے، کوئی مصر کے پرانے بت بیچتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ یہ ذرا سا بت اٹھارہ ہزار برس کا ہے جو ابھی کھنڈر کھودنے پر ملا ہے۔ غرض کہ یہ لوگ گاہکوں کو قید کر لینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت (۱) نہیں کرتے۔ ان ہی لوگوں میں ایک شعبدہ باز (۲) بھی ہے کہ مرغی کا بچہ ہاتھ میں لیے ہے اور کسی نامعلوم طریقے سے ایک کے دو بنا کر دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان مصری دکاندار سے میں نے سگریٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں، میں نے اس سے کہا کہ میں مسلمان ہوں مگر چونکہ میرے سر پر انگریزی

---

(۱) کسر باقی نہیں چھوڑتے (۲) مداری

ٹوپی تھی اس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو۔ تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا جب وہ میرے اسلام کا قائل ہوا تو یہ جملہ بولا "تم بھی مسلم ہم بھی مسلم" تو مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ میں نے اسے جواب دیا کہ ہیٹ پہننے سے کیا اسلام تشریف لے جاتا ہے؟ کہنے لگا کہ اگر مسلمان کی داڑھی منڈی ہو تو اسکوتر کی ٹوپی یعنی طربوش ضرور پہننا چاہیے ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہوگی؟ میں نے دل میں کہا کاش ہمارے ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ مروج ہو جاتا تاکہ ہمارے دوست مولوی علماء کے حملوں سے مامون (۱) ومصون ہو جاتے۔ خیر آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا اور چونکہ حافظ قرآن تھا اس واسطے میں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا اور میرے ہاتھ چومنے لگا۔ باقی تمام دکانداروں کو مجھ سے ملوایا اور وہ لوگ میرے گرد حلقہ باندھ کر ماشاءاللہ ماشاءاللہ کہنے لگے اور میری غرض سفر معلوم کر کے دعائیں دینے لگے یا یوں کہیے کہ دو چار منٹ کے لئے وہ تجارت کی پستی سے ابھر کر اسلامی اخوت کی بلندی پر جا پہنچے۔

تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوبصورت گروہ جہاز کی سیر کے لئے آیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سیکنڈ کے لئے علی گڑھ کالج کے ایک ڈیپوٹیشن (۲) کا شبہ ہوا۔ یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے اور میں بھی دخل در معقولات ان میں جا گھسا دیر تک باتیں ہوتی رہیں، ان میں سے ایک نوجوان ایسی خوبصورت عربی بولتا تھا کہ جیسے حریری کا کوئی مقالہ پڑھ رہا ہو۔

آخر مسلمانوں کے اس گروہ کو چھوڑ کر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سویز کنال میں داخل ہوا۔ یہ کنال جسے ایک فرانسیسی انجینئر نے تعمیر کیا تھا دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جس قدر مغربی دماغ نے زمانہ حال کی تجارت پر اثر کیا ہے۔ کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگ تراش کا ہنر اس شخص کے تخیل کی داد نہیں دے سکتا جس نے اقوام عالم میں اس تجارتی تغیر کی بنیاد رکھی جس نے حال کی دنیا کی تہذیب و تمدن کو اور سے کچھ اور کر دیا۔ بعض بعض جگہ تو یہ کنال ایسی تنگ ہے کہ دو جہاز مشکل سے اس میں سے گزر سکتے ہیں اور کسی کسی جگہ ایسی بھی ہے کہ اگر کوئی غنیم (۳) چاہے کہ رات میں اسے مٹی سے پر دے تو آسانی سے کر سکتا ہے۔ سینکڑوں آدمی ہر

---

(۱) محفوظ (۲) وفد (۳) دشمن

وقت کام کرتے رہتے ہیں جب ٹھیک رہتی ہے، اور اس کا ہمیشہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دونوں جانب سے جو ریگ (۱) ہوا سے اڑ کر اس میں گرتی ہے اس کا انتظام ہوتا رہے۔ کنارے پر جو مزدور کام کرتے ہیں بعض نہایت شریر ہیں ہمارا جہاز آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور جہاز کی چند انگریز بیبیاں کھڑی ساحل کی سیر کر رہی تھیں تو ان میں سے ایک مزدور سرتا پا برہنہ ہو کر ناچنے لگا۔ یہ بیچاری دوڑ کر اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔

جہاز سے گزرتے ہوئے ایک اور دلچسپ نظارہ بھی دیکھنے میں آیا اور وہ یہ کہ ہم نے ایک مصری جہاز گزرتے ہوئے دیکھا جو بالکل ہمارے ہی پاس سے ہو کر گزرا۔ اس پر تمام سپاہی ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور نہایت خوش الحانی (۲) سے عربی غزل گاتے جاتے تھے۔ یہ نظارہ ایسا پر اثر تھا کہ اس کی کیفیت اب تک دل پر باقی ہے۔

ابھی ہم پورٹ سعید نہ پہنچے تھے کہ ایک بارود سے بھرے ہوئے جہاز کے پھٹ جانے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غرق ہو جانے کی خبر آئی۔ تھوڑی دیر میں اس کے ٹکڑے کنال سے گزرتے دکھائی دیئے۔ جان و مال کا بے اندازہ نقصان ہوا اور کچھ دیر کے لئے ہماری طبیعت اس مصیبت سے بہت متاثر رہی۔ پورٹ سعید پہنچ کر پھر مسلمان تاجروں کی دکانیں تختہ جہاز پر لگ گئیں۔ میں ایک کشتی پر بیٹھ کر مع پارسی ہم سفر کے بندرگاہ کی سیر کو چلا گیا۔ پورٹ سعید جہازوں کو کوئلہ مہیا کرنے والے بندرگاہوں میں سب سے بڑا ہے اور سعید پاشا کے نام سے مشہور ہے جس نے سویز کنال بنانے کی اجازت دی تھی۔ عمارت کا نظارہ نہایت ہی خوبصورت ہے اور شہر چھوٹی موٹی بمبئی ہے جس کے متعلق خیال ہے کہ یہ کبھی دنیا کے تجارتی مرکزوں میں سے ایک ہوگا۔ مدرسہ دیکھا، مسجدوں کی سیر کی، اسلامی گورنر کا مکان دیکھا، موجد سویز کنال کا مجسمہ دیکھا، یہاں کے مدرسہ میں عربی اور فرانسیسی پڑھاتے ہیں۔ جس حصہ میں انگریز آباد ہیں وہ حصہ خوبصورت سے خوبصورت اور پاکیزہ ہے لیکن افسوس ہے کہ جہاں مسلمان آباد ہیں وہ جگہ بہت میلی ہے۔ یہودی، فرانسیسی، انگریز، یونانی، مسلمان غرض کہ دنیا کی تمام اقوام یہاں آباد ہیں۔ سب کے محلے جدا جدا ہیں ہوٹل بھی جدا جدا ہیں اور چرچ بھی۔ شہر کی سیر کر کے پوسٹ آفس آیا۔ ملازم تقریباً سب مسلمان اور خوب انگریزی اور عربی بولتے ہیں۔

---

(۱) ریت (۲) اچھی آواز سے

اس عمارت میں داخل ہو کر میں نے ''نوٹس بورڈ'' سے کئی جملے عربی الفاظ لکھے جن کو کاغذ پر میں نے نوٹ کر لیا ہے لیکن افسوس بعد میں وہ کاغذ بھی کھو گیا۔ کچھ ٹکٹ پوسٹ آفس سے خرید کئے اور خطوں پر لگا کر ڈاک میں ڈالے۔ تعجب ہے کہ ان میں سے کسی خط کی رسید نہیں آئی۔ آخر اپنے مسلمان راہ نما کو جو اکثر زبانیں جانتا تھا کچھ انعام دے کر لوٹا۔ یہاں جو پہنچا تو ایک اور نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تختہ جہاز پر تین اطالین (۱) عورتیں اور دو مرد وائلن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا۔ ان عورتوں میں ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہو گی نہایت حسین تھی۔ مجھے دیانتداری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس کے حسن نے مجھ پر تھوڑی دیر کے لئے سخت اثر کیا لیکن جب اس نے ایک چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہو گیا کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن جس پر استغنا (۲) کا غازہ (۳) نہ ہو بدصورتی سے بدتر ہو جاتا ہے۔

القصہ فردوس گوش (۴) اور کسی قدر جنت نگاہ (۵) کے حظوظ (۶) اٹھا کر ہم روانہ ہوئے اور ہمارا جہاز بحر روم میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے بہت سے جزیرے راستے میں ملتے ہیں جن میں سے بعض کسی نہ کسی بات کے لئے مشہور ہیں لیکن ان کے نظارے کی کیفیت ذہن سے اتر گئی۔ یہ جتنے سطور لکھے ہیں حافظہ سے لکھے ہیں اگر میرے نوٹ ضائع نہ ہو جاتے تو امید ہے کہ آپ کے ناظرین کو زیادہ کامیابی کے ساتھ خوش کر سکتا۔

بحر روم کے ابتدائی حصے میں سمندر کا نظارہ بہت دلچسپ تھا اور ہوا میں ایسا اثر تھا کہ غیر موزوں (۷) طبع آدمی بھی موزوں ہو جائے۔ میری طبیعت قدرتاً شعر پر مائل ہو گئی اور میں نے چند اشعار کی غزل لکھی جو حاضر ہے۔

---

(۱) اٹلی کی (۲) بے نیازی (۳) پوڈر (۴) مراد دلکش آواز (۵) خوبصورت (۶) حظ کی جمع بمعنی حصہ مراد لطف

(۷) آدمی جو وزن کے مطابق شعر کہہ یا پڑھ نہ سکتا ہو

مثال پرتوِ مے طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم[1] تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

نیا جہاں کوئی اے شمع ڈھونڈیئے کہ یہاں
ستم کش تپش نا تمام کرتے ہیں

عجب تماشا ہے مجھ کافرِ محبت کا
صنم بھی سن کے جسے رام رام کرتے ہیں

ہوا جہاں کی ہے پیکار آفریں[2] کیسی
کہاں عدم کے مسافر قیام کرتے ہیں

نظارہ لالے کا تڑپا گیا مرے جی کو
بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں

رہین لذت ہستی نہ ہو کہ مثل شرر
یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں

بھلی ہے ہم نفسو اس چمن میں خاموشی
کہ خوش نواؤں کو پابند دام کرتے ہیں

غرض نشاط[3] ہے شغل شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

(۱) حضرت موسیٰ (۲) جنگ کو جنم دینے والی (۳) خوشی

الٰہی سحر (۱) ہے پیرانِ خرقہ پوش (۲) میں کیا!
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں

میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری پستی سے
نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو!
جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

(مازنی اٹلی کے محسنین (۳) کا سرکردہ تھا۔ یہ شعر اس وقت لکھا گیا جب کہ اس ملک کا ساحل نظر کے سامنے تھا)۔

مارسیلز تک پہنچنے میں چھ روز صرف ہوئے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ سمندر کا آخری حصہ بہت متلاطم تھا اور کچھ اس خیال سے کہ اصلی راستے میں طوفان کا اندیشہ ہوگا۔ ہمارا کپتان جہاز کو ایک اور راستے سے لے گیا جو معمولی راستے سے کسی قدر لمبا تھا۔ ۲۳ کی صبح کو مارسیلز یعنی فرانس کی ایک مشہور تاریخی بندرگاہ پر پہنچے اور چونکہ ہمیں آٹھ دس گھنٹے کا وقفہ مل گیا تھا اس واسطے بندرگاہ کی خوب سیر کی۔ مارسیلز کا نوٹرڈام گرجا نہایت اونچی جگہ پر تعمیر ہوا ہے اور اس کی عمارت کو دیکھ کر دل پر یہ بات منقوش ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مذہبی تاثیر ہی حقیقت میں تمام

---

(۱) جادو (۲) گودڑی پوش (۳) محسن کی جمع، احسان کرنے والا، مازنی ۱۸۷۲ء میں فوت ہوا تھا

علوم وفنون کی محرک ہوئی ہے۔ مارسیلز سے گاڑی پر سوار ہوئے اور فرانس کی سیر بھی "حسن رہگذرے" کے طریق پر ہوگئی۔ کھیتیاں جو گاڑی کے اِدھر اُدھر آتی ہیں ان سے فرانسیسی لوگوں کا نفیس مذاق مترشح (1) ہوتا ہے۔ ایک رات گاڑی میں کٹی اور دوسری شام ہم لوگ برٹش چینل کو کراس کر کے ڈوور اور ڈوور سے لنڈن پہنچے۔ شیخ عبدالقادر کی باریک نگاہ نے باوجود میرے انگریزی لباس کے مجھے دور سے پہچان لیا۔ دوڑ کر بغلگیر ہو گئے۔

مکان پر پہنچ کر رات بھر آرام کیا۔ دوسری صبح سے "کام" شروع ہوا یعنی ان تمام فرائض کا مجموعہ جن کی انجام دہی نے مجھے وطن سے جُدا کیا تھا اور میری نگاہ میں ایسا ہی مقدس ہے جیسے عبادت۔ والسلام

از کیمبرج ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء آپ کا اقبال

(اخبارِ وطن لاہور، جلد ۵، شمارہ نمبر ۴۹، مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء)

۱۔۲۔ توضیحات

محترم ومکرم مولوی صاحب: مولوی صاحب سے مراد ہفت روزہ وطن لاہور کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خان ہیں جو اقبال کے بے تکلف دوستوں میں شامل تھے۔ مولوی صاحب کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہوا۔

اسلامی شان وشوکت کا قبرستان: علامہ نے دلی کو ایسا قبرستان کہا ہے کہ جس میں اسلام کی شان وشوکت دفن ہے۔ دہلی اسلامی ہندوستان کا پایۂ تخت تھی جہاں عظیم الشان مسلمان سلاطین، امراء، اولیاء اور علماء دفن ہیں اقبال کو اپنے شاندار ماضی سے بڑی محبت تھی اور ایسا شخص دہلی جیسے شہر میں جا کر اس کے ماضی پر ضرور غور کرتا ہے۔ بانگ درا کی ایک نظم میں یہی بات دلی کے بارے میں ایک مصرع میں اس طرح کہی ہے۔

سرزمین دلی کی مسجود دلِ غم دیدہ ہے (بلادِ اسلامیہ)

---

(1) ذوق ٹپکتا ہے (ظاہر ہوتا ہے)

خواجہ سید حسن نظامی:

اردو کے معروف انشاء پرداز، ادیب اور صوفی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے مکین جن کا انتقال دلی میں ۱۹۵۵ء میں ہوا اور درگاہ ہی میں دفن ہوئے۔

حضرت محبوب الٰہی: حضرت نظام الدین اولیاءؒ سلسلہ چشتیہ کی ایک شاخ سلسلہ نظامیہ کے بانی امیر خسرو کے مرشد متعدد سلاطین دہلی کا زمانہ دیکھا۔ ۱۳۲۴ء میں رحلت فرمائی۔

میر نیرنگ، سید غلام بھیک نیرنگ اقبال کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ انبالہ کے رہنے والے تھے ۱۹۵۲ء میں لاہور میں فوت ہوئے۔

گنج معانی: اقبال نے غالب کو معانی کا خزانہ کہہ کر اس کی شاعرانہ عظمت کو خراج تحسین پیش کیا ہے اقبال کے کلام میں غالب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ بانگ درا میں ''مرزا غالب'' کے عنوان سے ایک نظم بھی ملتی ہے۔

ظالم: اس کے معنی ظلم کرنے والے کے ہیں۔ ظالم کے معنی بھی اچھے نہیں ہو سکتے لیکن یہاں یہ لفظ اچھے معنوں میں پیار کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

ہمایوں: نصیر الدین محمد ہمایوں: بابر کا بیٹا اور اکبر کا باپ، مغلیہ خاندان کا دوسرا بادشاہ تھا جس کا مقبرہ دہلی میں ہے سال وفات ۱۵۵۶ء ہے۔

داراشکوہ: شاہجہان کا آزاد خیال اور صوفی منش ولی عہد جس نے اورنگزیب عالمگیر سے شکست کھائی اور مارا گیا داراشکوہ ''وحدت الوجود'' کے عقیدے کا قائل تھا جس کی رو سے موجود صرف خدا کی ذات ہے اس کائنات میں سوائے اس کے کوئی اور موجود نہیں ہے۔ ہوالموجود اسی کی طرف اشارہ ہے۔

شیخ محمد اکرام: مجلہ مخزن کے معاون مدیر

ٹامس کک: جہاز راں کمپنی کا نام

ہوٹلوں کے ٹکٹ: مراد ہوٹلوں میں کمرے محفوظ کرانے کے کارڈ

پارسی پیر مرد: پارسی بوڑھا، پارسی زرتشت کو پیغمبر مانتے ہیں انہیں مجوسی اور آتش پرست بھی کہتے ہیں

کارلائل: انگلستان کا معروف مفکر، ادیب اور مؤرخ جو ۱۸۸۱ء میں فوت ہوا۔

ٹرانسوال: جنوبی افریقہ کا ایک صوبہ جہاں قیمتی معدنیات کی کانیں ہیں۔

افیمی: چین کے لوگ ایک زمانے میں افیون کھانے میں دنیا بھر میں رسوا تھے۔ افیمی سے مراد یہاں چین کے لوگ ہیں لیکن اقبال نے اپنی زندگی ہی میں ان کے بارے میں یہ پیش گوئی کر دی تھی

ع گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

گراں خواب کا اشارہ افیمیوں کی طرف ہی ہے۔

ایشیا کی تجارتی عظمت: کلامِ اقبال میں یورپ کے مقابلے میں ایشیا کی عظمت کا احساس زیادہ ملتا ہے۔ ان کے اس سفرنامے میں بھی موجود ہے۔

سلطان عبدالحمید ثانی: عثمانی سلطنت کا ایک خلیفہ جسے عالمِ اسلام میں امیر المومنین مانا جاتا تھا وہ ۱۹۰۹ء میں معزول ہوا۔

زردشتی رنگ: زرتشت یا زردشت ایک ایرانی مذہب کا بانی، پارسی اس کے پیروکار ہیں۔ علامہ نے یہاں ایرانی ادب کی بات کی ہے کہ اس میں اسلامی یا عربی اثر کم ہے اور پرانا زرتشتی رنگ اس پر چھایا ہوا ہے۔

نوروجی دادا بھائی یا دادا بھائی نوروجی: بمبئی کے معروف پارسی راہنما جو ۱۸۹۲ء میں برطانوی دارالعوام کے ممبر بنے۔

مرض بحری: سمندر کے سفر کے دوران دل گھبراتا ہے بعض لوگوں کو قے بھی آتی ہے اس کو مرض بحری کہتے ہیں۔

خضر صاحب: مراد سمندر۔ خواجہ خضر کو سمندروں کا نگران مانا جاتا ہے۔

بابی انت وامی یارسول اللہ ﷺ: یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان۔

دودی کرنا: دھواں نکلنا (جلانا)۔ دود دھوئیں کو کہتے ہیں۔

نظارہ زجنبیدن مژگان گلہ دارد: نظارہ یا منظر کو پلک جھپکنا بھی گوارہ نہیں۔

سروليم ميور: یو۔ پی کا انگریز گورنر جس نے حضور اکرم ﷺ پر ایک مخالفانہ کتاب لکھی۔ اس کتاب کا جواب سید احمد خان مرحوم نے بڑی محنت سے لکھا تھا۔

عمر خیام: گیارہویں صدی عیسوی کا ایران کا مشہور فلسفی، ماہر نجوم اور شاعر جو یورپ میں صرف اپنی دلآویز رباعیات کی بناء پر مشہور ہے اس کا اہم موضوع عیش کوشی ہے۔

سحابی نجفی: مولانا ابوسعید سحابی استر آبادی نجفی عالم و فاضل شخص تھے۔ ان کا شمار فارسی کے ان شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے کثیر تعداد میں رباعیات کہی ہیں۔ ان کی کہی ہوئی رباعیوں کی تعداد سات ہزار تک بتائی جاتی ہے۔

قرنطینہ: وہ معیاد جس میں بحری مسافروں یا بازدہ علاقہ کے بیماروں کو جبراً سب سے علیحدہ رکھا جاتا ہے۔

سلیمان اعظم: ترکی کا عظیم سلطان سلیمان ذی شان جس کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی وسعت، قوت اور شوکت کے انتہائی عروج تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا انتقال ۱۵۶۶ء میں ہوا۔

مقام یا مقامہ: عربی نثر کی ایک معروف مگر پر تکلف صنف ہے اور مقامات حریری ابو محمد قاسم بن علی بن عثمان حریری کی تصنیف ہے جو ۱۱۲۲ء میں فوت ہوا۔

سویز کنال: نہر سویز جو بحیرۂ روم کو بحیرۂ احمر سے ملاتی ہے جس کو ایک فرانسیسی انجینئر نے بنایا۔

۲.۲۔ خود آزمائی ا

(الف) مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیں۔

۱۔ علامہ نے پہلی کتاب کس موضوع پر لکھی؟

۲۔ علامہ نے پہلا نثری مضمون کب لکھا اور اس کا موضوع کیا تھا؟

۳۔ اقبال نے ۱۹۳۸ء میں جو مضمون لکھا اس کا عنوان کیا تھا؟

۴۔ ''مضامینِ اقبال'' کب شائع ہوئی؟

۵۔ ''مقالاتِ اقبال'' کے مرتب کا نام بتائیں؟

۶۔ ''اقبال نامہ'' اقبال کے خطوط کا مجموعہ ہے یا خطبات کا؟

۷۔ اقبال نامہ کس نے مرتب کیا؟

۸۔ مضامین اقبال اور مقالات اقبال کے علاوہ کسی اور نثری مجموعے کا نام بتائیں؟

۹۔ اسلامی شان وشوکت کا قبرستان اقبال نے کسے کہا ہے؟

۱۰۔ علامہ اپنے سفر کے دوران دلی میں کس شاعر اور کس شاہزادے کے مزار پر حاضر ہوئے؟

(ب) اس سفرنامے کی معلومات کی روشنی میں مندرجہ ذیل میں سے صرف صحیح اقوال پر نشان (✓) لگائیں۔

۱۔ علامہ نے نثر میں کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔

۲۔ علامہ نے اس نثری ادب کو کمال تک پہنچادیا جس کا آغاز سید احمد خان سے ہوا تھا۔

۳۔ علامہ کے خطوط سنجیدہ نثر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

۴۔ ''مضامین اقبال'' تصدق حسین تاج نے مرتب کی۔

۵۔ سیاسی مقالات میں اقبال موضوع کا تجزیہ بڑی حقیقت پسندی اور دردمندی سے کرتے ہیں۔

(ج) دیئے ہوئے الفاظ میں سے صحیح لفظ منتخب کر کے خالی جگہ پر کیجئے۔

۱۔ باب لندن __________ کو کہا جاتا ہے (مانچسٹر، کراچی، بمبئی، دہلی)

۲۔ علامہ اقبال کے نزدیک بہترین رباعی گو __________ ہے۔ (خیام، حالی، سحابی نجفی، اکبرالہ آبادی)

۳۔ سلیمان اعظم __________ کا بادشاہ تھا۔ (ایران، یونان، سلطنت عثمانیہ، شام)

۴۔ نوٹرڈام کا مشہور گرجا __________ میں واقع ہے (لندن، نیویارک، پیرس، مارسیلز)

۵۔ اقبال نے "گنج معانی" __________ کو کہا ہے (میر تقی میر، آتش، غالب، میر درد)

۳۔ خطبہ عید الفطر

تعارف

اس حصے میں آپ علامہ اقبال کے ایک خطبے کا مطالعہ فرمائیں گے۔ اس یونٹ کے آغاز میں آپ کو بتایا گیا ہے کہ علامہ ہر دو تین سال کے بعد اہم قومی موقعوں پر کچھ نہ کچھ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ یہ خطبہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ علامہ کا یہ خطبہ ۱۹۳۲ء میں عید الفطر کے موقع پر انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور نے پمفلٹ کی صورت میں چھپوا کر تقسیم کیا تھا۔ علامہ نے اپنے خاص انداز میں اس خطبے میں روزے کی انفرادی و اجتماعی حکمت بیان کی ہے اور صدقہ فطر کے اقتصادی فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ علامہ کے نزدیک فطرانہ دراصل معاشرتی مساوات کی جانب اسلام کا ایک اہم قدم ہے۔ زکوٰۃ اور اصول تقسیم وراثت کا مقصد بھی اسلامی معاشرے میں معاشرتی مساوات قائم کرنا ہے۔

پہلے حصے میں آپ نے علامہ کی ہلکی پھلکی، شاداب اور شگفتہ نثر کا مطالعہ کیا جو ویسے بھی اقبال کے اولین دور کی تحریر ہے۔ یہ خطبہ اس زمانے کی یادگار ہے جب علامہ فکری پختگی کے اعتبار سے اپنی حیثیت تسلیم کروا چکے تھے اس لئے اس خطبے کی نثر عالمانہ اور حکیمانہ ہے۔ اس میں بڑا رعب اور وقار ہے۔ آیات کے درج ہونے سے عبارت کی شان میں اضافہ کیا گیا ہے۔ خطبے کا آغاز ایک آیت سے اور اختتام ایک حدیث قدسی پر ہوتا ہے۔

آپ پہلے خطبے کے اہم نکات ملاحظہ کریں گے پھر خطبے کا متن اور آخر میں ضروری توضیحات۔

۱۔۳۔ خطبے کے اہم نکات

عید کے روز مسلمان خدائے حضور سجدہ شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے انہیں روزے رکھنے کی توفیق دی مسلمان اپنے تہواروں میں بھی خدا کے آگے جھکتے ہیں۔

۲ ہجری میں رمضان کے روزے فرض ہوئے اسی سال صدقہ فطر ادا کرنے اور عید الفطر منانے کا حکم ہوا۔ اسلام کی اصل عبادات انسان کو ایک بہتر فرد بناتی ہیں تا کہ مسلمان بہترین امت بن سکیں۔

☆ روزہ بھی اپنے اندر بڑی خوبیاں رکھتا ہے اس کا مقصد انسان کو پرہیز گار بنانا ہے۔

☆ اس عبادت کا تعلق صرف ایک فرد سے نہیں ہے بلکہ روزہ پوری ملت کی اقتصادی و معاشرتی اصلاح کا کام بھی انجام دیتا ہے۔

☆ ایک خاص مہینے کے مسلسل روزے فرض کر کے اسلام نے اس کو انفرادی کی بجائے اجتماعی رنگ دیا ہے۔

☆ اسلام نے زکوٰۃ کی ادائیگی اور جائیداد کو وارثوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیکر معاشرے میں معاشرتی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ صدقہ فطر ایک مقررہ دن تمام قوم کو ادا کرنا ہوتا ہے اور زکوٰۃ اور جائیداد کی تقسیم کے بعد یہ معاشرتی مساوات قائم کرنے کا اہم اصول ہے۔

☆ روزہ رکھنے سے انسان کی صحت بہتر ہوتی ہے۔ روزے کا ملی فائدہ یہ ہے کہ صاحب توفیق مسلمانوں کے دل میں اپنے غریب بھائیوں کے لئے عملی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

☆ روزوں کے لئے ایک ایسے مہینے کو چنا گیا جس میں قرآن نازل ہوا۔

☆ روزے رکھنے کا مقصد صرف ایک مہینے کے لئے متقی بننا نہیں ہے بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے تقویٰ کی ایک مشق ہے اس لئے مسلمانوں کو ان کاموں سے پرہیز کرنا چاہیے جن سے قرآن نے روکا ہے۔

☆ مثلاً قرآن نے دوسروں کا مال ناحق کھانے سے منع کیا ہے۔ مالی مقدمات حاکموں کے پاس لے جانے سے روکا ہے۔

☆ اس خطبے میں علامہ نے مسلمانانِ پنجاب کو بتایا کہ وہ اس وقت سوا ارب روپے کے مقروض ہیں اور ہر سال چودہ کروڑ روپے بطور سود دیتے ہیں۔ اس کا حل علامہ نے یہ بتایا ہے کہ مسلمان فضول خرچی بند کریں مقدمہ بازی اور رشوت بازی سے باز آئیں۔

۲۔۳۔ خطبے کا متن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا یہ خطبہ سن ۱۳۵۰ھ بمطابق ۱۹۳۲ء میں فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور سے پمفلٹ کی صورت میں چھپوا کر تقسیم کیا گیا تھا۔ علامہ نے خود اسے کہیں نہیں پڑھا)

ملت اسلامیہ

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ

یہی ارشاد خداوندی ہے جس کی تعمیل (۱) میں آپ نے ماہ رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھے اور اس طاعت الٰہی (۲) کی توفیق (۳) پانے کی خوشی میں آپ بحیثیت قوم خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ شکر بجالانے کے لئے یہاں جمع ہوئے۔

بے شک مسلم کی عید اور اس کی خوشی اگر کچھ ہے تو یہ کہ وہ اطاعت حق یعنی عبدیت (۴) کے فرائض کی بجا آوری میں پورا نکلے اور قومیں بھی خوشی کے تہوار (۵) مناتی ہیں مگر سوائے مسلمانوں کے اور کونسی قوم ہے جو خدائے پاک کی فرمانبرداری میں پورا اترنے کی عید مناتی ہو؟

---

(۱) عمل کرنا (۲) فرمانبرداری (۳) کامیابی (۴) بندہ ہونا، بندگی (۵) اہم دن

مورخین (۱) کے بیان کے مطابق سن ۲ ہجری میں رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے۔ صدقہ عیدالفطر کا حکم بھی رسول اللہ ﷺ نے اسی سال جاری فرمایا۔ حضورؐ نے پہلے ایک خطبہ دیا جس میں اس صدقے کے فضائل بیان فرمائے پھر صدقہ کا حکم دیا۔ عیدالفطر کی نماز باجماعت عیدگاہ میں اسی سال ادا فرمائی۔ سن ۲ ہجری سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی۔

اسلام کے ارکان یعنی توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ، جب "نبی امی" کی زبان پاک سے "خالق اکبر" نے بندوں کی اصلاح وفلاح کے لئے ہدایت فرمائی تو مقصود یہ تھا کہ ان کی پابندی سے "مسلم بحیثیت فرد" وہ انسان بن سکے جسے وحی خداوندی "احسن تقویم (۲)" کے نام سے تعبیر کرتی ہے اور "ملت اسلامیہ" وہ "ملت" بن جائے جو قران پاک کے الفاظ کے مطابق دنیا کی "بہترین امت" ہو اور اپنے تمام معاملات میں "اعتدال" اور میانہ روی کے اصول کو ہمیشہ سامنے رکھنے والی ہو۔ اسلام کا ہر رکن انسانی زندگی کے صحیح نشو ونما کے لئے اپنے اندر ہزار یا ظاہری اور باطنی مصلحتیں (۳) رکھتا ہے۔ مجھے اس وقت صرف اسی ایک رکن کی حقیقت کے متعلق آپ سے ایک دو باتیں کہنا ہے جسے "صوم" (۴) کہتے ہیں اور جس کی پابندی کی توفیق کے شکرانہ میں آج آپ عید منا رہے ہیں۔

روزے پہلی امتوں پر بھی فرض تھے گو ان کی تعداد وہ نہ ہو جو ہمارے روزوں کی ہو اور فرض اس لئے کیے گئے کہ انسان پرہیزگاری کی راہ اختیار کرے۔ خدا نے فرمایا:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ ءَامَنُوْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

گویا روزہ انسان کو پرہیزگاری کی راہ پر چلاتا ہے۔ اس سے جسم اور جان دونوں تزکیہ (۵) پاتے ہیں یہ خیال کہ روزہ ایک انفرادی عبادت ہے صحیح نہیں بلکہ ظاہر و باطن کی صفائی کا یہ طریق، یہ ضبط نفس، یہ حیوانی خواہشوں کو اپنے اندر بس میں رکھنے کا نظام اپنے ملت کی تمام اقتصادی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کے مقاصد پوشیدہ رکھتا ہے۔

---

(۱) تاریخ لکھنے والے (۲) اچھے انداز میں (۳) خوبیاں (۴) روزہ (۵) پاکیزگی

وہ فائدے جو ایک ''فرد'' کو روزہ رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس صورت میں بھی ہو سکتے تھے کہ روزہ بجائے مسلسل ایک مہینہ رکھنے کے کبھی کبھی رکھ لئے جاتے یا بجائے رمضان میں رکھنے کے سال کے اور مہینوں میں رکھ لئے جاتے۔ لیکن ''فرد'' کے علاوہ تمام ''ملت'' کے اقتصادی و معاشرتی تزکیہ کی غرض بھی شارع برحق (۱) کے سامنے تھی۔

آج کی عید ''عید الفطر'' کہلاتی ہے۔ پیغمبر خدا نے جب عید کے لئے عید گاہ میں اکٹھے ہونے کا حکم دیا تو ساتھ ہی صدقہ عید الفطر ادا کرنے کا حکم بھی دیا۔ تعجب نہیں کہ ''عید'' کا دن مقرر کرنے کی اصل غرض ہی شارع علیہ الصلوٰۃ کے نزدیک صدقہ عید الفطر کا جاری کرنا ہو۔ حق یہ ہے کہ زکوٰۃ اور اصولِ تقسیم وراثت کے بعد تیسرا طریق ''اقتصادی'' اور ''معاشرتی'' مساوات قائم کرنے کا جو اسلام نے تجویز کیا ''صدقات'' کا تھا اور ان صدقات میں سب سے بڑھ کر صدقہ فطر کا اس لئے کہ یہ صدقہ ایک مقررہ دن پر تمام قوم کو ادا کرنا ہوتا ہے۔

رمضان کا مہینہ آپ نے اس اہتمام سے بسر کیا ہے کہ کھانے پینے کے اوقات کی پابندی سیکھ لی۔ اپنی صحت درست کر لی۔ آئندہ گیارہ مہینے کی بیماریوں سے محفوظ رہنے کے قابل اپنے آپ کو بنا لیا۔ کفایت شعاری (۲) سیکھی رزق کی قدر و قیمت سیکھی۔ یہ سب ذاتی فائدے تھے۔ ''صیام'' (۳) کا قومی اور ملی فائدہ یہ ہے کہ صاحب توفیق مسلمانوں کے دل میں اپنی قوم کے مفلس اور محروم افراد کی عملی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو اور صدقہ فطر ادا کرنے سے قوم میں ایک گونہ (۴) اقتصادی اور معاشرتی مساوات قائم ہو۔ حکم یہ ہے کہ ''عید'' کی نماز میں شرکت سے پہلے ہر صاحب توفیق مسلمان صدقہ فطر ادا کر کے عید گاہ میں آئے۔ اس سے مقصود یہ نہیں کہ اقتصادی اور معاشرتی مساوات صرف ایک آدھ دن کے لئے قائم ہو جائے بلکہ ایک مہینے کا ضبطِ نفس تم کو اس لئے سکھایا گیا ہے کہ تم اس اقتصادی اور معاشرتی مساوات کو قائم رکھنے کی کوشش تمام سال کرتے رہو۔

باقی رہا یہ امر کہ روزے ماہ رمضان کے ساتھ ہی کیوں مختص (۵) کئے جائیں، سو واضح رہنا چاہیے کہ اسلام نے انسان کی انفرادی

---

(۱) مراد۔ سچے نبی (۲) فضول خرچی سے بچنا (۳) روزے (۴) ایک طرح (۵) خاص

اور اجتماعی زندگی کے اسرار (۱) کو مدنظر رکھ کر "صیام" کے زمانی تسلسل کو سمجھا ہے۔ اس تسلسل کے لئے وقت کا تعین (۲) لازم تھا اور چونکہ اسلام کا اصل مقصود انسانوں کو احکام الٰہی کی فرمانبرداری میں پختہ کرنا تھا، اس لئے صیام کو اس مہینے سے مختص کیا گیا جس میں احکام الٰہی کا نزول (۳) شروع ہوا تھا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ مسلمانوں کو ہر سال ایک پورا مہینہ کامل تزکیہ نفس کے ساتھ نزول قرآن حکیم کی "سالگرہ" منانے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ احکام الٰہی کی حرمت و تقدیس (۴) ہمیشہ مدنظر رہے اور نماز تراویح پر کاربند ہو کر قوم کے ہر فرد کو اجتماعی حیات کا قانون عملاً ازبر (۵) ہو جائے۔

اصل بات قوم کی اقتصادی اور تمدنی زندگی کی مجموعی اصلاح کے متعلق تھی۔ قرآن میں جہاں مسائل "صیام" کے ذکر کے بعد یہ فرمایا کہ:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ

وہاں ساتھ ہی ملحق (۶) بطور ان تمام باتوں کے نتیجے کے یہ حکم بھی دیا۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

روزہ رکھ کر مفلسوں سے محض ہمدردی کا احساس پیدا کر لینا کافی نہ تھا۔ عید کے دن غرباء کو دو چار دن کا کھانا دے دینا کافی نہ تھا۔ طریق وہ اختیار کرنا مقصود تھا جس میں مستقل طور پر دنیاوی مال و متاع سے انتفاع (۷) کے قواعد اس طور پر قائم ہوں کہ جہاں تقسیم وراثت اور زکوٰۃ سے ملت اسلامیہ کے مال و متاع میں ایک گونہ مساوات پیدا ہو۔ وہاں اس مساوات میں ایک دوسرے کے اموال میں ناجائز تصرف سے کسی قسم کا خلل نہ آئے۔ روزوں کے التزام (۸) سے صرف انفرادی روحانیت کی ترقی یا زیادہ سے زیادہ انسانوں کے ساتھ ایک ہنگامی ہمدردی ہی مقصود نہیں بلکہ شارع کی نظر اس بات پر ہے کہ تم اپنے اپنے حلال کے کمائے ہوئے مال پر قناعت کرو اور دوسروں کے کمائے ہوئے مال کو باطل (۹) طریقوں سے کھانے کی کوشش نہ کرو۔ اس باطل طریق پر دوسروں کا مال کھانے کی بدترین روش قرآن کے نزدیک یہ ہے کہ مال و دولت کے ذریعے حکام تک رسائی حاصل کی جائے

---

(۱) بھاز (۲) مقرر کرنا (۳) نازل ہونا (۴) احترام (۵) یاد (۶) ملا ہوا (۷) فائدہ اٹھانا (۸) لازم قرار دینا (۹) ناجائز طریقوں

اوران کو رشوتوں سے اپنا طرفدار بنا کر اوروں کے مالوں کو اپنے قبضے میں لایا جائے۔ مذکورہ بالا آیت میں "اثم" کے معنی بعض مفسرین(۱) نے جھوٹی گواہی کے لئے ہیں۔ علمائے کرام نے "حکام" سے مراد مسلمانوں کے اپنے مفتی، قاضی اور سلطان لئے ہیں۔ جب اپنے فقیہوں(۲) اور قاضیوں کے پاس جھوٹے مقدمے بنا کر لے جانے کو خدا نے مذموم قرار دیا ہے تو سمجھ لو کہ غیر اسلامی حکومتوں کے پاس اس قسم کے مقدمات لے جانا کس قدر نا جائز ہے۔ مہینہ بھر روزے رکھنے کی آخری غرض یہ تھی کہ آئندہ تمام سال ایک دوسرے کے ہمدرد اور بھائی بن کر رہو کہ اگر اپنا مال ایک دوسرے کو بانٹ کر دے نہیں سکتے تو کم سے کم "حکام" کے پاس کوئی مالی مقدمہ اس قسم کا نہ لے کر جاؤ جس میں ان کو رشوت دے کر حق و انصاف کے خلاف دوسروں کے مال پر قبضہ کرنا مطلوب ہو۔

آج کے دن سے تمہارا عہد ہونا چاہیے کہ قوم کی اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کی جو غرض قرآن حکیم نے اپنے ان احکام میں قرار دی ہے اس کو تم ہمیشہ مدنظر رکھو گے۔

مسلمانان پنجاب اس وقت تقریباً سوا ارب روپے کے قرض میں مبتلا ہیں اور اس پر ہر سال تقریباً چودہ کروڑ روپیہ سود ادا کرتے ہیں۔ کیا اس قرض اور اس سود سے نجات کی کوئی سبیل(۳) سوائے اس کے ہے کہ تم احکام خداوندی کی طرف رجوع کرو اور مالی اور اقتصادی غلامی سے اپنے آپ کو رہا کراؤ؟ تم اگر آج فضول خرچی چھوڑنے کے علاوہ مال و جائیداد کے جھوٹے اور بلا ضرورت مقدمے عدالتوں میں لے جانا چھوڑ دو تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ چند سال کے اندر تمہارے قرض کا کثیر حصہ از خود کم ہو جائے گا اور تم تھوڑی مدت کے اندر قرض کی غلامی سے اپنے آپ کو آزاد کرا لو گے نہ صرف یہ کہ مالی مقدمات کا ترک(۴) تمہیں اس قابل بنا دے گا کہ تم وہی روپیہ جو مقدموں اور رشتوں اور وکیلوں کی فیسوں میں برباد کرتے ہو۔ اسی سے اپنی تجارت اور اپنی صنعتوں کو فروغ دے سکو گے۔ کیا اب بھی تم کو رجوع الی القرآن کی ضرورت محسوس نہ ہو گی اور تم عہد نہ کر لو گے کہ تمام دنیاوی امور میں شرع قرآنی کے پابند ہو جاؤ گے؟

کس التجاء کے ساتھ رسول پاکؐ نے مسلمانوں کو پکار کر کہا تھا کہ

اِیَّاکُمْ وَالدَّیْنَ فَاِنَّهُمْ بِاللَّیْلِ وَ مَذَلَّةٌ بِالنَّهَارِ

(دیکھو قرض سے بچنا۔ قرض رات کا اندوہ اور دن کی خواری ہے)

---

(۱) قرآن مجید کی تفسیر کرنے والے (۲) اسلامی قانون دان (۳) راستہ (۴) چھوڑنا

اس خطبے میں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے صرف اقتصادی پہلو ہی پر نظر ڈالی گئی ہے۔ شاید عیدالاضحیٰ کے موقع پر اسی قسم کے ایک خطبے میں زندگی کے ایک اور اہم پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائیگی۔ فی الحال میں حضور سرور کائنات ؐ کی ایک حدیث پر اس خطبے کو ختم کرتا ہوں جو ایک نہایت لطیف پیرائے میں رشد و ہدایت کی تمام شاہراہوں کو انسان پر کھول دیتی ہے۔

اَمر نی ربی (تبسع) الاخلاص فی السر العلانیه والعدل فی الغضب والرضاوا القصد فی الفقر و لغنیٰ وان اعفو عن من ظلمنی وَصل من قطعنی و اعطی من حرمنی و ان یکون لطقی ذکر "وصلی فکراً ونطرِی عبرة"

"مجھے میرے رب نے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ظاہر و باطن میں اخلاص پر کاربند رہنا، غضب و رضا دونوں حالتوں میں انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ فقر و تونگری میں میانہ روی۔ جو شخص مجھ پر زیادتی کرے اس کو معاف کردوں جو مجھ سے قطع رحم کرنے میں اس سے صلہ رحم کروں جو مجھے محروم کرے میں اس کو اپنے پاس سے دوں۔ میرا بولنا ذکر الٰہی کے لئے ہو۔ میری خاموشی غور و فکر کے لئے ہو اور میرا دیکھنا عبرت حاصل کرنے کے لئے ہو۔

۴.۳۔ توضیحات

نبی امی	:	وہ نبی جس نے کسی دنیاوی معلم سے تعلیم حاصل نہیں کی۔
خالق اکبر	:	سب سے بڑا پیدا کرنیوالا مراد اللہ تعالیٰ۔
احسن تقویم	:	اس آیت کے پہلے حصے کی طرف اشارہ ہے لہذا یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔ (سورہ التین)
اعتدال	:	درمیانہ راستہ اختیار کرنا نہ کمی نہ زیادتی۔
ضبطِ نفس	:	اپنی خواہشات پر قابو پانا۔
اقتصادی	:	جس کا تعلق مال دولت سے ہو۔
معاشرتی	:	جس کا تعلق معاشرے یا سوسائٹی سے ہو۔

اصول تقسیم وراثت : اسلام نے جائیداد کی تقسیم کے واضح اصول بتائے ہیں ان کی طرف اشارہ ہے۔

صیام کے زمانی تسلسل: مراد روزے مسلسل ایک مہینے کے لئے فرض کئے گئے ہیں۔

رجوع الی القرآن : قرآن کی طرف واپس آنا یعنی ہر معاملے میں قرآن کی رہنمائی حاصل کرنا۔

خطبے میں آنیوالی آیات کا ترجمہ

شہر رمضان ________________ فلیصمہ

رمضان کا مہینہ ایک ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن پاک نازل کیا گیا جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور جس میں ہدایت کی واضح نشانیاں ہیں اور جو کفر اور اسلام کے درمیان فرق کرنیوالا ہے۔ پس تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پالے تو اسے چاہیے کہ وہ اس مہینہ کے روزے رکھے۔

یا ایہا الذین آمنو ________________ لعلکم تتقون

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔

تلک حدود اللہ ________________ لعلکم تتقون

یہ اللہ کی حدود ہیں پس تم ان کے قریب نہ جاؤ۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تا کہ وہ متقی بن جائیں۔

لا تاکلو ________________ تعلمون

تم ایک دوسرے کا مال غلط طریقے پر مت کھاؤ اور نہ تم انہیں حکام کے پاس لے جاؤ تا کہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھاسکو جبکہ تم اس بات کے گناہ کو جانتے بھی ہو۔

۳۔خود آزمائی نمبر۲

(الف) ۱۔علامہ کا یہ خطبہ کس کے نام ہے؟

۲۔یہ خطبہ کس زمانے سے تعلق رکھتا ہے؟

۳۔مسلمانوں کے تہواروں اور دوسری قوموں کے تہواروں میں بنیادی فرق کیا ہے؟

۴۔روزے کب فرض ہوئے؟

۵۔عیدالفطر پہلی بار کب پڑھی گئی؟

۶۔وحی خداوندی نے احسن تقویم کسے کہا ہے؟

۷۔قرآن میں بہترین امت کسے کہا گیا ہے؟

۸۔معاشرتی مساوات قائم کرنے کے تین اسلامی اصول کون کون سے ہیں؟

۹۔نزول قرآن کی سالگرہ کس کو کہا گیا ہے؟

۱۰۔کیا روزہ ایک انفرادی عبادت ہی ہے؟

(ب) مندرجہ ذیل میں سے صحیح جواب پر نشان (✓) لگائیں؟

۱۔اس خطبے میں قرآن پاک کی

(ا) چھ آیات ہیں

(ب) تین آیات ہیں

(ج) چار آیات ہیں

۲۔اس خطبے میں احادیث کی تعداد

(ا) تین ہے

(ب) دو ہے

(ج) چار ہے

۳۔ اس خطبے کی نثر

(ا) مشکل ہے

(ب) مبہم ہے

(ج) آسان ہے

۴۔ اس خطبے کا اسلوب اسکے موضوع سے

(ا) مطابقت نہیں رکھتا ہے۔

(ب) بہت کم مطابقت رکھتا ہے۔

(ج) مکمل مطابقت رکھتا ہے۔

۵۔ اس خطبے میں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے صرف

(ا) سماجی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(ب) اقتصادی پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے۔

(ج) سیاسی پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے۔

۴۔ جوابات

خود آزمائی نمبر ا

(الف) (ا) معاشیات پر (۲) ۱۹۰۲ء میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر ا

(۳) جغرافیائی حدود اور مسلمان (۴) ۱۹۳۲ء ا

(۵) سید عبدالواحد معینی (۶) خطوط کا ا

(۷) شیخ عطا اللہ مرحوم نے (۸) انوار اقبال، گفتار اقبال ا

(۹) دہلی کو (۱۰) مرزا غالب، دارا شکوہ

(ب) ا۔ غلط ۲۔ صحیح ۳۔ غلط (سب خطوط نہیں) ۴۔ صحیح ۵۔ صحیح

(ج) ا۔ بمبئی ۲۔ سجابی نجفی ۳۔ سلطنت عثمانیہ ۴۔ مارسیلز ۵۔ غالب

خودآزمائی نمبر۲

(الف) (۱)۔پوری ملت اسلامیہ کے نام (۲)۔۱۹۳۲ء (۳)۔مسلمان اس بات پر بھی تہوار منا تے ہیں کہ خدائے پاک نے ہمیں اطاعت میں پورا اترنے کی توفیق عطا کی

(۴)۔۲ہجری میں (۵)۔۲ہجری میں (۶)۔انسان کو

(۷)۔امت مسلمہ کو (۸)زکوٰۃ، تقسیم، وراثت، صدقہ فطر

(۹)۔رمضان المبارک کے روزوں کو (۱۰)۔نہیں۔اجتماعی بھی ہے۔

(ب) ۱۔ج، ۲۔ب، ۳۔ج، ۴۔ج، ۵۔ب

یونٹ......۱۳

ترانہ ہندی اور ترانہ ملی

تحریر:
ڈاکٹر انور محمود خالد

فہرست

	تعارف	392
	مقاصد	392
۱۔	اقبال کا تصور وطنیت	393
۱.۱۔	ترانہ ہندی (متن)	398
۱.۲۔	نظم کا تعارف	399
۱.۳۔	نظم کا مرکزی خیال	399
۱.۴۔	توضیحات وتشریحات	400
۱.۵۔	نظم پر تبصرہ	402
۲۔	اقبال کا تصور ملت	403
۲.۱۔	ترانہ ملی (متن)	406
۲.۲۔	نظم کا تعارف	407
۲.۳۔	نظم کا مرکزی خیال	407
۲.۴۔	توضیحات	408
۲.۵۔	تشریحات	409
۲.۶۔	نظم پر تبصرہ	413
...	خود آزمائی	415
۳۔	جوابات	418

تعارف

عزیز طلباء وطالبات!

اس یونٹ میں آپ کو علامہ اقبال کی دو نظموں "ترانہ ہندی" اور "ترانہ ملی" کے حوالے سے ان کے وطن اور ملت کے متعلق تصورات سے آگاہ کیا جائے گا اور ان اسباب کی وضاحت کی جائیگی جن کی بناء پر "ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا" کے گیت گانے والا شاعر "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کی منزل تک پہنچ گیا۔ اقبال کے نکتہ چیں کہتے ہیں کہ اقبال پہلے وطنیت اور قومی اتحاد کے حامی تھے لیکن بعد میں وہ ملت اسلامیہ کے ترجمان بن کر رہ گئے۔ "ترانہ ہندی" اور "ترانہ ملی" دونوں نظموں کا موازنہ کر کے آپ پر واضح کیا جائے گا کہ اقبال کی وطن دوستی اور ملت پرستی میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے بلکہ یہ ان کے فکری ارتقاء کے دو مراحل ہیں جن کی اپنی الگ الگ اہمیت ہے۔

آیئے سب سے پہلے اس یونٹ کی اولین نظم "ترانہ ہندی" کے حوالے سے ان مقاصد کا تعین کر لیں جن کی روشنی میں ہمیں اقبال کی اس نظم کو سمجھنا ہے اور ان تصورات سے بھی آگاہ ہو جائیں جنہیں اقبال نے اپنی وطن دوستی کی بنیاد بنایا ہے۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد امید ہے کہ آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱۔ اقبال کی حب الوطنی کا تعارف کرا سکیں۔

۲۔ حب الوطنی پر مبنی اقبال کی نظموں کا ذکر، حب الوطنی کے احساسات کی وضاحت کر سکیں۔

۳۔ یہ واضح کر سکیں کہ اقبال کی شاعری کسی دور میں بھی وطن دوستی سے خالی نہیں رہی۔

۴۔ یہ بتا سکیں کہ اقبال جغرافیائی وطنیت کے تصور کی حمایت کرتے ہیں لیکن وطنیت کے سیاسی تصور کی مخالفت کرتے ہیں۔

۵۔ ''ترانہ ہندی'' کا تجزیہ کر کے اقبال کو ایک بالغ نظر ملی شاعر کی حیثیت سے متعارف کرا سکیں۔

۶۔ ''ترانہ ملی'' کا تجزیہ کر کے اقبال کو ایک عظیم محب وطن شاعر کی حیثیت سے متعارف کرا سکیں۔

ا۔ اقبال کا تصورِ وطنیت

اقبال کی ابتدائی نظموں سے ہی ان کے ایک محب وطن شاعر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ ہر انسان کی طرح انہیں بھی اپنے وطن ہندوستان سے گہری محبت تھی چنانچہ "بانگ درا" میں ان کی بعض نظمیں مثلاً "تصویر درد"، "ترانہ ہندی"، "نیا شوالہ" اور "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" وغیرہ وطن دوستی کے پاکیزہ جذبات سے لبریز ہیں۔ اقبال کی وطن پرستی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ان کے پہلے شعری مجموعہ "بانگ درا" کا آغاز ہی "ہمالہ" جیسی نظم سے ہوتا ہے جسمیں وہ کوہ ہمالیہ کو، فصیل کشور ہندوستان اور اپنے وطن کو آسمان سے بھی بلند قرار دیتے ہیں۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے ہمالہ، اے فصیل کشور ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

بظاہر یہ نظم محاکات (۱) کا ایک خوبصورت نمونہ ہے اور اس میں کوہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں، کالی گھٹا، چشموں، ندیوں، آبشاروں، درختوں اور پہاڑوں پر چھائے ہوئے رنگ شفق کی تصویر کھینچی گئی ہے لیکن دراصل اس میں شاعر نے ہندوستان کے ہزاروں سال پہلے کے سادہ، بے تکلف تمدن سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے اور ہمالیہ کی زبانی سیدھی سادھی زندگی کا ماجرا سننے کی خواہش کا اظہار کیا ہے جو رنگ تکلف سے پاک تھی، اور اسے اس

---

(۱) لفظی تصویر کشی

وقت کی داستان سنانے کیلئے کہا ہے جب یہ خطہ زمین انسان کے آباؤاجداد کا مسکن بنا تھا۔

''صدائے درد'' نظم میں اقبال نے اس بات پر بڑے رنج وغم کا اظہار کیا ہے کہ ان کا وطن نااتفاقی، انتشار اور نفاق کا شکار ہو رہا ہے اور ''تصویر درد'' میں ہندوستان کی قسمت پر ان الفاظ کے آنسو بہاتے ہیں۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
چھپا کر آستین میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

''صدائے درد'' کی طرح ''تصویر درد'' کا موضوع بھی وطن پرستی اور ملکی اتحاد ہے۔ اقبال اس نظم میں انسانی شخصیت اور فضیلت کی نشاندہی کرتے ہیں اور محبت کو ایک عالمگیر انسانی قدر بنا کر پیش کرتے ہیں جس کی مدد سے فرقہ بندی، تعصب اور نفاق پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اقبال نے ''تصویر درد'' میں ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی ابتری کا نقشہ کھینچا ہے اور ایسی تنگ نظری، مذہبی تعصب اور معاشی انتشار کی مذمت کی ہے جس سے ملکی اتحاد کی جڑیں کھوکھلی ہوتی ہیں۔

اس کے بعد وہ خوبصورت نظم آتی ہے جو ہمارے مرجودہ یونٹ کا موضوع ہے یعنی ''ترانہ ہندی'' اس نظم پر مفصل بحث تو بعد میں ہوگی لیکن یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ ''ترانہ ہندی'' میں اقبال نے بڑے پر جوش الفاظ میں وطن سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ اس نظم کی مقبولیت اور وطن پرستی کے سچے جذبات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مشہور رہنما گاندھی جی نے جب علامہ اقبال کی وفات کی خبر سنی تو اس نظم کے حوالے سے انہیں خراج تحسین ادا کیا۔ ان کے تعزیتی خط کی یہ سطور قابل ذکر ہیں۔

''ڈاکٹر اقبال کے بارے میں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم ''ہمارا دیس'' پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بڑودہ جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے''۔

یہ سب نظمیں اقبال کی شاعری کے دور اول کی یادگار ہیں اور بعض نکتہ چینوں کا خیال ہے کہ جوں جوں اقبال فکری ارتقاء کے مراحل طے کرتے گئے۔ ان کے وطن پرستانہ جذبات دھیمے اور ملت پرستانہ جذبات گہرے ہوتے گئے چنانچہ وہ الزام تراشتے ہیں کہ اقبال کی بعد کی نظموں میں وطن کے لئے وہ والہانہ پن دکھائی نہیں دیتا جو ان کی ابتدائی نظموں کا طرۂ امتیاز (۱) ہے یہ الزام درست نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اقبال کی پختگی کے دور کی تصانیف مثلاً ''جاوید نامہ'' اور ''مثنوی'' پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق مع مسافر'' بھی وطن دوستی کے بلند جذبات سے خالی نہیں ہے خصوصاً جاوید نامہ کا وہ حصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جہاں اقبال نے قلزم خونیں (۲) میں روح ہندوستان کے نالہ وفریاد کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے اور میر جعفر اور میر صادق جیسے غداروں کو ''ننگ (۳) آدم، ننگ دیں، ننگ وطن'' قرار دیکر ان کی روحوں کو اتنا ناپاک قرار دیا ہے کہ دوزخ بھی انہیں قبول کرنے سے انکار کردیتی ہے۔ اقبال نے انہیں قلزم خونیں میں مبتلائے عذاب دکھایا ہے کیونکہ ان کے نزدیک وطن سے

---

(۱) امتیازی نشان (۲) خون کا سمندر (۳) باعث شرم

غداری ایک ایسا خوفناک جرم ہے جسے کسی بھی حالت میں معاف نہیں کیا جاسکتا۔ بنگال کا جعفر اور دکن کا صادق اسی لئے ان کی نظروں سے گر گئے تھے کیونکہ انہوں نے ذاتی مفاد کی خاطر ملک وملت سے غداری کی اور وطن کو غیروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ فلک زحل پر عالم تیرہ و تار میں فرشتے گرز اور درے لیے ایسی خبیث روحوں کو سزا دینے کے لئے تیار کھڑے نظر آتے ہیں۔ اقبال نے جعفر اور صادق کو جس قسم کے عذاب میں مبتلا دکھایا ہے، اسے پڑھ کر انسان کانپ اٹھتا ہے۔ اقبال کے خیال میں وطن کے غداروں کو نہ دنیا میں سکھ چین نصیب ہوسکتا ہے اور نہ موت کے دامن میں آسودگی ملتی ہے۔

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اقبال کی وطن اور اس کی جغرافیائی حیثیت کے ساتھ محبت ایک مسلم امر ہے جس کی تائید ان کے اس مضمون سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے مارچ ۱۹۳۸ء میں اپنی وفات سے مہینہ ڈیڑھ پہلے جغرافیائی حدود اور مسلمان کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے فرمایا کہ ''ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصے میں بود و باش (۱) رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے وطن محض ایک جغرافیائی اصلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم (۲) نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ وطن کی محبت، انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے خارجی اثرات کی کچھ ضرورت نہیں''۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اقبال، جغرافیائی وطنیت کے تصور کے مخالف نہیں۔ یہاں البتہ وہ سیاسی وطنیت کے تصور کی حمایت نہیں کرتے جس کا سبب خود انہی کے لفظوں میں یہ ہے کہ ''زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ ''وطن'' ایک اصول ہے۔ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ (۳) کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی

---

(۱) رہنا (۲) ٹکرانے والا (۳) انسانیت کا اجتماعی نظام

تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعی انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے جب "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔" آسان لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اب وطن، محض زمین کے ایک ٹکڑے کا نام نہیں رہا جہاں کوئی خاص قوم بستی ہے بلکہ رنگ، نسل، زبان، تہذیب، تمدن، سیاسی اور معاشی وحدت اور رسوم وروایات کی یکسانیت کی بناء پر انسانوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو خود کو دوسروں سے بالاتر سمجھتا ہے اور انہیں اپنا غلام بنانا اور ان پر حکومت کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ اقبال نے وطنیت کے اس تصور کی مخالفت کی ہے جس سے مادی مفادات کی خاطر دنیا کی اقوام میں رقابت پیدا ہوتی ہے۔ وہ تجارتی منڈیاں حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتی ہے۔ انکی سیاست کا دارومدار مکروفریب اور دروغ گوئی پر ہوتا ہے۔ ان کی باہمی لڑائیاں کمزور ممالک کو پیس کر رکھ دیتی ہیں اور مخلوق خدا چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ قومیت کا یہ تصور اسلامی روح سے ٹکراتا ہے اور اسی لئے اقبال اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان تصورات کا اظہار انہوں نے اپنی مشہور نظم "وطنیت" (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) میں کیا ہے ورنہ جہاں تک وطن سے محبت کا تعلق ہے اقبال اسے انسان کا فطری جذبہ قرار دیتے ہیں اسی لئے "رام" پر اپنی نظم میں انہوں نے بام ہند کو آسمان سے بھی اونچا بتایا ہے اور اس شام کو صبح سے روشن تر قرار دیا ہے۔

یہ تو تھا نظم "ترانہ ہندی" کا فکری پس منظر۔ آیئے اب پہلے نظم پڑھیں تا کہ اس کے بعد اس کا تعارف کرایا جاسکے اس کے مرکزی خیال کی وضاحت کی جاسکے۔ اس کے مشکل الفاظ کی تشریح ہو۔ نظم کے اشعار کا تجزیہ ہو اور پھر نظم پر مختصر تبصرہ کیا جاسکے۔

۱۰۱۔ ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا

اے آب رود گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما، سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

۱.۲۔ نظم کا تعارف

یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۴ء میں لکھی اور سر عبدالقادر کے مشہور ''رسالہ مخزن'' کے اکتوبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں چھپی۔ اشاعت کے وقت اس کا عنوان ''ہمارا دیس'' تھا جو ''بانگ درا'' مرتب کرتے وقت تبدیل کر کے ترانہ ہندی رکھ دیا گیا۔ شیخ عبدالقادر اسی زمانے میں ولایت گئے ہوئے تھے جنہوں نے نظم کا تعارف کراتے ہوئے یہ نوٹ لکھا۔

جذبات دل کے ایک سینے پر منعکس ہونے کا بھی عجیب قانون ہے۔ ہمارے دوست (اقبال) نے مندرجہ ذیل اشعار میں ہو بہو وہ خیالات ظاہر کئے ہیں جو وطن سے دور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ میں اگر نظم لکھتا اور شاید لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے کہے ہیں۔

• گویا یہ ترانہ، علامہ اقبال کے جذبہ حب الوطنی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس میں انہوں نے پر جوش الفاظ میں ساری دنیا پر اپنے وطن کی برتری ظاہر کی ہے۔ انہیں ہندوستان کے محافظ پہاڑ ہمالیہ سے بھی محبت ہے تو ان ہزاروں ندیوں سے بھی جن کی وجہ سے یہ ملک جنت کا نمونہ بن گیا ہے۔ علامہ اقبال اس نظم میں ہندوستان کے رہنے والوں کو اتحاد و اتفاق کا درس دیتے ہیں کیونکہ اسی میں یہاں کے باشندوں کی بقاء ہے۔

۱.۳۔ نظم کا مرکزی خیال:

''ترانہ ہندی'' کا محرک تو شاعر کا جذبہ حب الوطنی ہے لیکن مرکزی خیال ہندو مسلم اتحاد ہے۔ علامہ اقبال محب وطن انسان تھے اور اپنے ملک کو امن و سکون کا گہوارہ دیکھنا چاہتے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں مذہب، تعصب، بغض اور عناد کا سبب بن رہا ہے اور یہاں کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان مذہبی اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں۔ اسی لئے انہوں نے تلقین کی کہ جب اُن دونوں میں سے کسی کا مذہب بھی نفرت نہیں سکھاتا تو پھر وہ یک دوسرے کی دشمن کیوں بن گئی ہیں انہیں چاہیے کہ ایک دوسرے کا احترام کریں اور مل کر اپنے وطن کی عظمت کے گیت گائیں۔

۴.۱۔توضیحات وتشریحات

غربت کے معنی ہیں پردیس۔ پربت کے لفظی معنی پہاڑ ہیں لیکن یہاں ہمالیہ پہاڑ مراد ہے۔ سنتری کا مطلب ہے پاسبان۔ رشک جناں کا مفہوم ہے جنت کی طرح حسین اور دلکش، رودگنگا۔ دریائے گنگا کو کہا جاتا ہے جو ہندوؤں کے نزدیک بہت مقدس ہے۔ بیر کے معنی ہیں دشمنی۔ روما جو آجکل اٹلی کا دارالحکومت ہے۔ زمانہ قدیم سے اہم ثقافتی اور مذہبی مرکز رہا ہے۔ کسی زمانے میں یہ عظیم سلطنت روم کا مرکز تھا۔ دورزماں۔ زمانے کی گردش کو کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں جتنے حوادث رونما ہوتے ہیں ان کا سبب زمانے کی گردش ہے۔ محرم کا مطلب ہے آشنا یا رازداں۔ دردنہاں سے مراد دل میں چھپا ہوا درد ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی سمجھنے کے بعد ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ نظم کے مطلب کی تہہ تک پہنچ سکیں۔ آیئے دیکھیں کہ علامہ اقبال ''ترانہ ہندی'' کے ذریعے ہمیں کس طرح وطن پر فخر کرنا سکھاتے ہیں اور کس طرح باہمی اتحاد واتفاق کا سبق دیتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ ہمارا ملک ہندوستان ساری دنیا سے اچھا ہے یہ اگر باغ ہے تو ہم اس کی بلبلیں ہیں جس طرح بلبلوں کو باغ سے عشق ہوتا ہے اسی طرح ہمیں بھی اپنے وطن سے محبت ہے اگر ہم کسی دوسرے ملک میں عارضی قیام کے لئے چلے جائیں تو بھی وطن کی یاد ہمارے دل سے محو نہیں ہوتی۔ ہم کہیں بھی ہوں ہمارا دھیان اپنے دیس کی طرف ہی ہوتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ جہاں ہمارا دل ہے ہم بھی وہیں ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ قدرت نے ہمارے ملک کو ہمالیہ پہاڑ کی شکل میں ایک مستقل پاسبان عطا کیا ہے جو ہمیں دشمن کے حملوں سے محفوظ رکھتا ہے یہ پہاڑ بلندی میں آسمان سے باتیں کرتا ہے اور کسی دشمن کو جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ اسے عبور کر کے ہمارے وطن پر حملہ آور ہوسکے۔ یوں یہ پہاڑ ایک قدرتی، مضبوط اور ناقابل تسخیر دیوار کا کام دے رہا ہے۔ اس پہاڑ کے دامن میں ہزاروں ندیاں بہہ رہی ہیں جن کے پانی سے سیراب ہو کر ہمارا وطن بہشت کا نمونہ بن گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال دریائے گنگا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ کیا تجھے وہ دن یاد ہیں جب تیرے کنارے ہم آریاؤں کا قافلہ اترا تھا؟ شاعر دریائے گنگا کو وہ زمانہ یاد دلا رہا ہے جب اس کے کنارے آریاؤں نے

ڈیرے ڈالے اور انہوں نے آس پاس اپنی بستیاں بسائیں۔ اس کے بعد اقبال، ہندوستان کے باشندوں کو یک جہتی کا سبق دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم سب ہندوستانی ہیں اور یہ ہم سب کا وطن مشترک ہے جب ہر مذہب امن و آشتی کی تلقین کرتا ہے تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنی دشمنی کیوں ہے؟ وہ مل جل کر ہنسی خوشی زندگی کیوں نہیں بسر کرتے؟ اقبال دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں کے تین گہواروں کی مثال دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یونان، مصر اور روما اپنے اپنے وقت میں دنیا کے عظیم ممالک تھے اور ان کی تہذیبوں نے رفعت و عظمت اور شان و شکوہ کے اعتبار سے اپنے جھنڈے گاڑ رکھے تھے لیکن اب ان عظیم الشان سلطنتوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا لیکن ان کے مقابلے میں ایک ہم ہیں کہ ہمارا وجود ابھی تک قائم ہے اور ہمارا وطن محفوظ ہے۔ ہماری تہذیب زندہ ہے اور ہماری قوم اپنی شاندار روایات کی وارث ہے اگر چہ زمانے کی گردش ہماری تاک میں رہی لیکن وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ یقیناً کوئی بات تو ایسی ہے کہ ہمارا وجود اب تک مٹ نہیں سکا۔ زمانے کی صدیوں کی دشمنی کے باوجود اگر ہماری وحدت قائم ہے تو اسکی وجوہات معلوم کرنا مشکل ہے دراصل ہم اپنے مذہب کی پاکیزہ تعلیم پر عمل کرتے ہیں اپنی قومی اقدار کو محفوظ رکھتے ہیں اور اپنے اسلاف کی روایات کے امین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے کے انقلاب ہم پر اثر انداز نہیں ہو سکے اور ہم ایک قوم کی حیثیت سے اب تک زندہ سلامت ہیں۔ نظم کے آخری شعر میں اقبال خود اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ مجھے دنیا میں کوئی ایسا ہمدرد انسان نہیں ملتا جس کے سامنے میں اپنے دکھ درد کا اظہار کر سکوں۔ مجھے کسی ایسے آشنا کی تلاش ہے جو میرے دل کے بھید جانتا ہو اور قوم کے غم میں میرا بوجھ بانٹ سکے۔ قوم کے افراد میں انتشار و افتراق دیکھ کر میرا دل غم میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ کاش کوئی دوست ملے جو درد کی وہی آنچ اپنے سینے میں بھی محسوس کرے کہ جس نے مجھے اپنا اسیر بنا رکھا ہے دراصل اقبال اس شعر میں اشارۃً اپنے ہم وطنوں کو بتا رہے ہیں کہ جب تک ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے عزت و احترام اور بے تعصبی و رواداری کے جذبات پیدا نہیں ہوں گے اس وقت تک وہ غیروں کے غلام بنے رہیں گے۔ حقیقت میں وطن کی محبت کا دعویٰ انہیں کو زیب دیتا ہے جو بلا امتیاز مذہب و ملت اپنے ہم وطنوں کے خیر خواہ ہوں۔

۱.۵۔ نظم پر تبصرہ

عزیز طلباء و طالبات!

آپ نے دیکھا کہ اقبال کا تصورِ وطنیت کس طرح نکھر کر ان کی نظم ''ترانہ ہندی'' میں سامنے آیا ہے۔ اقبال اپنے وطن کو سارے جہاں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی عظمت کے گیت گانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دیس ہو یا پردیس، سفر ہو یا حضر، اپنے وطن کی یاد سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ اس کے پہاڑوں، دریاؤں، ندیوں اور باغوں سے محبت کرتے ہیں وہ دریائے گنگا کے مقدس پانی کو آریائی قوم کے احسانات یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہندوستان ہندوؤں کا ہی وطن نہیں تھا۔ مسلمانوں کا بھی وطن تھا اور انہوں نے اپنے عدل، صداقت، رواداری، شجاعت اور رحمدلی سے نہ صرف یہاں کے باشندوں پر صدیوں تک حکومت کی بلکہ دنیا بھر میں اپنے وطن کا نام روشن کیا۔ انگریزوں نے بعد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنا غلام بنالیا اور پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، کی حکمت عملی کے تحت دونوں قوموں میں مذہبی اختلافات کا بیج بویا تا کہ وہ ہمیشہ سر پھٹول میں مصروف رہیں اور ان کے اقتدار کو خطرہ لاحق نہ ہوسکے۔ اقبال نے بڑے عمدہ طریقے سے اپنے ہم وطنوں کو انگریزوں کی چال سے آگاہ کیا ہے اور انہیں مذہبی منافرت پھیلانے سے منع کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ملکی اتحاد میں ہی انکی نجات کا راز پوشیدہ ہے۔

اب آیئے اس یونٹ کی دوسری نظم ''ترانہ ملی'' کی طرف۔ پیشتر اس کے کہ ہم نظم کا تعارف کرائیں۔ مرکزی خیال کی طرف رجوع کریں۔ مشکل الفاظ کی تشریح کر کے نظم کا تجزیہ کریں اور پھر اس پر اجمالی نظر ڈالیں یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کے فکری پس منظر پر پہلے روشنی ڈالی جائے یعنی اقبال کے تصورِ ملت کا ایک نظر جائزہ لیا جائے۔

۲۔ اقبال کا تصورِ ملت

اقبال نے جب یورپ کے تصورِ وطنیت کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ بہ حیثیت ایک سیاسی نظام کے یہ انسانیت کے لئے ایک مہلک نظام ہے۔ اپنے قیامِ یورپ کے زمانے میں انہوں نے اس نظام کی ہلاکت آفرینی کے مناظر دیکھے تو انہیں خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں یہ تصور ان کے ہموطنوں بالخصوص مسلمانوں کے دل و دماغ میں بھی سرایت نہ کر جائے چنانچہ انہوں نے ہندوستان واپس پہنچتے ہی اس تصور کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ اقبال نے قومیت کے ہر اس تصور کی مخالفت کی جس کی بنیاد رنگ و نسل یا تہذیب و زبان پر تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وطن کے سیاسی تصور نے قوموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں اور مصنوعی حد بندیاں قائم کر کے بنی نوع انسان کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں لکھے ہوئے اپنے مضمون ''مسلمان اور جغرافیائی حدود'' میں انہوں نے کھل کر اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس مضمون کا وہ اقتباس سنیئے جس سے ان کے تصورِ ملت پر روشنی پڑتی ہے وہ فرماتے ہیں میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانہ سے کر رہا ہوں جبکہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا مجھ کو یورپین تحریروں سے یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہوگئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں''۔

اقبال وطن پرستی کے اس جذبے کو جو انسان، انسان میں مصنوعی فرق قائم کرتا ہے۔ بت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ انسانی فکر بت تراشنے اور انہیں پوجنے کی بڑی شائق ہے۔ جب ایک بت ٹوٹ جاتا ہے تو وہ دوسرا تراش لیتی ہے۔ یہ سلسلہ ماضی میں بھی قائم تھا اور اب تک جاری ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب ان بتوں کی شکلیں قدرے بدل گئی ہیں۔ موجودہ دور کے انسان نے وطنیت کا بت تراشا ہے اور بنی نوع انسان کو اس کے آگے سر جھکانے کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے۔ اقبال وطن کو بت بنا کر پوجنے کے مخالف ہیں کیونکہ وہ اسے اسلام کی عالمگیر روح کے منافی تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس لئے بت کو توڑنا اپنا مذہبی فریضہ

سمجھتے ہیں۔ بانگ درا میں شامل ان کی نظم ''وطنیت'' جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ بڑی خوبصورتی سے اقبال کے خیالات کی وضاحت کرتی ہے۔ خاص طور پر یہ شعر ان کے مؤقف کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال کے خیال میں جس طرح اسلام رنگ ونسل کے امتیازات کے خلاف ہے اسی طرح وہ مسلمان کے لئے کسی خاص خطہ ارض کا پابند ہو کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ اسلام کی نظر میں انسان اور اس کی انسانیت کی قدر ہے نہ کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے کی۔ یہ درست ہے کہ انسان جس خاک سے جنم لیتا ہے اس سے اس کو محبت ہو جاتی ہے لیکن یہ محبت اتنی نہیں بڑھنی چاہیئے کہ اس جذبے سے مغلوب ہو کر بنی نوع انسان کی حق تلفی کی جائے اور بلند پایہ اخلاقی اقدار کو خاک میں ملا دیا جائے۔ اقبال نے اپنی کئی نظموں مثلاً ''طلوعِ اسلام'' میں واضح کیا ہے کہ مسلمان کسی خطۂ ارضی کا پابند نہیں ہو سکتا اس کے لئے ہر ملک، اپنا ملک ہے کیونکہ وہ خدا کا ملک ہے۔

انہیں اسباب کی بنا پر اقبال جیسے عظیم شاعر کو، جس کے لئے خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا تھا اور جو ''ہندی ہیں ہم وطن ہے، ہندوستان ہمارا'' کہتے نہیں تھکتا تھا وطنیت کے بارے میں اپنے پرانے مؤقف کو بدلنا پڑا۔ حب الوطنی اب بھی ان کے ایمان کا جزو تھی اور انہوں نے وطن کی محبت میں سرشار ہو کر اب بھی یہ چاہا کہ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں آبرومندانہ اور منصفانہ بنیادوں پر تصفیہ ہو جائے لیکن ان کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ ہندوؤں کا تعصب تھا جو وہ مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھ کر ان سے روا رکھتے تھے۔ یورپ سے واپسی کے بعد جہاں اقبال کو مغربی اقوام کی ریشہ دوانیوں کا پتہ چلا کہ کس طرح وہ وطن پرستی کی آڑ میں اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کو محکوم بنانے پر تلی ہوئی تھیں وہیں انہیں اس بات کا احساس بھی ہوا کہ ہندوستان میں ہندو اس لئے نظریہ وطن کی حمایت اور تبلیغ کرتے ہیں تاکہ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے وہ مسلمانوں کو اپنے جال میں پھانس کر اپنا غلام بنا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس نے اپنا یہ مقصد حاصل

کرنے کے لئے ایسے نیشنلسٹ مسلمان رہنماؤں کو آگے بڑھایا جو متحدہ قومیت کے نظریے کے حامی تھے۔ اقبال کے نزدیک وطنیت کا یہ تصور گمراہ کن اور مسلمانوں کے مفاد کے منافی تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے وطنیت کی ہر ایسی شق پر کاری ضرب لگائی جو امت مسلمہ کے لئے کسی بھی لحاظ سے خطرے کا باعث بن سکتی تھی چنانچہ "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" کہنے والے شاعر کو بالآخر ایک نیا ترانہ لکھنا پڑا جس کا نقطۂ آغاز یہ ہے۔

چین و عرب ہمارا ، ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

عزیز طالب علمو! یہ تو تھا نظم "ترانہ ملی" کا فکری پس منظر۔ اب آیئے پہلے نظم پڑھیں اور پھر اس کا تجزیہ کریں۔

۱۰۲۔ترانہ ملی

چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں ، وہ پاسباں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشان ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
اے گلستانِ اندلس! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

اے موج دجلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
اے ارضِ پاک! تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

۲.۲۔نظم کا تعارف

یہ نظم اقبال نے یورپ سے ہندوستان واپس آنے کے بعد ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۱ء کی درمیانی مدت میں کسی وقت لکھی۔ یہ عوام میں ''قومی ترانہ''، ''اقبال کا ترانہ'' یا صرف ''ترانہ'' کے نام سے معروف ہے اور آج بچے بچے کی زبان پر ہے۔ اس سے پہلے اقبال نے ۱۹۰۴ء میں ''ترانہ ہندی'' نظم لکھی تھی جب وہ وطنیت کے حامی تھے لیکن یورپ سے واپسی کے بعد ان کی ''وطنیت پرستی'' ارتقائی مراحل طے کر کے ''ملت پرستی'' میں ڈھل گئی کیونکہ اب وہ اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں بلکہ اسلام ہے۔ اسی لئے انہیں خود ''ترانہ ہندی'' کے مقابلے میں ''ترانہ ملی'' لکھنا پڑا تا کہ اپنے حقیقی عقیدے کا واضح طور پر اظہار کر سکیں۔

۲.۳۔نظم کا مرکزی خیال

اس نظم کا محرک یہ احساس ہے کہ مسلمانوں کی قومیت کی اساس، وطن نہیں بلکہ عقیدہ توحید ہے علامہ اقبال ۱۹۰۸ء سے پہلے بھی خیال رکھتے تھے کہ ہندو اور مسلمان برصغیر میں مل کر رہ سکتے ہیں لیکن جب ان پر حقیقت منکشف ہوئی تو انہوں نے اپنی آرزوؤں کا مرکز صرف اس قوم کو بنا لیا جو ان کے پیغام کو سمجھ سکتی تھی اور عقیدے کی بناء پر ایک ملت متصور ہوتی تھی۔ اقبال اس نظم میں پوری دنیا کو مسلمانوں کا وطن قرار دیتے ہیں اور

انہیں ایک عالمگیر برادری کے رشتے میں بندھا ہوا دیکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک اسلامی قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن، نہ اشتراک غرض بلکہ مسلمان اس بین الاقوامی برادری میں شریک ہیں جو حضور اکرمؐ نے قائم فرمائی تھی۔ اسلام نے تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا ہے اور یہی اسلامی قومیت کی بنیاد ہے۔ اقبال نے اس نظم میں وطن کی پاسبانی کی بجائے خانۂ خدا کی پاسبانی کا اعلان کیا ہے اور یوں زمین کے کسی ٹکڑے کی بجائے عقیدہ توحید و رسالت سے پیمانِ وفا باندھنے کا اقرار کیا ہے۔

۴.۲ توضیحات

توحید کا مطلب ہے خدا کو ایک ماننا۔ توحید کی امانت سے مراد خدا کو واحد ماننے کا اسلامی عقیدہ ہے جس کی حضور اکرمؐ سمیت تمام انبیائے کرام نے تبلیغ کی اور جسے مانے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ بت کدہ کے معنی ہیں بتوں کا گھر یا عبادت گاہ۔ یہاں بت کدہ سے مراد خانہ کعبہ ہے جو عربوں کے نزدیک بہت مقدس عبادت گاہ تھی اور جہاں انہوں نے پرستش کے لئے تین سو ساٹھ بت رکھے تھے۔ حضور اکرمؐ نے فتح مکہ کے موقع پر اس خدا کے گھر کو بتوں سے پاک کیا۔ خدا کا پہلا گھر خانہ کعبہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر مکہ میں تعمیر کیا تھا تا کہ اس میں خدا کی عبادت کی جا سکے۔ قرآن مجید کے مطابق یہ دنیا کی پہلی عبادت گاہ ہے۔ ہلال: پہلی رات کے چاند کو کہتے ہیں۔ مغرب سے مراد یورپ اور افریقہ کے ممالک ہیں۔ سیلِ رواں کا مطلب ہے بڑھتا ہوا سیلاب۔ باطل، ہر وہ چیز جو غیر اسلامی ہو۔ اندلس: سپین کا ہسپانیہ کا ہی ایک نام ہے جسے مسلمانوں نے فتح کیا۔ پہلے یہ ہسپانیہ کے ایک حصے کا نام تھا جس میں جنوبی اور وسطی ہسپانیہ شامل تھا بعد میں عربوں نے پورے ملک کو اسی نام سے پکارنا شروع کیا اور اس پر ساڑھے سات سو سال تک حکومت کی، دجلہ: عراق کا مشہور دریا ہے جس پر بغداد واقع ہے۔ ارض پاک سے حجاز کی سرزمین مراد ہے جس میں مسلمانوں کے دو مقدس ترین شہر مکہ اور مدینہ واقع ہیں۔ سالارِ کارواں کا مطلب ہے قافلے کا سردار۔ اس لفظ اور میر حجاز سے نبی اکرمؐ مراد ہیں۔ بانگِ درا گھنٹی کی آواز کو کہتے ہیں۔ وہ گھنٹی جو اونٹ کے گلے میں بندھی ہوتی ہے اور اس کے چلنے کے ساتھ بجتی ہے۔ جادہ پیما کا مطلب ہے رواں دواں یا چلنے کیلئے تیار ہونا۔

۲.۵۔تشریحات

اب آیئے، طلبائے عزیز۔ ''ترانۂ ملی'' نظم کے مطالب کی وضاحت کریں اور دیکھیں :علامہ اقبال اس ترانے کے ذریعے ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری قومیت کسی ایک ملک کی حدود تک مقید نہیں ہے ہم مسلمان ہیں اور اسلام کی تعلیم یہ ہے تمام کلمہ گو چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں رہتے ہوں ایک دوسرے کے بھائی ہیں ایک امت کے افراد ہیں ۔ چین بھی ہمارا وطن ہے اور عرب بھی ۔ یہی حال ہندوستان کا ہے ۔ ہم مسلمان ہیں اور ساری دنیا ہمارا وطن ہے ۔ ہم خود کو زمین کے کسی ایک ٹکڑے تک محدود نہیں سمجھتے ۔ ہمارے نبی اکرمؐ کی تعلیم یہ ہے کہ تمام مسلمان ایک دیوار کی مختلف اینٹوں کی طرح ہیں جو ایک دوسرے سے پیوست ہیں ہمیں رنگ، نسل، زبان، خون، خاندان، برادری یا تہذیب و تمدن کی بناء پر خود کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم نہیں کر لینا چاہیے اسلام کے نزدیک گورے اور کالے، سرخ اور سفید، عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مسلمانوں کی قومیت کی مشترکہ بنیاد عقیدۂ توحید ہے نہ کہ وطن کا مغربی تصور اسی لئے اقبال چینی، عربی اور ہندی مسلمانوں کو اپنا بھائی خیال کرتے ہیں اور اس سارے کرۂ ارض کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں۔

اگلے شعر میں اقبال بتاتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی بقا کا راز عقیدۂ توحید میں پوشیدہ ہے چودہ صدیوں سے ہم اس عقیدے کے حامل چلے آ رہے ہیں اور جہاں، دنیا کی کئی قومیں فنا ہو گئیں وہاں گردش زمانہ ہمارا بال بیکا نہ کر سکی اللہ تعالیٰ کی واحدانیت پر ایمان کی جو دولت حضور اکرمؐ نے ہمیں عطا کی تھی، ہم نے اسے ضائع نہیں کیا جب تک یہ امانت ہمارے سینوں میں محفوظ رہے گی کوئی ہمارا نام و نشان نہیں مٹا سکے گا۔

خانہ کعبہ، خدا کا گھر ہے اور خدا نے اسے دنیا کی پہلی عبادت گاہ قرار دیا ہے جسے حضرت ابراہیمؑ اور انکے صاحبزادے، حضرت اسماعیلؑ نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا۔ دنیا کے تمام مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اس کی حفاظت کرنا دینی فریضہ تصور کرتے ہیں ۔ یہ مسلمانوں کی مرکزیت کی علامت ہے ۔ یہ ہمارا پاسبان ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب تک کعبہ موجود رہے گا ۔ مسلمان بھی دنیا میں موجود رہیں گے کیونکہ خدا کے اس متبرک گھر کی بدولت دنیا بھر کے کروڑوں مسلمان رشتہ اتحاد میں بندھے ہوئے ہیں۔

اگلے شعروں میں اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان پیدائشی سپاہی ہے۔ وہ بچپن میں بھی تلواروں سے کھیلتا ہے اور تلواروں کے سائے میں ہی پروان چڑھتا ہے۔ ہر مسلمان پر جہاد فرض ہے اور جہاد بھی تلوار اور اسلحے کے ذریعے۔ یہی اسلامی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ مسلمانوں کے پرچم پر بھی پہلی رات کے چاند کی تصویر ثبت ہے۔ جو خنجر سے مشابہ ہے گویا مسلمانوں کا قومی نشان ہی ہلال کا خنجر ہے۔ چنانچہ جس قوم کے بچوں کی پرورش تلواروں کے سائے تلے ہوئی ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی۔

اقبال کہتے ہیں کہ ہم مسلمان عرب سے نکلے اور جہاد کرتے ہوئے الجزائر، مراکش، ہسپانیہ، فرانس اور جنوبی و مشرقی یورپ تک جا پہنچے۔ ہم نے مغرب کی وادیوں میں اذانیں دیں اور ہر جگہ فتح کے پرچم لہرائے۔ تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جس طرف ہم نے رخ کیا کسی کو ہمارے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

اے آسمان! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ حق و صداقت کے نام لیوا ہیں۔ کفر نہ ہمیں ڈرا سکتا ہے اور نہ ہم اس سے دبنے والے ہیں۔ قرآن مجید میں (سورہ بنی اسرائیل) اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ اے رسول! انہیں بتا دیجئے کہ حق آ گیا ہے اور باطل نکل بھاگا ہے۔ بے شک باطل کو نکل بھاگنا ہی تھا۔ دنیا نے سینکڑوں دفعہ ہمیں آزمایا اور ہم ہر دفعہ سچائی کے امتحان میں کامیاب نکلے۔ جھوٹ اور مکر و فریب کی طاقتیں نہ پہلے ہمیں مغلوب کر سکی ہیں اور نہ آئندہ کر سکیں گی۔

اے اندلس کی جنت کی مانند سرزمین! تجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہوں گے جب ہم نے تجھے اپنا وطن بنایا۔ ہم نے تجھے فتح کیا اور ایسی عظیم الشان سلطنت قائم کی کہ رہتی دنیا تک یاد رہے گی۔ اندلس جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم نے تجھ میں علم و ہنر کی روشنی پھیلائی۔ جب سارا یورپ علم و دانش سے بے بہرہ تھا ہم نے تجھے تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنایا اور سارے عربوں کے لئے وہ مینارۂ نور ثابت ہوا۔ ہم نے اہل فرنگ کو علوم سکھائے اور انہیں تہذیب و شائستگی سے آشنا کیا۔ آج یورپ کو جس علم و ہنر پر ناز ہے اس کی داغ بیل ہمیں

نے ڈالی تھی۔ اے سرزمین اندلس! تجھے اچھی طرح یاد ہوگا کہ ہم نے تیری وسعتوں میں مسجد قرطبہ اور غرناطہ کے محل الحمراء جیسی خوبصورت یادگاریں قائم کیں جنہیں دیکھ کر دنیا حیران ہوتی ہے ہم محض تجھے تسخیر کرنے کے لئے نہیں آئے تھے۔

اے دریائے دجلہ کی لہرو! تم بھی ہمیں بخوبی جانتی ہو ہم وہی ہیں جنہوں نے دریا کے دونوں کناروں پر بغداد جیسا خوبصورت شہر بسایا اور ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو اپنے وقت میں دنیا کی عظیم ترین سلطنت تھی۔ یہاں شاعر کا اشارہ خلافت عباسیہ کی طرف ہے جس کے ایک حکمران ابو جعفر المنصور نے ۷۶۲ء میں دریائے دجلہ کے کنارے اپنے نئے دارالحکومت بغداد کی تعمیر کا آغاز کیا اور ۷۶۶ء تک ایک دائرے میں اس شہر کی تعمیر مکمل ہوگئی ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانے میں اس کی وسعت وعظمت میں بہت اضافہ ہوا۔ شان و شوکت کے لحاظ سے اس زمانے میں کوئی شہر بغداد کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ بغداد ایک مدت تک مسلمانوں کا تہذیبی وثقافتی مرکز رہا۔ دنیا میں اس کے محلات، باغات اور مساجد ومکاتب کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ اے دریائے دجلہ! بغداد کی پرانی عظمت، ماضی کا قصہ بن چکے ہیں لیکن تجھے تو ہماری پوری تاریخ سے آگاہی حاصل ہے اس لئے کہ تو نے ہمارے سب لیل ونہار دیکھے ہیں۔

اے حجاز کی مقدس سرزمین! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب بھی کسی نے تیری طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا ہم نے اپنی جانوں پر کھیل کر بھی تیری حرمت کی حفاظت کی۔ تجھ میں مسلمانوں کے دو مقدس ترین شہر آباد ہیں جن کی حفاظت کرنا ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے۔ اے مقدس علاقے! تیرا چپہ چپہ ہمارے لئے پاکیزہ ہے اور حرمین شریفین (یعنی مکہ اور مدینہ) کی حفاظت کے لئے ہم نے کئی بار اپنا خون بہایا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تیری رگوں میں اب تک ہمارا خون دوڑ رہا ہے۔ ہم نے پہلے بھی تیرے مقابلے میں اپنی جانوں کو کبھی عزیز نہیں سمجھا اور آئندہ بھی اگر تیرے ناموس پر حرف آیا تو دنیا دیکھے گی کہ ہم پھر اپنی جان ہتھیلی پر لے کر تیری حفاظت کے لئے نکل آئے ہیں۔

ہمارے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ ہماری امت کے قافلہ سالار ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ ہیں۔ وہ ہمارے آقا وہ ہمارے ہادی اور ہمارے پیشوا ہیں۔ انہیں کی وجہ سے ہمیں مسلمان بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان ہی کے پاک نام کی برکت سے ہمارے دل سکون کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ایک حدیث ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک کامل مسلمان نہیں بن سکتا جب تک اسے حضور اکرمؐ کی ذات سے عشق نہ ہو اور وہ انہیں اپنے ماں باپ، عزیز و اقارب اور اولاد سے زیادہ عزیز نہ چاہے۔ جن خوش نصیب لوگوں کو ان کی محبت حاصل ہے ان کے دل دائمی اطمینان اور آسودگی سے لبریز ہیں۔

آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ ان کا ترانہ مسلمانوں کے قافلے کے لئے ''بانگ درا'' کا کام دیگا یعنی اس گھنٹی کی آواز کی طرح جو اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوتی ہے اور جب وہ سفر کے لئے روانہ ہوتے ہیں تو یہ گھنٹی بج کر اشارہ کرتی ہے کہ اب کارواں چلنے کے لئے تیار ہے۔ اقبال کی شاعری نے امتِ مسلمہ کو صدیوں کی نیند سے بیدار کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے پیغام سے مسلمانوں کو احساس دلایا ہے کہ خوابِ غفلت میں ڈوبے رہنے کے دن گزر چکے۔ دنیا کی دوسری اقوام ترقی کی دوڑ میں کہیں آگے نکل چکی ہیں اگر مسلمان بھی دنیا میں عزت چاہتے ہیں تو انہیں اقبال کی آواز پر کان دھرنے ہوں گے۔ اقبال کا پیغام اسلام کا پیغام ہے اور اسلام مسلمانوں کو مسلسل جدوجہد اور حرکت کی تلقین کرتا ہے۔ اقبال اپنی امت سے مایوس نہیں ہیں بلکہ انہیں پورا یقین ہے کہ اگر انہوں نے اپنی دردمند آواز قوم کے دل میں اتار دی تو وہ پھر سے اس راستے پر چل نکلے گی جو اسلام نے ان کے لئے تجویز کیا، اسی لئے اقبال کی آواز میں سرخوشی، جوش و خروش، عزم و حوصلہ اور ولولہ انگیزی پائی جاتی ہے اور وہ یہ بات سوچ کر خوش ہیں کہ ان کی قوم ایک بار پھر عظمت کی اس منزل تک پہنچے گی جو دنیا میں مردانِ حُر کا مقدر ہے۔

۲.۶۔ نظم پر تبصرہ

عزیز طلبہ و طالبات! اب تک کی ساری بحث سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اقبال ایسے تمام نظریوں کی مخالفت کرتے ہیں جو اسلامی اخوت کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں چونکہ اس قسم کے نظریات میں وطنیت اور جغرافیائی قومیت کے تصورات پیش پیش ہیں اسی لئے اقبال نے ان پر کاری ضرب لگانا ضروری سمجھا۔ اقبال اسی لئے اسلام کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہی نظام رنگ و نسل کے امتیازات اور قوم و وطن کے تعصبات کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ ''ترانہ ہندی'' اور ''ترانہ ملی'' دونوں نظموں کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان کا خالق جغرافیائی وطنیت کے محدود دائرے سے نکل کر اسلامی قومیت کے وسیع منطقے میں داخل ہو گیا ہے۔ ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' کہنے والا شاعر ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ''ترانہ ہندی'' میں وہ صرف ہندوستان کا ذکر کرتا ہے لیکن ''ترانہ ملی'' میں وہ نہ صرف چین و عرب اور ہندوستان کا ثنا خواں ہے بلکہ پوری دنیا کو اپنا وطن قرار دیتا ہے۔ ''ترانہ ہندی'' میں وطن کی محبت شاعر کے دل میں بسی ہوئی ہے لیکن ''ترانہ ملی'' میں توحید کی امانت سینے میں لئے ہوئے ہے۔ ''ترانہ ہندی'' میں وہ ہمالیہ پہاڑ کو اپنا اور اپنے وطن کا محافظ قرار دیتا ہے لیکن ''ترانہ ملی'' میں بیت اللہ اس کا پاسبان ہے۔

''ترانہ ہندی'' میں وہ دریائے گنگا کے کنارے اپنا آبائی کارواں اترتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن ''ترانہ ملی'' میں وہ مغرب کی وادیوں، اندلس کے گلستانوں اور دجلہ کے کناروں پر اسلامی تہذیب و تمدن کی شان و شوکت کے جھنڈے لہراتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اب وہ باغ ہند کا بلبل نہیں رہا بلکہ میر حجاز کا جان نثار ہے اور ارض پاک کی حرمت پر کٹ مرنے کا اعلان کرتا ہے۔ ''ترانہ ملی'' اقبال کے بدلتے ہوئے رجحانات اور ارتقاء یافتہ تصورات کی سچی تصویر ہے یہاں شاعر کا ملی جذبہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اب اس کا مرکز نگاہ محض ہندوستان نہیں رہا بلکہ وہ ملک بن گیا ہے جہاں اسلام کے نام لیوا بستے ہیں۔ ''ترانہ ملی'' میں اقبال نے قومیت سے بین

لاقوامیت اور وطن سے پان اسلام ازم یعنی اتحاد عالم اسلامی کی طرف سفر کیا ہے۔ یوں یہ نظم ہر مسلمان ملک کا قومی گیت بن جاتی ہے اور اس کے فارسی اور عربی تراجم بڑے مقبول ہوئے ہیں۔

آپ نے ''ترانہ ہندی'' اور ''ترانہ ملی'' کے حوالے سے، اقبال کے تصورِ وطنیت سے بھی آگاہی حاصل کرلی ہے اور ان کے تصورِ ملت سے بھی واقفیت فراہم کرلی ہے۔ دونوں نظموں کا فکری پس منظر'' تعارف ''مرکزی خیال، مشکل الفاظ کی وضاحت، کی تشریح اور ان پر مختصر تبصرہ بھی آپ کے سامنے آچکا ہے۔ آیئے! ذرا دیکھیں کہ آپ نے کس حد تک ان مطالب کو ذہن نشین کیا ہے جو موجودہ گفتگو میں تفصیل سے پیش کیے جاچکے ہیں۔

۳۔ خود آزمائی

(الف) ۱۔ کیا اقبال کی نظموں سے ان کے محب وطن شاعر ہونے کا پتہ چلتا ہے؟

۲۔ اقبال کی حب الوطنی کی حامل کم از کم دو نظموں کے نام لکھیں کہ وہ نظمیں کون کونسی ہیں؟

۳۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال کے پہلے اردو مجموعہ کلام کا آغاز ہی ایک ایسی نظم سے ہوتا ہے جو حب الوطنی کے پاکیزہ جذبات سے لبریز ہے۔ وہ نظم کون سی ہے؟

۴۔ اقبال حب الوطنی کے کیوں قائل ہیں؟

۵۔ کیا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کے وطن پرستانہ جذبات مدھم پڑتے گئے؟

۶۔ کیا اقبال کی آخری عمر کی نظموں میں بھی وطن دوستی کے خیالات کا پرجوش اظہار ملتا ہے؟

۷۔ کیا اقبال جغرافیائی وطنیت کے تصور کی حمایت کرتے ہیں؟

۸۔ کیا اقبال سیاسی وطنیت کے تصور کی حمایت کرتے ہیں؟

۹۔ اقبال کے نزدیک وطن کے غداروں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

۱۰۔ اقبال وطن کے جغرافیائی تصور کی حمایت کیوں کرتے ہیں؟

(ب) مندرجہ ذیل صحیح فقرات پر نشان (✓) لگایئے۔

۱۔ (الف) اقبال نے ترانہ ملی میں ملیت سے وطنیت کی طرف سفر شروع کیا۔

(ب) اقبال نے قومیت سے بین الاقوامیت کی طرف سفر شروع کیا۔

۲۔ (الف) ''نظم ترانہ ملی'' تمام مسلم ملکوں کا قومی گیت بن جاتی ہے۔

(ب) اس نظم کو کسی مسلم ملک میں پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔

۳۔ (الف) حرمین شریفین کی حفاظت کرنا اللہ کا کام ہے۔

(ب) ان شہروں کی حفاظت کرنا ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے۔

۴۔(الف)بغداد کی تعمیر کا آغاز اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کیا۔

(ب)بغداد کی تعمیر کا آغاز عباسی خلیفہ ابوجعفرالمنصور نے کیا۔

۵۔(الف)اقبال کی نظم ''وطنیت'' ''بانگِ درا'' میں ہے۔

(ب)یہ نظم ''بالِ جبریل'' میں شامل ہے۔

(ج)دیئے ہوئے الفاظ میں سے صحیح لفظ منتخب کر کے خالی جگہ پُر کیجئے۔

ا۔''ترانہ ہندی'' کا محرک.........کا جذبہ ہے۔

(اتحادِ عالمِ اسلامی ،وطن دشمنی ،وطن دوستی)

۲۔اقبال کے ذہنی ارتقاء میں ہندوستان کے.............کا بھی دخل تھا۔

(اقتصادی حالات ،سماجی حالات ،سیاسی حالات)

۳۔''ترانہ ملی'' میں اقبال کا پیغام.............ہے۔

(بین الاقوامی اتحاد ،اسلامی اتحاد ،ملکی سطح پر اتحاد)

۴۔اقبال کے نزدیک اسلامی تصورِ قومیت کی بنیاد.............ہے۔

(رسول اللہؐ سے محبت ،عقیدۂ توحید ،آخرت پر ایمان)

۵۔اقبال نے نظم ....کو ''بانگِ درا'' قرار دیا۔

(ترانہ ہندی ،ترانہ ملی ،وطنیت)

۶۔''ترانہ ہندی'' میں اقبال کا پیغام.............ہے۔

(ہندو مسلم اتحاد ،ہندو سکھ اتحاد ،انگریز مسلم اتحاد)

۷۔ ''ترانہ ملی'' میں..................کو خاص طور پر منتخب کیا گیا ہے۔

(ہندوستان، ارض پاک، فرانس)

۸۔ اقبال امت مسلمہ سے..................ہیں۔

(ناامید، ناراض، پرامید)

۹۔ ایک مدت تک اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے۔

(لندن، کلکتہ، بغداد)

۱۰۔ ''ترانہ ملی'' میں اقبال دریائے..................کو بھی مخاطب کرتے ہیں۔

(دریائے گنگا، دریائے دجلہ، دریائے سندھ)

۴۔ جوابات

(الف) ۱۔ جی ہاں ۲۔ صدائے درد، تصویر درد ۳۔ ہمالیہ ۴۔ کیونکہ یہ انسان کا فطری جذبہ ہے ۵۔ جی ہاں ۶۔ جی ہاں ۷۔ جی ہاں ۸۔ جی نہیں

۹۔ دوزخ کی آگ بھی انہیں قبول نہیں کریگی۔ ۱۰۔ کیونکہ یہ اسلامی تعلیم کے خلاف نہیں۔

(ب) ۱۔ ب ۲۔ الف ۳۔ ب ۴۔ ب ۵۔ الف

(ج) ۱۔ وطن دوستی ۲۔ سیاسی حالات ۳۔ اسلامی اتحاد ۴۔ عقیدۂ توحید ۵۔ ترانۂ ملی

۶۔ ہندو مسلم اتحاد ۷۔ ارض پاک ۸۔ پرامید ۹۔ بغداد ۱۰۔ دریائے دجلہ

یونٹ......۱۴

شکوہ

تحریر:
ڈاکٹر انور محمود خالد

فہرست

تعارف	422
مقاصد	423
۱۔ اسلامی دنیا کا عروج وزوال	424
۲۔ نظم کا تعارف	427
۲.۱۔ نظم کا مرکزی خیال	428
۲.۲۔ نظم کا تجزیہ	428
۲.۳۔ تشریحات	430
۲.۴۔ نظم پر تبصرہ	455
۳۔ خود آزمائی	457
۴۔ جوابات	459

تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

اس یونٹ میں اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" کے ذریعے سے آپ کو بتایا جائیگا کہ مسلمانوں نے کس طرح دنیا میں عروج حاصل کیا اور کس طرح پھر زوال سے دو چار ہوئے۔ امتِ مسلمہ کا عروج وزوال، اقبال کی شاعری کے ایک بڑے حصے کا موضوع ہے۔ ان کی تمام طویل اردو نظمیں کم وبیش اسی داستان عبرت کی تفصیل پیش کرتی ہیں لیکن "شکوہ" اور "جواب شکوہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ یہ اسی موضوع کے لئے وقف ہیں۔ اس یونٹ کے ذریعے سے آپ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ علامہ اقبال نے کس طرح مسلمانوں کے ماضی کی شان وشوکت کا ذکر کرنے کے بعد ان کے حالیہ زوال کی نشاندہی کی ہے اس نظم کا مقصد مسلمانوں میں قومی بیداری کا شعور پیدا کرنا ہے اور اس نقصان کا ازالہ کرنا ہے جو ان کے دینی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی تنزل کی وجہ سے ظہور میں آیا اسی لئے شاعر نے امتِ مسلمہ کی تمام کمزوریوں اور خامیوں کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں کر دیا ہے تاکہ مسلمان اپنے قومی نقصان کو پہچانیں اور اپنی پستی کا علاج کریں۔ حالی بھی قوم کے زوال کی کہانی سناتے ہیں لیکن ان کی نظمیں پڑھ کر دل افسردہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اقبال ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ طبیعتیں افسردہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ مسلمانوں کے زندہ جاوید (۱) کارنامے پیش کرتے ہیں کہ زوال پذیر قوم کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں اور وہ نئی امنگوں اور نئے جوش وخروش کے ساتھ کارزار (۲) زندگی میں شریک ہونے کے قابل ہو جاتی ہے۔ "شکوہ" اس لحاظ سے اہم نظم ہے کہ اس میں شاعر نے محض اپنے شاندار ماضی کی مدح سرائی (۳) نہیں کی بلکہ حال کی پستی سے اس کا موازنہ کر کے مستقبل کے لئے دعوت عمل بھی دی ہے یوں یہ نظم صرف ماضی کی روشن اور حال کی تاریک تصویریں پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ شاندار مستقبل کی بشارت بھی دیتی ہے بشرطیکہ مسلمان اپنے زوال کے اسباب دور کریں یوں دیکھا جائے تو یہ نظم ایک وسیع پس منظر کے نقوش ابھار کر اسلامی دنیا کے موجودہ انحطاط پذیر (۴) ذہن کا تجزیہ کرتی ہے۔

---

(۱) ہمیشہ رہنے والے (۲) لڑائی (۳) تعریف کرنا (۴) زوال کی طرف مائل

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد امید ہے آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱۔ اسلامی دنیا کے بگڑتے ہوئے حالات کا ذکر کر سکیں۔

۲۔ یورپی اقوام کے مسلم ممالک پر غلبہ پانے کا تذکرہ کر سکیں۔

۳۔ ہندوستان میں رونما ہونیوالی سیاسی، معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کی نشاندہی کر سکیں۔

۴۔ اقبال کی وطنی شاعری کی بجائے ملی شاعری کی طرف رجوع کرنے کے اسباب کی وضاحت کر سکیں۔

۵۔ اقبال کی قومی اور ملی شاعری میں "شکوہ" کی اہمیت واضح کر سکیں۔

۶۔ نظم شکوہ کے محرکات کی وضاحت کر سکیں۔

۷۔ نظم کا تجزیہ کر کے امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے بارے میں اقبال کے نقطہ نظر کی وضاحت کر سکیں۔

ا۔ اسلامی دنیا کا عروج و زوال

اقبال کا زمانہ عالمگیر پیمانے پر ایک سیاسی کشمکش کا زمانہ تھا جب مغرب کی تہذیب، مشرق پر غالب آنے کی کوشش کر رہی تھی ہندوستان سیاسی، معاشی اور ذہنی اعتبار سے مغرب کا حلقہ بگوش (۱) ہو رہا تھا۔ ایشیاء اور افریقہ کے بیشتر ممالک بالخصوص مسلم ممالک، یورپی اقوام کی ہوس ملک گیری (۲) کا نشانہ بن رہے تھے۔ یہ سب حالات و واقعات اقبال جیسے ذہین اور حساس انسان کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم ان کی شاعری کے ارتقائی مدارج (۳) کا مرحلہ وار جائزہ لیں تو ہمیں ان کے اشعار کے آئینے میں ان سب واقعات کا عکس بہت واضح اور صاف نظر آتا ہے۔

"شکوہ" اقبال کی شاعری کے تیسرے دور کی نظم ہے۔ یہ دور ہندوستان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں، اسلامی دنیا کے روز بروز بگڑتے ہوئے حالات اور یورپی اقوام کے مسلم ممالک پر غاصبانہ (۴) قبضے کی وجہ سے اہم ہے۔ اقبال کے فکری ارتقاء کے سلسلے میں بھی اس دور کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اسی زمانے میں انہوں نے وطن پرستی کی بجائے ملت پرستی اور وطنی شاعری کی بجائے ملی شاعری کو اپنا مطمع نظر بنایا۔

اقبال تعلیم کے سلسلے میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ میں رہے۔ اس عرصہ میں انہوں علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ یورپی اقوام کی زندگی کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی پہلوؤں کا بغور جائزہ لیا انہوں نے ایک طرف مغربی اقوام کو سائنسی ایجادات کے بل بوتے پر زندگی کے ہر میدان میں ترقی کرتے دیکھا اور دوسری طرف مشرق کی کمزور اقوام کے وسائل کو اپنے قبضے میں کرنے کے لئے انہیں ایک ایک کر کے اپنے شکنجے میں کستے دیکھا اقبال کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ یورپی اقوام کے جارحانہ (۵) وطن پرستی کے نظریے کا شکار مسلمان ممالک بن رہے ہیں۔ اس کے پس پشت (۶) صلیبی جنگوں کا انتقام لینے کا جذبہ بھی موجود تھا اور مسلم ممالک کے معاشی وسائل کو اپنی مٹھی میں لینے کی خواہش بھی تھی چنانچہ انہوں نے موقع محل دیکھ کر اپنے پاؤں ہاتھ پھیلائے اور ایک ایک کر کے ان ممالک پر اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کر دی۔

---

(۱) غلام (۲) ملکوں پر قبضہ کرنا (۳) ترقی کے درجے یا مرحلے (۴) ناجائز (۵) زبردست (۶) پیچھے

دراصل پچھلی کئی صدیوں سے عالمِ اسلام کے حالات تسلی بخش نہیں تھے۔ سیاسی اقتدار حاصل ہونے کے باوجود ان میں بے حسی، بے عملی، پسماندگی اور جہالت جیسی خرابیوں نے جڑ پکڑ لی تھی۔ ان کی آپس کی سر پھٹول، باہمی رقابتیں، ایک دوسرے کیخلاف سازشیں یقیناً ایسے عوامل تھے جنھوں نے اہلِ فرنگ کی ہوسِ ملک گیری کو ہوا دی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے کمزور ممالک ایک ایک کر کے ان کے قبضے میں آتے چلے گئے۔ مصر، سوڈان، الجزائر، لیبیا، مراکش، تیونس، عرب، عراق، شام اور ہندوغیرہ اسلامی ممالک
کو انہوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اپنا غلام بنالیا۔ ان علاقوں میں اگر کہیں اہلِ فرنگ کے خلاف بغاوت ہوئی تو انہوں نے اسے بڑی سختی سے کچل ڈالا چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر عرب و عجم کے ایسے تمام ممالک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے جہاں مسلم آبادی کی اکثریت تھی۔

اقبال جب یورپ سے وطن واپس آئے تو ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۹ء تک کے زمانے میں بالخصوص مسلمانوں نے محسوس کیا کہ وہ ہندوؤں سے معاشی اور معاشرتی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں چنانچہ انہوں نے جماعتی حیثیت سے اپنے مذہبی، تمدنی اور معاشی حقوق کے حصول کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی یوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونے لگے۔

اقبال نے پہلے پہل چاہا کہ ان دونوں قوموں کے درمیان اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا ہو جائے اور وہ مل جل کر اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔ ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے ہی انہوں نے ''صدائے درد'' ''نیا شوالہ'' ''ترانہ ہندی'' اور ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' جیسی نظمیں لکھیں لیکن انہوں نے دیکھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات اتنے گہرے ہیں کہ اب ان دونوں قوموں کو کسی ایک تصورِ حیات پر اکٹھا کرنا مشکل ہے۔ دونوں کے معاشی مفادات ایک دوسرے سے اس قدر متصادم (۱) تھے اور ان کے درمیان اتنا زیادہ مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی بعد (۲) موجود تھا کہ اقبال کا ''تسبیح کے ان دانوں کو ایک ہی لڑی میں پرونے کا خواب'' محض شاعرانہ خیال بن کر رہ گیا۔

---

(۱) ٹکرانے والے (۲) دوری

اقبال نے بجا طور پر محسوس کیا کہ صرف ان کی اپنی قوم ہی ان کے پیغام کو سمجھنے کی اہل ہے اور وہی اس کی سب سے زیادہ ضرور تمند بھی ہے گو ہندوستان کے مسلمان اپنے جداگانہ سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے بیدار ہو رہے تھے لیکن ان میں اس اجتماعی اتحاد کی کمی تھی جس سے ان کی حریف (۱) ہندو قوم بہرہ ور تھی جہاں وہ معاشی طور پر پس ماندہ اور مذہبی اعتبار سے انتشار کا شکار تھے وہیں معاشرتی سطح پر فرقہ بندی، ذات برادری اور طبقاتی اونچ نیچ نے ان کے اتحاد کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ اقبال کو عام مسلمانوں کی بے حسی، بے بسی اور غلامانہ ذہنیت کا بھی شدت سے احساس تھا لیکن وہ حالات سے مایوس نہیں ہوئے۔ اقبال نے سوچا کہ مسلمان قوم کو بیدار کرنے کے لئے کیوں نہ اسے اس کے ماضی کی روشن تصویریں دکھائی جائیں تا کہ اس میں جدو جہد اور حرکت کرنے کا شوق پیدا ہو۔ ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' اس قسم کے خیالات سے معمور (۲) ہیں ان نظموں میں ایک مشعل بردار بن کر قوم کی اندھیری رات کو منور کرتے نظر آتے ہیں اور اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں یاس و ناامیدی کی بجائے امید کی شمعیں روشن کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

''شکوہ'' کی خوبی یہ ہے کہ یہ ''بیک وقت شکوہ بھی ہے۔ عرض حال بھی اور مسلمانوں کے دعوت عمل بھی''۔

---

(۱) مخالفت (۲) بھری ہوئی

۲۔ نظم کا تعارف

''شکوہ'' اپریل ۱۹۱۱ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے چھبیسویں سالانہ جلسے میں پڑھی گئی جو ریواز ہوسٹل کے صحن میں منعقد ہوا تھا۔ سر عبدالقادر اس جلسے میں شریک تھے اور انھوں نے اقبال کو یہ نظم پڑھتے ہوئے دیکھا تھا وہ کہتے ہیں کہ انجمن کا اجلاس جس میں اقبال نے اپنی مشہور نظم ''شکوہ'' اپنے خاص انداز میں پڑھی۔ بہت لوگوں کو یاد ہوگا کہ جب کیف (۱) غم کا سماں جلسے پر چھا گیا تھا ان کے بہت سے مداح (۲) پھولوں سے جھولیاں بھر کر لائے تھے اور جب وہ پڑھ رہے تھے تو ان پر پھول برسا رہے تھے۔ اس وقت کی ایک اور خاص بات خاص طور پر قابل دید تھی کہ اقبال کا معمر (۳) باپ اس کے سننے والوں میں موجود تھا۔ باپ کی آنکھوں میں بیٹے کی کامیابی دیکھ کر خوشی کے آنسو تھے مگر لبوں پر تاثیر کلام سے وہی علامات غم تھیں جو بیٹے کے چہرے پر تھیں۔

یہ نظم ۱۹۱۱ء میں ہی پہلے ''پنجاب ریویو'' پھر سر عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' اور پھر ''تمدن'' دہلی میں شائع ہوئی۔ ''شکوہ'' اقبال کی واحد نظم ہے جس نے اپنے عہد کی اردو شاعری کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ شاعروں نے اس کے تخیل، زبان، اسلوب اور تکنیک کی بے جا تقلید کی۔

اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک وسیع تناظر میں قوموں کے عروج کے اسباب گنوانے کے بعد اسلامی دنیا کے زوال کی داستان بیان کرتی ہے۔ شاعر نے نظم کا عنوان ''شکوہ'' بھی سوچ سمجھ کر رکھا ہے بظاہر وہ اپنی قوم کے زوال کی شکایت کرتا ہے خدا سے لیکن درحقیقت وہ اپنی قوم سے ہی مخاطب ہے جس کی اصلاح مقصود ہے۔

---

(۱) کیفیت (۲) تعریف کرنے والے (۳) عمر رسیدہ، بوڑھا

۲.۱۔ نظم کا مرکزی خیال

''شکوہ'' کا مرکزی خیال اس ذہنیت کا پردہ چاک کرتا ہے جو یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں مشترک ہے اور جس کے مطابق یہ تینوں قومیں سمجھتی ہیں کہ وہ خدا کی محبوب اقوام ہیں اس لئے دنیا کی تمام نعمتوں پر ان کا فطری حق ہے چاہے اُن کے اعمال کیسے ہی کیوں نہ ہوں؟ اقبال اس نظم میں خاص طور پر مسلمانوں کے ذہن کی غمازی (۱) کرتے ہیں اور ایک عام مسلمان کی حیثیت سے اپنے خالق سے شکوہ سنج (۲) ہیں کہ توحید اور رسالت پر ایمان رکھنے والی تو اُمتِ مسلمہ ہے لیکن خدا کی رحمتوں کے دروازے ملحد (۳) ومشرک اور مغرور اقوام پر کھلے ہوئے ہیں۔ خدا کے نام لیوا تو غربت کے صدمے سہہ رہے ہیں لیکن اس کے منکرین دنیا کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ مسلمانوں کو پستی میں مبتلا دیکھ کر خدا نے ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لی ہیں اور انہیں اپنے لطف وکرم اور عنایات ومدارات (۴) سے محروم کردیا ہے۔

۲.۲۔ نظم کا تجزیہ

شکوہ کے کل ۳۱ بند ہیں لیکن پوری نظم کو فکری اعتبار سے بآسانی پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا حصہ: ابتدائی دو بندوں پر مشتمل ہے اور اس میں شاعر شکوہ کرنے کیلیے صرف تمہید باندھتا ہے۔

دوسرا حصہ: نظم کے تیسرے بند سے شروع ہوکر تیرھویں بند پر ختم ہوتا ہے۔ اس حصے میں شاعر پہلے تو دنیا کی بیشتر اقوام کے ایام جاہلیت کا ذکر کرتا ہے اور پھر مسلمانوں کے جنگی کارناموں کی تفصیل بیان کرتا ہے وہ بتاتا ہے کہ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے دنیا میں عدل ومساوات، حریت وحق گوئی اور عبادت وتقویٰ کی زندہ تصویر بن کر دکھایا۔ انہوں نے ہی عشق الٰہی میں سرشار ہوکر خدا کے پیغام کو ساری دنیا میں پھیلایا۔

---

(۱) یعنی ظاہر کرتے ہیں (۲) شکوہ کرنیوالا (۳) بے دین (۴) خاطرداری

تیسرا حصہ: چودھویں بند سے شروع ہوتا ہے اور چوبیسویں بند پر ختم ہوتا ہے۔ اس حصے میں شاعر نے خدا کی رحمت سے محروم مسلمان قوم کا موازنہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اقوام سے کیا ہے اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ توحید و رسالت کے علمبرداروں سے خدا ناراض دکھائی دیتا ہے اور ملحد و مشرک اور کاہل و غافل اقوام پر مہربان ہے اسی لئے اس نے انہیں دنیا جہان کی ہر نعمت عطا کر رکھی ہے۔

چوتھا حصہ: پچیسویں بند سے شروع ہو کر ستائیسویں بند پر ختم ہوتا ہے۔ اس مختصر حصے میں اقبال نے اپنے ہم وطنوں کی بے حسی، بے عملی اور انتشار و نفاق (۱) کی طرف اشارہ کیا ہے اور خدا سے اپنی قوم کی مشکلیں حل کرنے کی دعا کی ہے۔

پانچواں حصہ: اٹھائیسویں بند سے شروع ہو کر اکتیسویں بند پر ختم ہوتا ہے۔ اس آخری حصے میں شاعر نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اپنے اشعار سے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا عہد کریں۔

اقبال نے پانچوں حصوں کو اس خوبصورتی سے نظم میں جوڑا ہے کہ "شکوہ" جمالیاتی اعتبار سے ایک دلآویز (۲) شعری تخلیق بن گئی ہے۔ اسلامی تاریخ، تہذیب، مذہب اور عمرانیات کے سبھی پہلو گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ شاعر نے مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی تاریخ کا اس قدر مؤثر لہجے میں ذکر کیا ہے اور خدا تعالیٰ کی عنایات پر اپنی قوم کا حق اتنے مدلل (۳) طریقے سے ثابت کیا ہے کہ نظم سننے والا کوئی شخص بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نظم "شکوہ" جوشِ بیاں، زورِ خطابت، سلاست و روانی، رمز و ایماء ایجاز و اختصار اور ندرت ادا (۴) کی وجہ سے فن کا ایک عمدہ نمونہ بن گئی ہے۔

---

(۱) نااتفاقی (۲) دلکش (۳) دلیل کے ساتھ (۴) اچھوتا پن

۲.۳۔تشریحات (شکوہ کے منتخب بندوں کی تشریح)

عزیز طلبہ و طالبات! نظم پر اس مختصر بحث کے بعد، آیئے اب اصل اشعار کی طرف رجوع کریں۔ یہ نظم جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ۳۱ بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند میں تین تین اشعار (یعنی چھ چھ مصرعے) ہیں۔ نظم کی یہ ہیئت (Form) مسدس کہلاتی ہے جو اردو شاعری میں عموماً مرثیہ کی صنف میں استعمال ہوتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو شکوہ بھی ایک لحاظ سے مرثیہ ہی ہے گو یہ کسی شخص کا نہیں بلکہ امتِ مرحومہ کا مرثیہ ہے۔ حالی کا مسدس بھی اس اسلوب میں ہے گو اس کا وزن دوسرا ہے۔

اب ہم نظم کا ایک ایک بند درج کریں گے اس کے مشکل الفاظ کے معانی بتائیں گے اور پھر بند کی تشریح کریں گے تا کہ اقبال کے خیالات کھل کر سامنے آسکیں۔

پہلا بند:۔

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں محوِ غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں؟
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے، خاکم بدہن، ہے مجھ کو

معانی:

زیاں کار: اپنا نقصان آپ کرنے والا۔ سود فراموش: وہ شخص جو اپنے فائدے سے غافل ہو۔ فکر فردا: آئندہ زمانے کی فکر۔ محوِ غم دوش: کل کے یعنی پچھلے غم میں مشغول۔ ہمنوا: ساتھ گانے والا۔ یہاں مراد ہے دوست۔

جرأت آموز: حوصلہ بڑھانے والی۔ تابِ سخن: شاعری کی لیاقت یا بات کہنے کی صلاحیت۔ خاکم بدہن: میرے منہ میں خاک، مراد ہے کہ میں اپنی گستاخی کا اعتراف کرتا ہوں۔ جملہ ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے جب کسی واجب الاحترام ہستی کے سامنے کوئی ایسی بات کہی جائے جو بے ادبی کے دائرے میں آتی ہے۔

تشریح:

''شکوہ'' کے پہلے بند کا آغاز بڑی خوبصورت تمہید سے ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اپنا نقصان کیوں کروں او رکس وجہ سے اپنے فائدے کو بھلا ڈالوں؟ میں آئندہ زمانے کی فکر کیوں نہ کروں اور گزشتہ کے غم میں کیوں ڈوبا رہوں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ میں بلبل کے نالے بھی سنوں اور سر سے پاؤں تک کان بنا رہوں؟ اے میرے دوست کیا میں بھی کوئی پھول ہوں کہ بلبل کی آہیں سننے کے باوجود چپ بیٹھا رہوں؟ میری بات او رشعر کہنے کی صلاحیت، مجھے حوصلہ دلا رہی ہے اور مجھے اپنے دل کی بات کہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ (میرے منہ میں خاک) مجھے اپنے اللہ سے شکایت کرنی ہے۔

زیادہ آسان لفظوں میں شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ میں کب تک اپنی قوم کی بربادی پر خاموش تماشائی بنا رہوں اور اس کے مستقبل کی فکر کیوں نہ کروں۔ جب مجھے خدا نے قوتِ گویائی عطا کی ہے تو پھر اپنے رب کو اپنے دل کی بات کیوں نہ سناؤں، چاہے وہ اس کے خلاف شکایتوں سے بھری ہوئی ہو۔

دوسرا بند:۔

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا! شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

معانی:

شیوۂ تسلیم: فرمانبرداری کی عادت۔ معمور: بھرا ہوا، نالہ: آہ وزاری، فریاد۔ شکوہ ارباب وفا: فرمانبردار لوگوں کی شکایت، خوگر حمد: خدا کی تعریف کرنے کا عادی شخص۔

تشریح:

درست ہے کہ ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے ہیں اور یہ ہمارا خاص شیوہ رہا ہے لیکن اب ہمارے دل میں کچھ ایسا درد اٹھ رہا ہے کہ ہم ضبط سے کام نہیں لے سکتے۔ اے خدا! ہم تجھے اپنی دکھ بھری داستان سنانا چاہتے ہیں۔ بے شک ہماری حالت اس خاموش ساز کی طرح ہے جو فریاد سے بھرا ہو تا ہم ضبط سے کام لے رہا ہو لیکن جب آہ وزاری ہونٹوں تک آ پہنچے تو پھر خاموش رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اے اللہ! ہم تیرے اطاعت گزار بندے ہیں اور ہمیشہ تیری تعریف کرتے رہے ہیں لیکن آج ہماری شکایت بھی سن لے۔ ہمارا گلہ بھی تجھی سے ہے اور تجھی سے اس کا جواب بھی چاہتے ہیں۔

تیسرا بند:۔

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم

پھول تھا زیبِ چمن، پر نہ پریشان تھی شمیم

شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطاف عمیم

بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیت خاطر یہ پریشانی تھی

ورنہ امت، تیرے محبوب کی دیوانی تھی؟

معانی:

ازل: ابتداء (ہر چیز کی ابتداء) ذاتِ قدیم: وہ ذات جس کی ابتداء نہ ہو۔ یہاں مراد ہے اللہ تعالیٰ جو سب سے پہلے تھا اور ہمیشہ رہے گا، زیبِ چمن: باغ کی زینت، یعنی باغ میں موجود۔ شمیم: خوشبو۔ صاحب الطاف عمیم: وہ خدا، جس کی مہربانی عام ہو۔ عام لطف و عنایت کا مالک، بوئے گل: پھول کی خوشبو۔ نسیم: ہوا، جمعیت: خاطر دل کی تسکین، ترا محبوب: حضور اکرم حضرت محمدؐ، امت تیرے محبوب کی: مسلمان قوم

تشریح:

اے خدا! یہ سچ ہے کہ تیری ذاتِ قدیم ازل سے ہی موجود تھی یعنی ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب تو تو موجود تھا لیکن تری صفات ابھی ظاہر نہیں ہوئی تھیں۔ پھول تو باغ میں موجود تھا لیکن اس کی خوشبو نہیں پھیلی تھی۔ یعنی خدا کی ذات کائنات کی پیدائش سے پہلے بھی موجود تھی اور اس کی تخلیق کے بعد بھی موجود رہی لیکن اسے پہچاننے والے پیدا نہیں ہوئے تھے اے سب پہ مہربانی کرنیوالے آقا تو ہی انصاف سے کہہ دے کہ اگر ہوا نہ ہو تو پھول کی خوشبو کیسے پھیل سکتی ہے؟ یہ کام ہم مسلمانوں نے کیا کہ نہ صرف تجھے پہچانا بلکہ ہوا بن کر تیرے نام کی خوشبو کو ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ ہم دنیا میں توحید کا پیغام عام کرنے کے لئے نکل پڑے اور اس کام کی مشکلات کی پرواہ نہ کی بلکہ انہیں اپنے دل کی تسلی کا سامان بنالیا۔ ہم مسلمانوں نے دنیا والوں کو تیرے نام اور تیری صفات سے آگاہ کیا اور اس فرض کو عین راحت جان سمجھ کر نبھایا ورنہ تیرے محبوبؐ کی امت کوئی دیوانی تو نہیں تھی نہ اس نے بلاوجہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بنالیا دراصل اسلام کفر کی ضد ہے۔ اسی لئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اسلام لانے والوں کو کفار کی سختیاں سہنی پڑیں اور جب مسلمان توحید کا پیغام لیکر عرب سے باہر نکلے تو ایک دنیا کو اپنا مخالف پایا مگر مسلمانوں نے کسی سختی کی پرواہ نہ کی۔

چوتھا بند:۔

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر

کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر

مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟

قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

معانی: مسجود: جن کو سجدہ کیا جاتا تھا، معبود: جن کی عبادت کی جاتی تھی، خوگر: عادی، پیکر محسوس: مادی اور ٹھوس جسم۔ یہاں مراد ہے وہ چیزیں جنہیں خدا کے علاوہ انسان پوجتا تھا مثلاً چاند، ستارے، سانپ، بت وغیرہ، کیا کام تیرا: تیرے نام سے دنیا کو واقف کیا۔

تشریح: اے خدا۔ مسلمانوں کے دنیا میں آنے سے پہلے تیری دنیا کا رنگ ڈھنگ بڑا عجیب تھا۔ کہیں لوگ پتھر سے تراشے ہوئے بتوں کو سجدہ کرتے تھے اور کہیں درختوں کو خدا سمجھ کر پوجا کرتے تھے انسان کی نظر، ٹھوس مادی اجسام کی پرستش کی عادی ہو چکی تھی۔ ان حالات میں کوئی ایسے خدا کو کیسے مان لیتا جو نظر نہیں آسکتا تھا۔ تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ دنیا میں کوئی تیرا نام لیوا نہ تھا۔ یہ مسلمان ہی تھے جن کے بازوؤں کی قوت نے تیرا نام زمین کے ہر کونے تک پہنچایا۔ گویا شاعر یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ جس وقت ساری دنیا ان دیکھے خدا سے ناواقف تھی اور شرک و بے دینی کے اندھیرے میں بھٹک رہی تھی۔ اسوقت مسلمانوں نے ہی خدا کو پہچانا اور عقیدۂ توحید کو جہاد(۱) فی سبیل اللہ کے ذریعے دوسری اقوام تک پہنچایا۔

---

(۱) کے راستے میں

چھٹا بند:۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں

خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں

دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں

کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی

کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

معانی: معرکہ آراء: میدان جنگ کو زینت دینے والا مرد مجاہد۔ کلیسا: گرجا۔ عیسائیوں کی عبادت گاہ۔ جہاں دار: بڑے بڑے بادشاہ۔ کلمہ: مسلمانوں کی دینی اصطلاح۔ مراد ہے کلمہ توحید و رسالت یعنی

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

اور کلمہ شہادت اشھد ان لا الہ اللہ و اشھدان محمداً عبدہ و رسولہ

تشریح: یہ مسلمان ہی تھے جو تیری خاطر میدانِ جنگ میں لڑتے رہے اور تیری عظمت کو دنیا میں بلند کرنے کے لئے سارے جہان سے لڑائی مول لی۔ وہ کبھی خشکیوں میں لڑتے تھے اور کبھی دریاؤں اور سمندروں میں۔ کبھی انہوں نے یورپ پہنچ کر وہاں کے گرجوں میں اذانیں دیں اور کبھی افریقہ کے گرم صحراؤں میں خدا کا نام بلند کیا۔ بڑے بڑے بادشاہ بھی اپنی شان و شوکت سے مسلمانوں کو مرعوب نہ کر سکے اور وہ تلواروں کے سائے تلے بھی کلمہ پڑھنے سے باز نہ آئے ہم مسلمانوں نے دنیا کے تمام بادشاہوں کا مقابلہ کیا، انہیں پچھاڑا اور انہیں زیر کر کے توحید و رسالت کا پرچم ہر جگہ لہرایا۔

ساتواں بند:

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے
قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی ؟

معانی:

جنگ: اللہ کے راستے میں جہاد۔ تیغ زنی: تلوار چلانا۔ لڑائی لڑنا، سر بکف: سر ہتھیلی پر رکھ کر۔ یعنی مرنے کے لئے تیار، دہر: زمانہ، دنیا، بت فروشی: بت بیچنا۔ ان کو توڑنے کی بجائے قیمت وصول کر لینا۔ بت شکنی: بتوں کو توڑنا۔ یہاں اشارہ ہے سلطان محمود غزنوی کی طرف جسے سومنات کے پجاریوں نے مال و زر دے کر اپنے بڑے بت کو توڑنے سے باز رکھنا چاہا لیکن اس نے جواب دیا کہ میں تاریخ میں بت فروش نہیں بت شکن مشہور ہونا چاہتا ہوں چنانچہ اس نے اپنا گرز اٹھا کر بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس معاملے میں اس نے سنتِ رسولؐ کی پیروی کی کیونکہ نبی اکرمؐ نے بھی فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا تھا۔

تشریح: ہم اگر زندہ رہتے تھے تو تیرے نام پر جہاد کرنے کے لئے اور جانیں قربان کرتے تھے تو تیری عظمت بلند کرنے کے لئے۔ ہم تلواریں اس لئے نہیں چلاتے تھے کہ دنیا پر اپنی حکومت قائم کریں اور نہ دنیا میں جان اس لئے ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے کہ ہمیں مال و دولت کی ہوس تھی۔ اگر ہماری قوم دنیا کے مال و دولت کی حریص ہوتی تو پھر بتوں کو نہ توڑتی بلکہ ان کی قیمت وصول کر لیتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے بت شکن ہونا پسند کیا لیکن بت فروش کہلانا گوارا نہ کیا حالانکہ سومنات کے پجاری اپنے بڑے بت کو بچانے کے لئے اپنی ساری دولت اسے دینے کے لئے تیار تھے۔

نواں اشعار۔

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا در خیبر کس نے

شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے

توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے

کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے

کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟

کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

معانی: خیبر: مدینے کے شمال مغرب کی طرف ایک بستی جہاں یہودی رہتے تھے اسے حضور اکرمؐ نے ۷ ہجری میں فتح کیا۔ درہ خیبر سے مراد قلعہ قموس کی فتح ہے جہاں یہودیوں کا پہلوان مرحب رہتا تھا۔ اس قلعے کو فتح کرنے کے لئے کئی بار کوشش کی گئی بالآخر حضرت علیؓ نے مرحب کو قتل کیا اور اس قلعہ کا دروازہ اکھاڑ کر پرے پھینک دیا یوں خیبر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ قیصر کا شہر: قسطنطنیہ جسے فتح کرنے کے لئے کئی حملے کئے گئے اور بالآخر ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے اسے فتح کیا۔ یہ شہر بازنطینی سلطنت کا دارالحکومت تھا اور ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ سر کرنا: فتح کرنا۔ مخلوق خداوند: خود اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے معبود یعنی بت۔ آتشکدہ: وہ جگہ جہاں پرستش کے لئے آگ جلائی جائے۔ ایران میں، اسلام کی آمد سے پہلے پارسی قوم رہتی تھی اور وہ آگ کو مقدس سمجھ کر اس کی پوجا کرتی تھی مگر بعد میں اکثر لوگ مسلمان ہو گئے۔ ان کی عبادت گاہوں میں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے جنہیں آتشکدے کہا جاتا۔ یزداں: خدا۔ آتش پرست: کائنات پر دو طاقتوں کی حکمرانی کا عقیدہ رکھتے تھے۔ نیکی کی قوت یعنی یزداں اور بدی کی قوت یعنی اہرمن۔ عرف عام میں یزداں سے مراد خدا تعالیٰ ہے۔ تذکرہ: ذکر۔

تشریح:

اے خدا! تو ہی بتا کہ خیبر کو کس نے فتح کیا اور اسکے مضبوط قلعہ قموص کا دروازہ کس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اکھاڑ ڈالا؟ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ تھے۔ تو ہی بتا کہ قیصر کے دارالحکومت قسطنطنیہ کو جو نا قابل تسخیر تصور کیا جاتا تھا، کس نے فتح کیا؟ تجھے خوب معلوم ہے کہ وہ عثمانی حکمران، سلطان محمد فاتح ہے۔ تو ہی بتا کہ انسانوں کے ہاتھ کے تراشے ہوئے بت کس نے توڑے اور شرک کا قلع قمع کس نے کیا؟ تو خوب جانتا ہے کہ وہ مسلمان ہی تھے۔ جنہوں نے تیرے حکم پر بت شکنی کا فریضہ انجام دیا۔ تو ہی بتا کہ میدان جنگ میں کس نے کفار کے لشکر کاٹ کر رکھ دیئے؟ تجھے معلوم ہے کہ وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے تیری رضا کی خاطر دنیا سے کفر کا نام تک مٹا دیا تو ہی بتا کہ کس نے ایران کے آتشکدوں کی آگ بجھائی اور دو خدا ماننے والے مشرکوں کو توحید کی راہ دکھائی؟ وہ کون تھے جنہوں نے جہالت کو ختم کر کے تیرا نام دوبارہ زندہ کیا اور لوگوں کی زبان پر تیرا ذکر پھر سے جاری کیا؟ تو جانتا ہے کہ وہ مسلمان ہی تھے۔

گیارھواں بند:

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

معانی:

قبلہ رو: خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے۔ زمین بوس: سجدہ کرنا۔ قومِ حجاز: مسلمان قوم۔ محمود: سلطان محمود غزنوی۔ ایاز: اس کا محبوب غلام، جو بہت وفادار تھا اور بعد میں لاہور کا گورنر بنا، یہاں محمود اور ایاز آقا اور غلام کی علامت ہیں۔ بندہ: ادنیٰ غلام۔ بندہ نواز: آقا۔ صاحب: مالک۔ محتاج: ضرورتمند۔ غنی: مالدار، سخی۔ تیری سرکار میں: تیرے روبرو، نماز کے لئے۔

تشریح:

اے خدا! تو جانتا ہے کہ مسلمانوں نے مساوات کا جو عملی نمونہ پیش کیا، اس کی کوئی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ عین حالت جنگ میں جب نماز کا وقت آجاتا تھا تو مسلمان قبلہ کی طرف منہ کر کے سجدے میں گر جاتے تھے۔ وہ تیری بارگاہ میں پہنچتے تھے تو پھر ان میں چھوٹے بڑے کا کوئی فرق نہیں رہتا تھا۔ بادشاہ اور فقیر، آقا اور غلام، ادنیٰ اور اعلیٰ ایک ہی صف میں کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور دنیاوی فرق مٹ جاتا تھا۔ خدا کے حضور سب اس عاجزی سے کھڑے ہوتے تھے کہ آقا اور غلام میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔

بارھواں بند:

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو، کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

معانی:

محفل کون ومکاں میں: دنیا کی محفل میں ۔ بھری دنیا میں، سحر و شام: صبح اور شام، ہر وقت ۔ مئے توحید توحید کی شراب، مراد ہے عقیدۂ توحید، صفت جام: شراب کے پیالے کی طرح ۔ کوہ: پہاڑ ۔ دشت: صحرا، جنگل ۔ بحرِ ظلمات: بحراوقیانوس ۔ یہ سمندر افریقہ، یورپ اور امریکہ تینوں براعظموں کے درمیان واقع ہے ۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دینے سے حضرت عقبہ بن نافع ؓ (جو حضرت عمرو بن العاص ؓ کے بھتیجے تھے) کے اس مشہور تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کے مطابق انہوں نے مراکش (مراقش) فتح کرنے کے بعد سمندر میں اپنا گھوڑا ڈالتے ہوئے بڑی حسرت سے کہا تھا کہ اے خدا! افسوس کہ تیری زمین ختم ہوگئی ورنہ میں اسی طرح یلغار کرتا چلا جاتا اور ہر جگہ تیرے دین کی روشنی پھیلا دیتا ۔

تشریح:

ہم دنیا کی اس بھری پُری محفل میں صبح و شام، ہر وقت پھرتے رہے ۔ ہاتھوں میں توحید کی شراب تھی اور ہم پیالے کی طرح ہمیشہ گردش میں رہے یعنی مشرق ہو یا مغرب، ہم نے ہر جگہ تیرے نام کا ڈنکا بجایا ۔ ہم نے راستے کی مشکلات کی پروا نہیں کی ۔ پہاڑ ہو یا صحرا، ہم نے ہر جگہ تیرا پیغام پہنچایا اور تو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم کبھی ناکام واپس نہیں لوٹے ۔ صحرا تو صحرا رہے ہم نے دریاؤں اور سمندروں کا سینہ چیر کر تیرا پیغام دنیا کے آخری کونوں تک پہنچایا ۔ بحرِ اوقیانوس کی کوہ پیکر موجیں بھی ہمارے راستے میں حائل نہ ہوسکیں اور ہم نے سمندر پار کی سرزمین تک پہنچنے کے لئے اپنے گھوڑے سمندر میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا ۔ اس کی ایک تاریخی مثال حضرت عقبہ بن نافع کی صورت میں موجود ہے جنہوں نے مراکش فتح کرنے کے بعد حالت جوش میں اپنا گھوڑا بحرِ ظلمات میں ڈال دیا تھا ۔

چودھواں بند:

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مست مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

معانی:

امتیں: قومیں، عجز والے: عاجزی ظاہر کرنے والے۔ انکسار کرنیوالے، مست مئے پندار: غرور کی شراب میں مست۔ مغرور، کاہل: سست۔ غافل: بے عمل۔ ہشیار: چالاک اور باعمل۔ کاشانہ: محل۔ رنگینیوں کا گھر۔ برق گرنا: مصیبت آنا۔

تشریح:

دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ اور بھی قومیں موجود ہیں۔ ان میں گنہگار لوگ بھی ہیں۔ عاجزی سے کام لینے والے بھی ہیں، غرور کے نشے میں بدمست بھی ہیں۔ یہاں سست، بے عمل اور چالاک بھی ہیں اور بہت سے لوگ تیرے منکر بھی ہیں۔ اس کے باوجود تیری رحمت ان کے محلوں پر برستی ہے اور بے چارے مسلمان تیری نگاہ سے ہمیشہ محروم رہتے ہیں اور سارے جہاں کی مصیبتیں اگر کسی کیلئے ہیں تو وہ صرف مسلمان ہیں۔

پندرھواں بند:

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں کہ مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

معانی:

بت: یہاں مراد ہے بت پرست۔ کافر، صنم خانہ: بت خانہ۔ مندر، مسلمان گئے: مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، نگہبان: رکھوالا۔ محافظ، منزل دہر: زمانے کی منزل۔ دنیا کی منزل، حدی خوان: حدی وہ نغمہ ہے جسے سن کر اونٹ خوش ہوتا ہے اور اپنی رفتار تیز کر دیتا ہے حدی خوان سے مراد عرب ہیں، بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے: یعنی ان کے ساتھ قرآن کی تعلیم بھی ختم ہوگئی۔ خندہ زن: ہنسی اڑانے والے، توحید: خدا کے ایک ہونے کا عقیدہ، پاس: خیال۔

تشریح:

اے خدا! اب تو مندروں میں بت بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹ گئے جو صحیح معنوں میں اسلام کے پیروکار تھے وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر خوشی سے بغلیں بجا رہے ہیں کہ کعبے کے محافظ چلے گئے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا سے وہ لوگ اٹھ گئے جو اونٹوں پر بیٹھ کر حدی گایا کرتے تھے۔ جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو قرآن کی تعلیم بھی ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔ کافر اس صورتحال کو دیکھ کر مسلمانوں کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ اے خدا! تجھے اپنی توحید کی بقا کا بھی کچھ خیال ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا میں تیرا نام لیوا ہی کوئی نہ رہے۔

سولھواں بند:

یہ شکایت نہیں ، ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلمان کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں ، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

معانی:

معمور: بھرے ہوئے، قصور: محلات، حور وقصور: بہشت کی خاص نعمتیں ہیں یعنی خوبصورت عورتیں اور عالی شان محلات جو جنتیوں کو ملیں گے یہاں شاعر کا اشارہ دولت اور عیش کے سامانوں کی طرف ہے جو غیر مسلموں کو میسر ہیں۔ الطاف: مہربانی، لطف کی جمع، مدارات: خاطر۔ تواضع۔

تشریح:

اے خدا! ہمیں یہ گلہ نہیں کہ جن لوگوں کو محفل میں بات کرنے کی تمیز بھی نہیں، ان کے خزانے مال و دولت سے بھرے ہوئے ہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ کافروں کو دولت اور عیش کے سارے سامان میسر ہیں انہیں خوبصورت بیویاں ملی ہوئی ہیں اور رہنے کے لئے عالی شان محلات موجود ہیں اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کو جنت میں حوریں ملنے کے وعدہ پر ٹرخایا جا رہا ہے۔ اے خدا! اب ہم پہ وہ پہلی سی مہربانیاں اور کرم فرمائیاں کیوں نہیں ہوتیں اور اب ہمیں ان نعمتوں سے کیوں محروم کر دیا گیا ہے جو پہلے تو ہمیں فراوانی سے عطا کیا کرتا تھا۔

سترھواں بند:

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہرو دشت ہو سیلی زدہ موجِ سراب
طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

معانی:

نایاب: نہ ملنا غائب ہونا، حباب: پانی کا بلبلہ، اٹھے سینہ صحرا سے حباب: ریگستان میں پانی کا چشمہ پھوٹ نکلے، رہرو دشت: صحرا کا مسافر، سیلی زدہ: جسے تھپڑ مارا جائے، سراب: پانی کا دھوکہ ہونا، طعن اغیار: غیروں کے طعنے، رسوائی: ذلت اور بدنامی، ناداری: غربت، خواری: ذلت

تشریح:

اے خدا! آج دنیا میں مسلمان دولت سے کیوں محروم نظر آتے ہیں؟ نہ ان کے پاس حکومت ہے نہ روپیہ حالانکہ تیری قدرت بے حد وحساب ہے اگر تیری مرضی ہو تو ریگستانوں میں بھی چشمے پھوٹ نکلیں اور جہاں کوسوں تک پانی کا نام ونشان نہ ہو وہاں سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگے اور اس کی سطح پر بلبلے تیرنے لگیں۔ صحرا میں جہاں پانی کی ایک بوند تک دکھائی نہ دیتی ہو وہ چاہے تو وہاں موجیں اٹھنے لگیں اور مسافر ان کے تھپیڑوں کا نشانہ بن جائیں۔ جب تیری قدرت سے یہ سب کچھ ممکن ہے تو پھر مسلمانوں کے حق میں ایسے کرشمے کیوں نمودار نہیں ہوتے؟ بیچارے مسلمانوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ اب غیر انہیں طعنے دیتے ہیں۔ بدنامی اور غربت نے انہیں دنیا کی دوسری قوموں کی نظروں سے گرا دیا ہے۔ اے خدا، کیا جو لوگ تیرے نام پر جان دینے پر آمادہ ہوں۔ ان کی قربانی کا بدلہ ذلت وخواری کی شکل میں ملنا چاہیئے؟

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلا لے بھی گئے
آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق، گئے وعدہ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

معانی:

تیری محفل: نیک اور پاکباز لوگوں کی محفل۔ جہاں اے خدا تیرا ذکر ہوتا تھا۔ چاہنے والے: خدا کو پوجنے والے انسان، شب کی آہیں: پاکباز لوگوں کا رات کو اٹھ کر خدا کو یاد کرنا اور اس کے فراق میں آہ وزاری کرنا۔ دل تجھے دے بھی گئے: انہوں نے تیرے حکم کے آگے سر جھکا دیا اور اپنے دل کو تیری یاد کے لئے وقف رکھا۔ اپنا صلہ لے بھی گئے: زندہ جاوید ہو گئے، جنت میں پہنچ گئے۔ وعدہ فردا: آئندہ کل یا قیامت کا وعدہ۔ چراغ رخ زیبا: خوبصورت چہرے کا چراغ، بہت کوشش کر کے تلاش کرنا۔

تشریح:

اے خدا، یوں لگتا ہے کہ خدا پرستوں کی محفل ختم ہو چکی ہے اور تجھے چاہنے والے پاکباز لوگ اب دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ وہی لوگ جو تیری محبت میں رات بھر جاگ کر عبادت کرتے تھے تجھے یاد کر کے روتے تھے آہیں بھرتے تھے اور صبح اٹھ کر تجھے یاد کرتے تھے وہ سب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اب نہ وہ شب کی آہیں ہیں اور نہ صبح کے نالے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ چیزیں انہیں کے ساتھ ختم ہو گئی ہیں۔ وہ لوگ اچھے رہے کیونکہ انہوں نے تیری اطاعت میں سر جھکا دیا اور اپنے دل کو تیری محبت سے آباد رکھا انہیں ان کی عبادت کا بدلہ مل گیا اور وہ زندہ جاوید ہو گئے۔ دنیا میں ان لوگوں کے قیام کی مدت بہت تھوڑی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہاں آ کے ابھی اطمینان سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ انہیں رخصت ہونے کا حکم مل گیا۔ وہ تیرے سچے عاشق تھے اور آنے والی کل میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے دنیا سے چلے گئے۔ اب قیامت سے پہلے دوبارہ تیری ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اے خدا اب اگر ان جیسے خدا پرستوں کو تو اپنے خوبصورت چہرے کا چراغ لے کر بھی ڈھونڈے تو وہ تجھے نہیں مل سکیں گے۔ شاعر یہاں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا حوالہ دے رہا ہے جو زہد و پاکبازی میں اپنی مثال آپ تھے۔

اکبر الٰہ آبادی:۔

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا ؟
بت گری پیشہ کیا ؟ بت شکنی کو چھوڑا ؟
عشق کو ، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا ؟
رسمِ سلمانؓ واویسِ قرنیؓ کو چھوڑا ؟
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشیؓ رکھتے ہیں

معانی:

بت گری: بت بنانا۔ بت شکنی: بت توڑنا۔ آشفتہ سری: دیوانگی۔ رسم سلمان: حضرت سلیمان فارسی کا حضورؐ سے بے مثال عشق۔ وہ ایران کے باشندے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کے اصحاب میں شامل ہوئے اور اپنے صدق کی وجہ سے مشہور تھے۔ غزوۂ خندق میں مدینہ کے گرد انہیں کے مشورے سے خندق کھودی گئی تھی اویس قرنیؓ: وہ تابعین میں سے تھے۔ حضورؐ نے ان کے احسان کی تعریف کی ہے۔ انہیں رسول پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود وہ حضورؐ کے غائبانہ عاشق تھے اور غائبانہ ہی اسلام قبول کیا۔ وہ اہل یمن میں سے۔ تھے اور زہد و عبادت کے بے مثال پیکر تھے انہیں تابعین میں سب سے بہتر قرار دیا جاتا ہے، اسی لئے ان کا لقب ''سید التابعین'' ہے۔ تکبیر: اللہ اکبر، خدا سب سے بڑا ہے۔ بلال حبشیؓ: ملک حبشہ سے تعلق رکھنے والے غلام اور حضورؐ کے مؤذن۔ انہیں حضورؐ سے بہت محبت تھی جب پہلے پہل حالتِ غلامی میں اسلام لائے تو ان کا آقا ان پر بے حد ظلم و ستم ڈھاتا تھا۔ انہیں سخت گرمی میں ریت پر لٹایا جاتا لیکن وہ احد، احد پکارتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رقم دیکر انہیں آزاد کرایا۔ ان کی وفات پر حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی نے فرمایا'' آج ہمارا آقا دنیا سے گزر گیا''۔

تشریح

اے خدا! تو ہی بتا کہ ہم سے کیا ہوئی ہے خطا؟ کیا ہم نے تجھے بھلا دیا ہے یا تیرے رسول کا دامنِ رحمت چھوڑ دیا ہے؟ کیا ہم نے بت تراشنے کا پیشہ اختیار کرلیا ہے یا بتوں کو توڑنا ترک کردیا ہے؟ کیا ہمارے دل تیری محبت سے خالی ہوگئے ہیں یا ہمارے عشق کی دیوانگی میں کوئی فرق آگیا ہے؟ کیا ہم نے حضرت سلیمان فارسیؓ کی سچائی کی اور حضرت اویس قرنیؓ کے احسان کی تقلید ترک کردی ہے؟ نہیں! ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی ہم نے تجھ سے اور تیرے رسولؐ سے جو پیمانِ وفا باندھا تھا، اُسے آخر تک نبھایا۔ ہم دنیا میں بت فروش اور بت گر نہیں بلکہ بت شکن مشہور ہوئے۔ ہمارے عشق الٰہی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور ہم صدق سلمانیؓ اور احسانِ اویسؓ کے سچے پیروکار ثابت ہوئے۔ تو جانتا ہے کہ ہمارے سینوں میں اب بھی توحید کی آگ دبی ہوئی ہے اور ہم اسلام کی خاطر اب بھی حضرت بلالؓ کی طرح سختیاں سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

بائیسواں بند:

عشق کی خیر، وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل، صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے، کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں، تو بھی تو ہرجائی ہے

معانی:

جادہ پیمائی: راستے پر چلنا۔ تسلیم ورضا: اطاعت، خدا کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ مضطرب دل: بے چین دل۔ صفت قبلہ نما: قبلہ نما کی مانند، قبلہ نما وہ متحرک سوئی ہے جو مقناطیسی صلاحیت رکھتی ہے اور ہمیشہ شمالاً جنوباً رہتی ہے اس سے سمت کا تعین کیا جاتا ہے اسے قطب نما بھی کہتے ہیں۔ پابندی آئینِ وفا: وفا کے طور طریقوں کی پابندی، مراد ہے شریعت کی پابندی، شناسائی: واقفیت، دوستی۔ ہرجائی: بے وفا۔

تشریح:

اے خدا، ہم تیرے عشق میں اتنے پختہ نہیں ہیں، جتنے ہمارے بزرگ تھے۔ یہ بھی تسلیم کہ ہم تیری اطاعت پر اس طرح قائم نہ رہے، جیسا کہ ہمارا فرض تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ ہمارا دل تیرے لئے اتنا بے قرار نہیں جتنا بے چین قطب نما نظر آتا ہے اور اس بات سے بھی ہم انکار نہیں کرتے کہ ہم آئین وفا یعنی شریعت کی اسطرح پابندی نہیں کر سکے جیسی کہ ہمیں کرنی چاہئے تھی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تو ہماری طرف سے آنکھیں پھیر لے۔ یہ کیا ہوا کہ کبھی ہم سے دوستی کی جاتی ہے اور کبھی غیروں سے محبت کی پینگیں بڑھائی جاتی ہیں۔ ہے تو گستاخی کی بات لیکن کہے بغیر چارہ بھی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تو بھی بے وفائی کا ثبوت دے رہا ہے۔

پچیسواں بند:

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے
سنتے ہیں، جام بکف نغمہ کو کو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ہو بیٹھے
اپنے پروانوں کو ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

معانی:

بادہ کش: شرابی۔ غیر: پرائے، غیر مسلم۔ لب جو: ندی کے کنارے۔ جام بکف: ہاتھ میں شراب کا پیالہ لئے ہوئے۔ نغمہ کوکو: قمری یا کوئل کا گیت۔ ہنگامہ گلزار: باغ کا شور و غل۔ تیرے دیوانے: مراد مسلمان جو خدا کے عاشق ہیں۔ ہو: وہ، یعنی خداوندی ہو کے منتظر ہیں مطلب یہ ہے کہ مسلمان تائید ایزدی اور فضل ربی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ذوقِ خود افروزی: اپنے آپ کو جلانے اور چمکانے کا ذوق یعنی آتشِ عشق میں جلنے کی طاقت تا کہ وہ خود کو روشن کر سکیں۔ برقِ دیرینہ: پرانی بجلی، مراد ہے عشقِ الٰہی کی آگ جو ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ فرمان: حکم۔ جگر سوزی: کلیجہ جلانا۔

تشریح:

اے خدا، غیر مسلم تو ندی کے کنارے بیٹھے مزے سے شراب پی رہے ہیں اور قمری کے گیت سن رہے ہیں یعنی دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور ان کے مقابلے میں تیرے عشاق باغ کے ہنگاموں سے الگ تھلگ اس انتظار میں بیٹھے ہیں کوئی آئے اور نعرۂ ہُو بلند کر کے ان کے سینوں میں دبی ہوئی آگ بھڑکا دے یعنی وہ تائید ایزدی یا فضل ربی کے منتظر ہیں۔ اے خدا تیرے پروانے جلنے کیلئے تیار ہیں بس تو انہیں خود کو جلانے اور اپنے وجود سے روشنی پھیلانے کے قابل بنا دے۔ ان کے سینوں میں تیرے عشق کی پرانی آگ دبی پڑی ہے۔ بس اسے کریدنے کی ضرورت ہے تو عشق کی پرانی بجلی کو حکم دے کہ وہ ان کے کلیجوں میں آگ لگا دے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ اغیار تو عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں لیکن بیچارے مسلمان ان سے پرے ہٹ کر فاقہ کشی میں دن کاٹ رہے ہیں وہ اس وقت کے منتظر ہیں جب ان پر بھی تیری نگاہ کرم پڑے اور تو ان کے دلوں میں بھی اپنی محبت کی آگ روشن کرے تا کہ وہ بھی دنیا کی نعمتوں میں اپنا حصہ وصول کر سکیں۔

ستائیسواں بند:

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آسان کردے
مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیمان کردے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزان کردے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کردے
جوئے خوں می چکد از حسرت دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

معانی:

امت مرحوم: مسلمان قوم (جس پر خدا کی رحمت ہے) مور بے مایہ: کمزور چیونٹی۔ ہمدوش سلیمان: حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہم پایہ۔ جنس نایاب محبت: محبت کی جنس، جو آج کل نہیں ملتی۔ ارزاں: سستا۔ دیر نشین: بت خانے میں بیٹھے ہوئے مراد ہے ہندوؤں کے رسوم و رواج میں رنگے ہوئے اور عشق رسولؐ سے بیگانہ مسلمان،

:۔۔ ےخوں می چکد...... پورے فارسی شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل میں مدت سے جو حسرت بیٹھی ہوئی تھی، اس سے خون کی ندی بہہ نکلی ہے اور ہمارے سینے میں سینکڑوں نشتروں کے چبھنے کی وجہ سے نالہ وفریاد کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔

تشریح:

اے خدا، مسلمان قوم کی مصیبتیں دور کر دے۔ وہ ایک کمزور چیونٹی کی طرح حقیر اور بے سروسامان ہیں، تو رحمت سے انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا رتبہ، عزت اور شان وشوکت عطا کر دے یہاں سورہ نمل کی تلمیح ہے محبت کی قیمتی جنس جو اب دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اسے عام اور سستا کر دے، یعنی اس قوم کے دل میں عشق رسول کی آگ بھڑکا دے، ہندوستان میں صدیوں سے ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مسلمانوں میں بت پرستوں کی عادتیں راسخ ہو چکی ہیں اور یہ نام کے مسلمان بن کر رہ گئے ہیں تو انہیں پھر سے سچا مسلمان بنا دے۔ اے خدا، اب ہماری یہ حالت ہو چکی ہے کہ ہمارے دل حسرتوں کا مزار بن چکے ہیں اور مایوسی کی وجہ سے خون کی ندیاں پھوٹ نکلی ہیں۔ یعنی ہم سرتاپا حسرت بن چکے ہیں۔ ہمارے سینے میں ہماری ناتمام خواہشوں کے سینکڑوں خنجر چبھے ہوئے ہیں اور اب اس سے نالہ وفریاد کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔

اٹھائیسواں بند:

بوئے گل لے گئی بیرون چمن راز چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غماز چمن
عہدِ گل ختم ہوا ، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پرواز چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

معانی:

بوئے گل: پھول کی خوشبو۔ بیرون چمن: باغ کے باہر۔ رازِ چمن: باغ کا بھید۔ غماز: چغل خور۔ عہد گل: بہار کا موسم ۔ ٹوٹ گیا ساز چمن: چمن برباد ہو گیا۔ زمزمہ پرواز: گیت گانے والے بلبل: یہاں مراد اقبال ۔ محوِ ترنم: گانے میں مگن ۔ تلاطم: ہل چل طوفان۔

تشریح:

پھول کی خوشبو، خود باغ کا بھید، چمن سے باہر لے گئی۔ غضب تو یہ ہے کہ خود پھول ہی اپنے باغ کی چغلی کھانے لگے۔ بہار کا موسم ختم ہو گیا خزاں نے چمن میں ڈیرے ڈال دیئے اور چمن تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ ڈالیوں پر گیت گانے والے پرندے پرواز کر گئے ۔ ہاں البتہ ایک بلبل شاخ پر بیٹھی رہ گئی ہے، جواب تک گیت گانے میں مشغول ہے شائد اس لئے کہ اس کے سینے میں نغموں کا طوفان اٹھا ہوا ہے کہ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ مسلمانوں نے خود غیروں کو اپنی قوم کی کمزوریوں سے آگاہ کیا اور یوں وہ ان کے محکوم بن کے رہ گئے اب اگر چہ تمام سچے اور مخلص رہنما ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں، لیکن ابھی ایک شخص (خود شاعر) ایسا موجود ہے جس کے سینے میں قوم کا درد موجزن ہے

انتیسواں بند:

قمریاں شاخ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہن برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قید موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی !

معانی:

قمری: فاختہ۔ صنوبر: ایک قسم کا سرو کا درخت۔ جونہایت سیدھا قد رکھتا ہے قمری کو اس سے وہی نسبت ہے جو گل کو بلبل سے ہے۔ گریزاں ہونا: الگ ہو جانا، پریشان، بکھرنا۔ روش: کیاری، راستہ۔ پیرہن برگ: پتوں کا لباس۔ عریاں ہونا: ننگی ہونا۔ خالی ہونا۔ قید موسم: موسم کی پابندی۔

تشریح:

قمریاں، صنوبر کی شاخوں سے اڑ چکی ہیں اور پتوں کی پنکھڑیاں جھڑ جھڑ کر بکھر گئی ہیں باغ کی کیاریاں اجڑ چکی ہیں اور ڈالیاں، پتے جھڑ جانے کی وجہ سے ننگی ہو گئی ہیں۔ باغ پر خزاں چھا جانے کے باوجود بلبل کے گانے پر کوئی اثر نہیں پڑا وہ موسم کی تبدیلیوں کو خاطر میں نہیں لائی اور درد بھری آواز میں بدستور چلاتی رہی کاش کوئی اس کی فریاد پر کان دھرتا۔ شاعر نے ساری گفتگو رمز و کنایہ کے پردے میں کی ہے اور کہا ہے کہ رہنماؤں کی خود غرضی سے قوم برباد ہو گئی ہے۔ انہوں نے قوم کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور خود ذاتی مفادات کے حصول کے لئے حکومت کی خوشامد میں لگے ہوئے ہیں ان لیڈروں کی ضمیر فروشی اور ملت سے کنارہ کشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کا جوہر ضائع ہو گیا۔ وہ علوم و فنون سے بیگانہ ہو گئے اور اپنی بلند پایہ روایات اور اعلیٰ اقدار کھو بیٹھے۔ اب ان کا حال خزاں رسیدہ درخت کی ان ٹہنیوں جیسا ہے جو پتوں کے لباس تک سے محروم ہو چکی ہیں مسلمان غربت و افلاس اور تنگ دستی اور ناداری کا شکار ہو چکے ہیں لیکن ان تکلیف دہ حالات کے باوجود ایک شخص ایسا ہے جس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور وہ شاعر خود ہے وہ بدستور ملت کے غم میں آہ و زاری کرتا رہا اور بگڑے ہوئے حالات کے باوجود قوم کو خواب غفلت سے جاگنے اور زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کی تلقین کرتا رہا۔ کاش قوم اس کی آواز پر کان دھرتی اس کے پیغام کو سمجھتی اور اپنی بگڑی ہوئی تقدیر سنوار لیتی۔

تیئسواں بند:

لطف مرنے میں ہے باقی، نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

معانی:

خون جگر پینا: قوم کی حالت دیکھ کر غم محسوس کرنا۔ جوہر: آئینے کی چمک، کمالات

تشریح:

شاعر اپنی حالت زار بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اب نہ زندہ رہنے میں کوئی لطف باقی رہ گیا ہے اور نہ مرنے میں۔ اب تو قوم کے غم میں تڑپنے میں ہی لطف آتا ہے وہ کہتا ہے کہ میرے دل کے آئینے کی آب و تاب اپنی نمود کے لئے بیتاب ہے اور میرے سینے میں جلوے تڑپ رہے ہیں لیکن کیا کیا جائے؟ میرے ان دردمندانہ جذبات کو محسوس کرنے والے لوگ ہی اس قوم میں نظر نہیں آتے اور نہ لالہ کی پھولوں کی طرح قوم کے غم میں اپنا سینہ جلانے والے اشخاص کا ہی کوئی سراغ ملتا ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ پوری قوم بے حس اور مردہ ہو چکی ہے اسے نہ اپنے زوال کا احساس ہے اور نہ اس کے دل میں اپنے ہمدردوں کی کوئی قدر ہے لیکن قوم کی مردنی کے باوجود، اس کے غمخوار صلہ و ستائش سے بے نیاز ہو کر، اس کی بہتری کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور اس کی پستی پر کڑھتے رہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ قوم کو دوبارہ عظمت و سربلندی سے آشنا کرنے کے لئے اس کے سینے میں سینکڑوں جذبات مچلتے ہیں اور ہزاروں خیالات اس کے ذہن میں کروٹیں لیتے ہیں لیکن وہ اپنی تجاویز کن لوگوں کے سامنے رکھے؟ قوم تو اپنے بہی خواہوں کے دردمندانہ جذبات کو سمجھنے سے ہی قاصر ہے۔

اکتیسواں بند:

چاک اس بلبل تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہد وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادہ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری!

معانی:

چاک: ٹکڑے ٹکڑے ہونا۔ بلبل تنہا: اپنے جذبات و احساسات کے لحاظ سے خود کو تنہا محسوس کرنے والی بلبل۔ یہاں مراد ہے شاعر کی ذات۔ نوا: آواز، یہاں مراد شاعری۔ بانگ درا: اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز۔ اقبال کا اشارہ شکوہ کی طرف ہے۔ عہد وفا: وفادار رہنے کا نیا وعدہ۔ یہاں مراد ہے اسلام سے وابستہ رہنے کا وعدہ۔ بادۂ دیرینہ: پرانی شراب۔ مراد اسلامی تعلیمات۔ عجم: غیر عرب۔ عرب لوگ خود کو عرب یعنی فصیح اور زبان دان اور دوسری قوموں کو عجمی یعنی گونگے کہتے ہیں۔ خم: شراب کا مٹکا۔ حجازی: عرب سے تعلق رکھنے والی۔ حجازی مے سے مراد اسلامی تعلیمات ہیں۔ لے: سُر، لہجہ، دھن، یہاں مراد ہے خیالات۔

تشریح:

اے خدا، میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ اس اکیلی بلبل کے نغموں میں اتنی تاثیر پیدا کر دے کہ جو بھی انہیں سنے، اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے کاش! قافلے کی گھنٹیوں کی اس آواز سے سوئے ہوئے دل جاگ اٹھیں کاش! مسلمانوں کے دل، اسلام کے ساتھ وفاداری کا از سرِ نو اقرار کر کے پھر زندہ ہو جائیں کاش! وہ پھر پرانی شراب کے پیاسے بن جائیں۔ یعنی حضور اکرمؐ کی تعلیمات کی ضرورت محسوس کریں۔ بے شک میرا مٹکا عجمی ہے لیکن اس میں خالص اسلامی شراب بھری ہوئی ہے اور گو میرا نغمہ ہندی ہے لیکن اس کی سُر عربی ہے۔ یعنی

اگرچہ میں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اردو شاعری کا سہارا لیا ہے اور اسے موثر بنانے کے لئے ایرانی عجمی شاعری سے بھی فائدہ اٹھایا ہے لیکن میرے خیالات سراسر اسلامی تعلیمات پر مبنی ہیں۔

شاعر نے اس اختتامی بند میں خدا سے دعا کی ہے کہ وہ اس کے کلام میں ایسی تاثیر پیدا کر دے جو مسلمانوں کے دلوں میں ہل چل مچا دے تا کہ انہیں اپنی غفلت کا احساس ہو اور وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے پر شرمندہ ہوں۔ کاش وہ اپنی کھوئی ہوئی منزل کی تلاش میں نئے عزم کے ساتھ چل نکلیں اور یہ شاعری ان کے لئے بانگ درا کا کام دے۔ شاعر کہتا ہے کہ کاش! اسلام اور قرآن کی محبت ان کے دلوں میں دوبارہ جاگزیں ہو جائے اور وہ خدا سے ایک دفعہ پھر پیمانِ وفا باندھ کر دنیا میں کامیاب ہوں۔

۲.۴۔ نظم پر تبصرہ

عزیز طالب علمو! ''شکوہ'' نظم کی اس تشریح سے آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ علامہ اقبال نے کس خوبصورتی سے امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے اور کس طرح اسلامی دنیا کے شاندار ماضی کا ولولہ انگیز تذکرہ کرنے کے بعد اس کی حالیہ پستی کا خدا سے شکوہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا میں عقیدۂ توحید کو پھیلانے کی مخلصانہ کوشش اگر کسی قوم نے کی ہے تو وہ صرف مسلمان قوم ہے لیکن ستم یہ ہے کہ یہی قوم اب فیضانِ الٰہی سے محروم ہے۔ اقبال کو اس بات پر شدید حیرت ہے کہ جہاں گنہگار، مغرور، ملحد، مشرک، کاہل اور عیار قومیں، عیش و آرام کی زندگی گزار رہی ہیں وہاں مسلمان قوم پر مسلسل برقِ ستم گر رہی ہے اور اسے پست اور مفلس بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال نے بڑی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ مسلمانوں کے زوال کی داستان سنائی ہے۔ یہ زوال سیاسی بھی ہے، معاشی بھی، مذہبی اور اخلاقی بھی، تاہم اقبال اپنی قوم سے مایوس نہیں ہیں۔ انہیں توقع ہے کہ اگر مسلمان قوم، اسلام کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دے اور نبی اکرمؐ کی تعلیمات پر عمل کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل نہ کر لے۔

فکری اعتبار سے جس طرح یہ نظم اردو شاعری میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ تاثیر کا ایک معجزہ ہے۔ لب و لہجہ، زبان و بیان، موسیقیت، تشبیہات و استعارات اور لفظی تصویر کشی کے اعتبار سے

بھی اس کا درجہ بے حد بلند ہے "شکوہ" کا اسلوبِ بیاں پختہ، مؤثر اور خیال انگیز ہے۔ اس کی زبان متحرک، جاندار، پُر جوش اور پُر جلال ہے۔ اقبال کو الفاظ وتراکیب کے چناؤ کا سلیقہ نصیب ہے یہی وجہ ہے کہ اس نظم کے الفاظ برمحل اور تراکیب دلکش ہیں۔ "شکوہ" میں تغزل اور شعریت بھی موجود ہے اور بڑی فنکارانہ مہارت سے اس میں نغمگی بھی پیدا کی گئی ہے۔ نئی علامات، نئی تشبیہات، نئے استعارات اور خوبصورت لفظی تصویروں کی بھی اس میں کمی نہیں۔ یوں یہ نظم فکر وفن، دونوں اعتبار سے ایک پُر شکوہ اور دلآویز تخلیق کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کے اشعار میں اتنی سلاست روانی اور بہاؤ ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

۳۔خود آزمائی

(الف) مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب لکھیے؟

۱۔ اقبال اس نظم میں کس سے شکوہ کرتے ہیں؟

۲۔ اقبال کس بات کا شکوہ کرتے ہیں؟

۳۔ اقبال شکوہ کیوں کرتے ہیں؟

۴۔ کیا اقبال نے ''شکوہ'' نظم میں مسلمانوں کے محض زمانہ حال کی شکایت کی ہے؟

۵۔ کیا انہوں نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کا بھی تذکرہ کیا ہے؟

۶۔ اقبال نے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں امید کا اظہار کیا ہے یا ناامیدی کا؟

۷۔ اقبال کے خیال میں مسلمانوں کے عروج کے اسباب کیا تھے؟

۸۔ اقبال کے خیال میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا تھے؟

۹۔ اقبال کے خیال میں اس زوال کو کس نے تیز کیا؟

۱۰۔ مسلمان قوم کو بیدار کرنے کے لئے اقبال نے کونسا طریقہ اختیار کیا؟

(ب) دیئے ہوئے الفاظ میں سے صحیح لفظ منتخب کر کے خالی جگہ پر کیجئے؟

۱۔ مسلمانوں نے..............کہلانا پسند کیا۔ (بت فروش، بت شکن)

۲۔ اقبال ''شکوہ'' میں..............کی نمائندگی کرتے ہیں۔ (مسلمانوں، کفار)

۳۔ اپنے عہد کی شاعری کو سب سے زیادہ..............نے متاثر کیا۔ (شمع وشاعر، شکوہ)

۴۔ اقبال..............پر زور دیتے رہے۔ (ہندو مسلم اتحاد، اتحاد عالم اسلامی)

۵۔ ''شکوہ'' اپریل..............میں انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں پڑھی گئی۔ (۱۹۱۴ء، ۱۹۱۱ء)

(ج) مندرجہ ذیل فقرات میں سے صحیح جواب پر نشان (✓) لگائیے۔

۱۔ شکوہ کی لے تیز ہوتی ہے۔

(الف) جذبات کی شدت کی وجہ سے

(ب) کافروں پر اللہ کی نعمتوں کی بارش دیکھ کر

(ج) مسلمانوں کا عروج دیکھ کر

۲۔ مسلمانوں میں عملی مساوات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

(الف) عید کے موقع پر

(ب) دکھ تکلیف میں

(ج) نماز کے موقع پر

۳۔ سومنات کے بت کو توڑا

(الف) محمد غوری نے

(ب) سلطان محمود غزنوی نے

(ج) محمد بن قاسم نے

۴۔ شکوہ مشتمل ہے

(الف) ۳۰ بندوں پر

(ب) ۳۴ بندوں پر

(ج) ۳۱ بندوں پر

۵۔ ''شکوہ'' کے لئے علامہ اقبال نے ہیئت اپنائی ہے۔

(الف) ترکیب بند

(ب) مخمس

(ج) مسدس

۴۔ جوابات

(الف) ا۔ خدا سے ۲۔ مسلمان قوم کے زوال کا ۳۔ تاکہ سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگایا جا سکے اور ان کی پستی کا علاج کیا جا سکے۔ ۴۔ جی نہیں ۵۔ جی ہاں ۶۔ امید کا
۷۔ خدا کی اطاعت کا شوق، جہاد، عدل و مساوات، نیکی اور پارسائی ۸۔ کاہلی، اسلام سے دوری، بے حسی، نفاق و انتشار اور غلامانہ ذہنیت ۹۔ یورپی اقوام کی ہوس ملک گیری نے
۱۰۔ اُسے ماضی کی شاندار تصویریں دکھائیں۔

(ب) ا۔ بت شکن ۲۔ مسلمانوں ۳۔ ''شکوہ'' ۴۔ اتحاد عالم اسلامی
۵۔ ۱۹۱۱ء میں

(ج) ا۔ ب ۲۔ ج ۳۔ ب ۴۔ ج ۵۔ ج

یونٹ....۱۵

جوابِ شکوہ

تحریر:
ڈاکٹر انور محمود خالد

فہرست

عنوان		صفحہ
	تعارف	465
	مقاصد	466
ا۔	ملت اسلامیہ کے زوال کے اسباب	467
۲۔	نظم کا تعارف	470
۲.۱۔	نظم کا مرکزی خیال	271
۲.۲۔	نظم کا تجزیہ	472
۲.۳۔	تشریحات	477
۲.۴۔	نظم پر تبصرہ	509
۳۔	خود آزمائی	512
ا۔	جوابات	513

تعارف

عزیز طلبا و طالبات!

اس یونٹ میں علامہ اقبال کی نظم ''جواب شکوہ'' کے حوالے سے آپ کو بتایا جائے گا کہ مِلّتِ اسلامیہ کے زوال کی وجوہات کیا ہیں؟ اور وہ اسے کس طرح دور کر سکتی ہے؟ یہ نظم جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، ''شکوہ'' کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ ''شکوہ'' میں اقبال نے مسلمانوں کی پستی کا ذمے دار خدا کو ٹھہرایا ہے اس پر بہت سے لوگوں کو اعتراض تھا، کیونکہ ان کے خیال میں مسلمان اپنی پستی کے خود ذمے دار تھے علامہ اقبال کا خیال بھی ان سے مختلف نہ تھا۔ لیکن انہوں نے ''شکوہ'' میں جو زبان، اسلوب اور لب ولہجہ اختیار کیا۔ وہ شاعرانہ ہونے کے باوجود، ضرورت سے زیادہ شوخ اور بے تکلفانہ تھا یہی وجہ ہے کہ ''شکوہ'' لکھنے کے دو سال بعد انہوں نے ''جواب شکوہ'' لکھی اور اس میں خدا کی زبان سے ان تمام اعتراضات کا جواب دیا، جو انسان نے ''شکوہ'' میں اپنے خدا کے حضور اٹھائے تھے۔ چنانچہ اس نظم میں خدا نے مسلمانوں کی پستی کا ذمہ دار خود انہیں قرار دیا ہے اور ایک ایک کر کے وہ تمام اسباب گنوائے ہیں، جو ان کے قومی زوال کا باعث بنے۔ ''شکوہ'' میں اقبال نے جن جن باتوں کی شکایت کی تھی، ان میں سے ہر ایک کا جواب انہوں نے ''جواب شکوہ'' میں دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب، اللہ تعالیٰ کی ان سے بے رخی اور بے اعتنائی [1] نہیں بلکہ خود ان کی اپنی بے حسی، بے عملی اور سستی ہے۔ ''شکوہ'' میں اقبال نے خدا سے گلہ کیا تھا کہ مسلمانوں نے اس کی رضا کے لئے جہاد کیا اور اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرے لیکن اس کا بدلہ انہیں یہ ملا، کہ آج وہ دنیا کی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں اور دوسری اقوام زندگی کی دوڑ میں ان سے کوسوں آگے نکل گئی ہیں ''جواب شکوہ'' میں اقبال نے بڑی خوبصورتی سے مسلمانوں کے الزامات خود انہی کی طرف لوٹا دیئے ہیں اور خدا کی زبان سے بتایا ہے کہ بحیثیت قوم ان کے انحطاط کے حقیقی اسباب کیا ہیں؟ ان میں نمایاں اسباب بے عملی، ملی انتشار، مذہب سے دوری مغربی ثقافت کی کورانہ [2] تقلید کسی نصب العین کا فقدان [3] گمراہ کن مغربی تصور وطنیت کی پیروی، بے لگام مادہ پرستی اور عشق

---

(۱) بے توجہی (۲) بے سوچے سمجھے اندھوں کی طرح (۳) نہ ہونا، کمی

رسولؐ سے چشم پوشی وغیرہ ہیں۔ اس سلسلے میں شاعر نے موجودہ مسلمانوں کا موازنہ ان کے آباؤ اجداد سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے اسلاف (۱) اپنے اخلاق و کردار، علم و فضل، شجاعت و عدالت، نیکی و تقویٰ (۲) اور گفتار و کردار کے اعتبار سے کتنے بلند پایہ تھے لیکن خود ان کی زندگیاں ان اوصاف سے کس قدر خالی ہیں اقبال نے عہد حاضر کے مسلمانوں کی فکری گمراہی اور عملی کمزوریوں کی بڑی مؤثر تصویر کھینچی ہے لیکن انہیں مایوس نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اگر وہ اپنے نقائص دور کر لیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ دوبارہ سر بلند نہ ہوں کیوں کہ ان کے پاس اسلام جیسا دین، حضرت محمدؐ جیسا رہبر اور عشق رسولؐ جیسا جذبہ موجود ہے۔ اگر وہ خود کو قوم پرستی جیسی مغربی لعنت سے پاک کر لیں اور جغرافیائی، لسانی (۳) اور نسلی گروہ بندیوں سے ہٹ کر عالمگیر امت مسلمہ کا ایک جزو سمجھیں تو ان کے تمام دکھوں کا علاج ہو سکتا ہے اگر مسلمان عقیدہ توحید پر ایمان رکھیں اور حضور اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوں، تو وہ اپنی موجودہ پستی کی دلدل سے نکل سکتے ہیں۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ کو اس قابل ہونا چاہیے کہ آپ:

۱۔ اسلامی دنیا کے زوال کے اسباب کی نشاندہی کر سکیں۔

۲۔ زوال کے اسباب کو دور کرنے کے لئے لائحہ عمل تجویز کر سکیں۔

۳۔ ''جوابِ شکوہ'' کے حوالے سے اقبال کے فلسفہ تمدن و معاشرت کی وضاحت کر سکیں۔

۴۔ ''جوابِ شکوہ'' کے حوالے سے اقبال کے تصورِ ملت پر بحث کر سکیں۔

۵۔ اقبال کی ملی شاعری میں ''جوابِ شکوہ'' کا مقام و مرتبہ متعین کر سکیں۔

۶۔ نظم کا تجزیہ کر کے امتِ مسلمہ کے انحطاط کے بارے میں اقبال کے نقطہ نظر کی وضاحت کر سکیں۔

---

(۱) بزرگ، پہلے زمانے کے لوگ (۲) پرہیزگار ہونا (۳) زبان سے متعلق

۱۔ مِلّتِ اسلامیہ کے زوال کے اسباب

"جوابِ شکوہ" لکھے جانے کا زمانہ بھی کم وبیش وہی ہے جو "شکوہ" تحریر کرنے کا ہے۔ ان دونوں نظموں کے درمیان کوئی ڈیڑھ دو سال کا وقفہ ہے اور اس وقت تک مسلمانانِ عالم کے سیاسی، معاشرتی، معاشی، مذہبی، اخلاقی، تہذیبی اور تمدنی حالات میں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا تھا عالمِ اسلام اسی طرح یورپی اقوام کی ہوس ملک گیری اور معاشرتی استحصال (۱) کا شکار تھا، جیسا کہ "شکوہ" لکھے جانے کے وقت تھا۔ فرنگیوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اسلامی ممالک کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور مغربی تہذیب کے سیلاب میں وہاں کے عوام بے بس ہو کر بہے جا رہے تھے۔ یورپ کے نظریہ وطنیت نے مسلمان قوموں کو محصور کر رکھا تھا اور وہ باہمی سر پھٹول میں مصروف تھیں خلافتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کی سازشیں زوروں پر تھیں اور ملتِ اسلامیہ اپنے انحطاط (۲) کے اسباب پر غور کرنے اور انہیں دور کر کے ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش آگے بڑھنے کی بجائے خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہی تھی یورپ صنعتی انقلاب کی بخشی ہوئی نعمتیں سمیٹ رہا تھا سائنسی ایجادات کے سہارے مہلک ہتھیار تیار کیے جا رہے تھے۔ اپنی اپنی اقتصادیات کی ترقی کے لئے خام منڈیوں کی تلاش جاری تھی اور ایشیا اور افریقہ کی پس ماندہ اقوام کو تہذیبِ نو کی برکتوں سے روشناس کرانے کے بہانے ان پر سیاسی تسلط مستحکم کیا جا رہا تھا یہی وہ زمانہ ہے، جب یورپی اقوام کی انگیخت (۳) پر بلقانی ریاستوں نے بغاوت کا علم بلند کر دیا اور ترکی کے ہاتھ سے اس کے بیشتر یورپی مقبوضات نکل گئے۔ مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک بھی ترکوں کے تسلط سے رہائی پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور ترقی کے نام پر یورپی قومیں انہیں ترکوں کے خلاف ابھار رہی تھیں شمالی افریقہ میں یعنی سامراجیوں کا یہ کھیل جاری تھا چنانچہ فرانس نے ۱۹۱۶ء میں الجزائر، تیونس اور مراکش پر قبضہ کر لیا

---

(۱) لوٹ کھسوٹ (۲) پستی، گراوٹ (۳) اکسانے پر

برطانیہ نے مشرق وسطیٰ پر اپنے پنجے گاڑ دیئے مصر اور سوڈان پر تو وہ پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا اور اب فلسطین، عراق شام اور حجاز پر اس کی حریصانہ نظریں پڑ رہی تھیں یہی وہ زمانہ ہے جب بلغاریہ میں شور برپا ہوا اور ایران میں روسی فوجوں نے داخل ہو کر بہت سے علاقے اپنے قبضے میں کر لئے۔ جنگ بلقان کی وجہ سے ترکی کو طرابلس سے دستبردار(۱) ہونا پڑا اور یوں اطالیہ نے لیبیا پر قبضہ کر لیا اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ''، نظمیں ایران، طرابلس اور بلقان وغیرہ کے حوادث سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں اور ان کا ایک ایک مصرع ہندی مسلمانوں کے جذبات کی منہ بولتی تصویر ہے۔

''شکوہ'' ۱۹۱۱ء میں اور ''جواب شکوہ'' ۱۹۱۳ء میں لکھی گئی اور ڈیڑھ دو سال کے اس وقفے میں اقبال نے جو کچھ دیکھا، اس سے انہیں اپنی قوم کی بے حسی بے غیرتی کا شدید احساس ہوا۔ انگریز خلافت عثمانیہ کے بڑے دشمن تھے اور سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کے لئے انہوں نے ہندوستان سمیت اپنے مقبوضہ جات سے سپاہی بھرتی کئے۔ چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے اپنے ہم مذہب ترکوں کا ساتھ دینے کی بجائے، انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو کر ان پر گولیاں چلائیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خدا سے شکوہ کرنے والا اقبال اب اپنی قوم کے رویے کا شاکی (۲) نظر آتا ہے اور وہ ''جواب شکوہ'' میں مسلمانوں کے زوال کے جہاں اور اسباب گنواتا ہے، وہاں ان کی مذہب سے بے اعتنائی (۳) مسلمان قوم کے مفاد سے غداری اور غیروں کی غلامی پر قناعت کرنے پر بھی انہیں نشانہ طنز بنایا ہے۔

یورپی اقوام نے مسلمانوں کو پہلے تو اپنے عملی ہتھیاروں سے مغلوب (۴) کیا۔ اپنے علوم وفنون کی بالادستی (۵) اور اپنی تہذیب و معاشرت کی برتری کا ڈھول پیٹا اور زباں، نسل رنگ اور خون کی بنیاد پر قومیت کا نیا فلسفہ دیا۔ چنانچہ عربوں میں عرب قومیت اور ترکوں میں تورانیت کا صور پھونکا۔ قومیت کے اس نئے ہتھیار سے لیس ہو کر

---

(۱) چھوڑنا (۲) شکایت کرنے والا (۳) بے توجہی (۴) شکست دی (۵) فوقیت

ا۔ملّتِ اسلامیہ کے زوال کے اسباب

''جوابِ شکوہ'' لکھے جانے کا زمانہ بھی کم و بیش وہی ہے جو ''شکوہ'' تحریر کرنے کا ہے۔ان دونوں نظموں کے درمیان کوئی ڈیڑھ دو سال کا وقفہ ہے اور اس وقت تک مسلمانانِ عالم کے سیاسی، معاشرتی، معاشی، مذہبی، اخلاقی، تہذیبی اور تمدنی حالات میں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا تھا عالمِ اسلام اسی طرح یورپی اقوام کی ہوسِ ملک گیری اور معاشرتی استحصال[1] کا شکار تھا، جیسا کہ ''شکوہ'' لکھے جانے کے وقت تھا۔فرنگیوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اسلامی ممالک کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور مغربی تہذیب کے سیلاب میں وہاں کے عوام بے بس ہو کر بہے جا رہے تھے۔یورپ کے نظریہ وطنیت نے مسلمان قوموں کو محصور کر رکھا تھا اور وہ باہمی سر پھٹول میں مصروف تھیں خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کی سازشیں زوروں پر تھیں اور ملت اسلامیہ اپنے انحطاط[2] کے اسباب پر غور کرنے اور انہیں دور کر کے ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش آگے بڑھنے کی بجائے خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہی تھی یورپ صنعتی انقلاب کی بخشی ہوئی نعمتیں سمیٹ رہا تھا سائنسی ایجادات کے سہارے مہلک ہتھیار تیار کیے جا رہے تھے۔اپنی اپنی اقتصادیات کی ترقی کے لئے خام منڈیوں کی تلاش جاری تھی اور ایشیا اور افریقہ کی پس ماندہ اقوام کو تہذیب نو کی برکتوں سے روشناس کرانے کے بہانے ان پر سیاسی تسلط مستحکم کیا جا رہا تھا یہی وہ زمانہ ہے، جب یورپی اقوام کی انگیخت[3] پر بلقانی ریاستوں نے بغاوت کا علم بلند کر دیا اور ترکی کے ہاتھ سے اس کے بیشتر یورپی مقبوضات نکل گئے۔مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک بھی ترکوں کے تسلط سے رہائی پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور ترقی کے نام پر یورپی قومیں انہیں ترکوں کے خلاف ابھار رہی تھیں شمالی افریقہ میں یعنی سامراجیوں کا یہ کھیل جاری تھا چنانچہ فرانس نے ۱۹۱۶ء میں الجزائر، تیونس اور مراکش پر قبضہ کر لیا

---

(۱) لوٹ کھسوٹ　(۲) پستی، گراوٹ　(۳) اکسانے پر

برطانیہ نے مشرق وسطیٰ پر اپنے پنجے گاڑ دیئے مصر اور سوڈان پر تو وہ پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا اور اب فلسطین، عراق، شام اور حجاز پر اس کی حریصانہ نظریں پڑ رہی تھیں یہی وہ زمانہ ہے جب بلغاریہ میں شور برپا ہوا اور ایران میں روسی فوجوں نے داخل ہو کر بہت سے علاقے اپنے قبضے میں کر لئے۔ جنگ بلقان کی وجہ سے ترکی کو طرابلس سے دستبردار(۱) ہونا پڑا اور یوں اطالیہ نے لیبیا پر قبضہ کر لیا اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ''، نظمیں ایران، طرابلس اور بلقان وغیرہ کے حوادث سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں اور ان کا ایک ایک مصرع ہندی مسلمانوں کے جذبات کی منہ بولتی تصویر ہے۔

''شکوہ'' ۱۹۱۱ء میں اور ''جواب شکوہ'' ۱۹۱۳ء میں لکھی گئی اور ڈیڑھ دو سال کے اس وقفے میں اقبال نے جو کچھ دیکھا، اس سے انہیں اپنی قوم کی بے حسی بے غیرتی کا شدید احساس ہوا۔ انگریز خلافت عثمانیہ کے بڑے دشمن تھے اور سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کے لئے انہوں نے ہندوستان سمیت اپنے مقبوضہ جات سے سپاہی بھرتی کئے۔ چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے اپنے ہم مذہب ترکوں کا ساتھ دینے کی بجائے، انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو کر ان پر گولیاں چلائیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خدا سے شکوہ کرنے والا اقبال اب اپنی قوم کے رویے کا شاکی(۲) نظر آتا ہے اور وہ ''جواب شکوہ'' میں مسلمانوں کے زوال کے جہاں اور اسباب گنواتا ہے، وہاں ان کی مذہب سے بے اعتنائی(۳) مسلمان قوم کے مفاد سے غداری اور غیروں کی غلامی پر قناعت کرنے پر بھی انہیں نشانہ طنز بنایا ہے۔

یورپی اقوام نے مسلمانوں کو پہلے تو اپنے عملی ہتھیاروں سے مغلوب(۴) کیا۔ اپنے علوم وفنون کی بالادستی(۵) اور اپنی تہذیب و معاشرت کی برتری کا ڈھول پیٹا اور زبان، نسل رنگ اور خون کی بنیاد پر قومیت کا نیا فلسفہ دیا۔ چنانچہ عربوں میں عرب قومیت اور ترکوں میں تورانیت کا صور پھونکا۔ قومیت کے اس نئے ہتھیار سے لیس ہو کر

---

(۱) چھوڑنا (۲) شکایت کرنے والا (۳) بے توجہی (۴) شکست دی (۵) فوقیت

مشرق وسطی نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی چنگاریوں کو ہوا دی اور یورپی اقوام نے عربوں، شامیوں، عراقیوں اور فلسطینیوں وغیرہ کو ترکوں کے خلاف بھڑکا دیا۔ یوں سارا مشرق وسطی انتشار و نفاق کی زد میں آ گیا اور تو اور خود ترکوں نے انجمن اتحاد و ترقی قائم کر کے اپنے خلیفہ کو معزول کر دیا اور خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی طرف پہلا قدم اٹھایا۔ نوجوان ترک تورانی قوم پرستی اور لادینیت (سیکولرازم) کے پر جوش مبلغ تھے یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مسلمان زندگی کی مادی قدروں کے شائق (۱) اور مذہب سے بے اعتنائی کا شکار نظر آتے ہیں۔

اقبال نے ''جواب شکوہ'' کے حوالے سے مسلمانوں کے اجتماعی زوال کے کئی اسباب گنوائے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا سبب ان کی بے عملی ہے ان کے خیال میں یوں لگتا ہے کہ مسلمان ذوق عمل سے محروم ہو چکے ہیں۔ شاید اسی لئے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے روشن مستقبل کے انتظار میں رہتے ہیں۔ غالباً اس کا سبب وہ تقدیر پرستی تھی جو مسلمانوں میں غلط تصوف کی وجہ سے بری طرح سرایت کر چکی تھی۔ اقبال نے ان کی بے حسی اور بے عملی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور انہیں بتایا کہ ان کے زوال کا اصل سبب خدا کا آنکھیں پھیر لینا نہیں، بلکہ خود ان کا حرکت اور جدو جہد سے جی چرانا ہے زوال کا دوسرا سبب مسلمانوں کا انتشار و نفاق ہے جب تک ان میں اتحاد قائم رہا دشمن ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ نہ سکا۔ لیکن جونہی وہ وطنیت کے سیاسی نظریے کے اسیر ہوئے، مغربی اقوام نے انہیں چھوٹے چھوٹے علاقائی، لسانی اور نسلی گروہوں میں بانٹ دیا اور خود مسلمانوں کو مسلمانوں کا دشمن بنا دیا۔ علاوہ ازیں مسلمان معاشرتی سطح پر ذات برادری، مذہبی فرقہ پرستی اور معاشی ناہمواری کا شکار تھے اور مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اس چیز نے بھی ان کے اجتماعی اتحاد و اتفاق کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ اقبال کے نزدیک اسلام کا جذبہ اخوت ہی اس کا صحیح علاج ہے جو عقیدے کی بنیاد پر انہیں ایک دوسرے کا بھائی بناتا ہے اور مسلمان قوم کو ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کی تلقین کرتا ہے اقبال کے نزدیک مسلمان قوم کا تیسرا مرض جہاد سے جی چرانا ہے۔ حالانکہ اتحاد کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا وصف

---

(۱) شوقین

جس نے ماضی میں انہیں دنیا کا حکمران بنادیا اُن کا جذبہ سرفروشی تھا ایک صحیح نصب العین کے لئے جان دینا ان کے نزدیک زندگی کا حق ادا کرنا تھا یہی وجہ ہے وہ سوائے خدا کے کسی کے آگے نہیں جھکے اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی نہیں ہچکچائے مذہب سے دوری، مغربی تہذیب و معاشرت کی اندھی نقالی اور بے لگام مادہ پرستی دوسرے بڑے اسباب ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے زوال کو تیز تر کر دیا۔

۲۔ نظم کا تعارف

''جواب شکوہ'' علامہ اقبال نے ۱۹۱۳ء میں لکھی اور موچی دروازے، لاہور کے باہر اس جلسہ میں سنائی جس کا انتظام مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ تا کہ جنگ بلقان کے سلسلے میں ترکوں کے لئے چندہ جمع کیا جائے۔ نظم کے پڑھے جانے کے بعد اس کی ہزاروں کاپیاں فوراً بک گئیں اور ان سے حاصل شدہ رقم بلقان فنڈ میں دے دی گئی۔

نظم، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے خدا کی طرف سے ''شکوہ'' کا جواب ہے۔ میاں عطاالرحمٰن نے، جو بیرون موچی دروازے کے اس جلسہ میں خود موجود تھے۔ جس میں اقبال نے یہ نظم پڑھی تھی، ایک مضمون میں اس جلسے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگ بلقان کے دوران میں خبر ملی کہ اقبال نے ''شکوہ'' کا جواب لکھا ہے جو عنقریب کسی جلسے میں پڑھا جائے گا۔ اس پر جوش امید ہر طرف پھیل گیا اور شاید اسی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مولوی ظفر علی خان ''زمیندار'' والوں نے موچی دروازے کے باہر باغ میں ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام کیا اور مشتہر ہوا کہ اس میں اقبال کی نظم ہوگی۔ شائقین کا ایک جم غفیر (۱)، باغ کے پنڈال میں جمع ہوا۔ میں خود اس جلسے میں موجود تھا۔ اقبال نے نظم اسی طرح ہر طرف سے داد کی بوچھاڑ میں پڑھی۔ ایک ایک شعر نیلام کیا گیا اور ایک گراں قدر (۲) رقم بلقان فنڈ کے لئے جمع ہوگئی۔

---

(۱) بڑا ہجوم (۲) کافی زیادہ

''شکوہ'' میں اقبال نے انسان کی زبانی خدا سے شکایت کرنے کی جرأت کی تھی اور ''جواب شکوہ'' میں خدا کی طرف سے مسلمانوں کو ان کی شکایات کا جواب دیا ہے ان کی پستی، زبوں حالی، زیاں کاری اور زوال کے اسباب کی نشاندہی کی ہے اور ان کا حل بتایا ہے شاعر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ایک ایک کر کے ملت اسلامیہ کی کمزوریاں گنوائی ہیں اور ان کے اجتماعی قومی گناہوں پر شرم دلا کر انہیں ان کا کفارہ (۱) ادا کرنے کی تلقین کی ہے۔ ''شکوہ'' میں اگر نیاز مندانہ گستاخی پائی جاتی ہے تو ''جواب شکوہ'' میں الہامی پند و نصائح سے کام لیا گیا ہے۔ ''شکوہ'' میں شاعر خدا کے سامنے یکے بعد دیگرے شکایات کا انبار (۲) لگاتا جاتا ہے حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو شکایت کا جواب، ایک جوابی شکایت کے طور پر خود اس کے اندر موجود ہے۔ تاہم اس لطیف رمز کو اس زمانے کے نادان لوگ نہ سمجھ سکے اور اقبال کو وضاحت کے لئے ''جواب شکوہ'' لکھنا پڑا۔

انہیں ملت اسلامیہ کے رو بہ زوال ہونے کا دکھ تھا اور وہ مسلمان کی بے راہروی کی وجہ سے ان کے مستقبل کی طرف سے فکر مند تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان قوم خواب غفلت سے جاگے اور میدان عمل میں آئے انہیں مسلمانوں کے اخلاقی زوال، معاشی بدحالی اور معاشرتی پس ماندگی (۳) کا بھی غم تھا اور اس کے علاج کے لئے عقیدہ توحید کی وابستگی اور عشق رسالت مآبؐ کو وہ لازمی قرار دیتے تھے یہی وہ خیالات ہیں جو باہم مربوط ہو کر ''جواب شکوہ'' کی صورت میں نظم کے سانچے میں ڈھل گئے۔

۱.۲۔ نظم کا مرکزی خیال

''جواب شکوہ'' کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے زوال کے اسباب خود مسلمان قوم کے اندر موجود ہیں اور وہ ہیں بے حسی، بے عملی، نااتفاقی، اسلام سے بیگانگی، مغربی معاشرت، تمدن اور تہذیب کی نقالی، یورپی نظریہ وطنیت کی پیروی، اجتماعی نصب العین کی کمی، ریاکاری (۴) مادہ پرستی، علم و ہنر سے دوری، سائنسی ایجادات سے بے خبری مصلحت پسندی اسلاف کے طور طریقوں سے بےزاری، طبقاتی ناہمواری، ذات برادری اور رنگ نسل کی بناء پر

---

(۱) بدلہ (۲) ڈھیر (۳) غربت، مفلسی (۴) منافقت

قوم کی گروہ بندی، صداقت، شجاعت اور سرفروشی سے گریز، فقر و غنا(۱) اور غیرت و خودداری جیسی صفات کی کمی اور عشق رسولؐ سے بے گانگی وغیرہ، مختصراً علامہ اقبال نے ''جواب شکوہ'' میں اپنا فلسفہ تمدن و معاشرت بڑے مربوط انداز میں پیش کر دیا ہے جس کی بنیاد قرآن حکیم کی تعلیمات پر رکھی گئی ہے۔ اس نظم میں مسلمانوں کی تمام کمزوریوں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور انہیں دور کرنے کے لئے لائحہ عمل (۲) بھی تجویز کیا گیا ہے۔ یوں یہ نظم ملت اسلامیہ کے قومی امراض کی تشخیص بھی کرتی ہے اور ان سے نجات پانے کے لئے عقیدہ توحید اور عشق رسول کا نسخہ بھی تجویز کرتی ہے۔

۲.۲۔ نظم کا تجزیہ

''جواب شکوہ'' ۳۶ بندوں پر مشتمل ہے ہر بند میں چھ چھ مصرعے، یعنی تین تین اشعار ہیں۔ نظم کی یہ صورت مسدس کہلاتی ہے، مسدس کے ہر بند کے پہلے چار مصرعے ایک ہی وزن اور ردیف قافیے کی پابندی کرتے ہیں البتہ اگلے دو مصرعے ردیف قافیے کا ایک نظام رکھتے ہیں۔ گو وزن وہی رہتا ہے ''جواب شکوہ'' چونکہ تین تین شعروں کے ۳۶ بندوں پر مشتمل ہے، اس لئے اس کے کل اشعار کی تعداد ۱۰۸ بنتی ہے۔ معنوی اعتبار سے یہ نظم چھ حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

پہلا حصہ:

پہلے بند پر مشتمل ہے اور اس کی حیثیت تمہید کی سی ہے یہ شاعر کی طرف سے ایک طرح کی خود کلامی ہے اس میں انسان کی زبان سے اس ''شکوہ'' کی اثر انگیزی بتائی گئی ہے، جو اس نے خدا سے کیا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس کی فریاد چونکہ دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی، اس لئے وہ آسمان کو چیرتی ہوئی عالم قدس تک پہنچ گئی۔

---

(۱) فقر کے معنی ہیں احسان نہ اٹھانا اور غنا کے معنی ہیں کسی چیز کا لالچ نہ ہونا (۲) پروگرام

دوسرا حصہ:

تین بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ دوسرے بند سے شروع ہوتا ہے اور چوتھے بند پر ختم ہوتا ہے اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ شاعر کی درد بھری فریاد آسمان پر پہنچتے ہی آسمان، چاند، سیاروں اور کہکشاں میں سرگوشی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ سب اس بات پر حیران ہیں کہ یہ آواز عرشِ معلی تک پہنچ کیسے گئی اور یہ فریاد کون کر رہا ہے؟ صرف بہشت کا داروغہ رضوان بات کی تہہ تک پہنچتا ہے اور یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ یہ جنت سے نکالے ہوئے انسان کی آواز ہے اس پر فرشتوں میں کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے اور وہ انسان کو شوخ اور گستاخ قرار دیتے ہیں کیونکہ خدا نے تو اسے فرشتوں سے سجدہ کروایا، لیکن وہ نادان پھر بھی اپنے خالق سے خفا ہے۔

تیسرا حصہ:

تیرہ بندوں پر محیط ہے یہ پانچویں بند سے شروع ہو کر سترھویں بند پر ختم ہوتا ہے یہ حصہ نظم کا سب سے بڑا حصہ ہے اور اس میں خدا اپنے بندے سے مخاطب ہو کر نہ صرف اس کی تمام بات تحمل [1] سے سنتا ہے بلکہ ان کا مناسب جواب بھی دیتا ہے انسان کے گستاخانہ رویے پر فرشتوں کی برہمی کے باوجود خدا کا رویہ مشفقانہ اور ہمدردانہ ہے اور وہ بڑے وقار کے ساتھ ایک ایک کر کے انسان کے تمام شکووں کا جواب دیتا ہے اس حصے میں شاعر نے خدا کی زبان سے ملت اسلامیہ کی تمام کی تمام کمزوریاں گنوائی ہیں اور اس کے زوال کے اسباب واضح کئے ہیں مثلاً انسان کی گمراہی کے باوجود خدا کی بندہ نوازی مسلمانوں کا اتحاد میں مبتلا ہونا اور حضور اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی نہ کرنا، نماز روزے کو فرض سمجھنے کی بجائے اپنے اوپر بوجھ سمجھنا، مسلمانوں کی بے ہنری دربدری اور حرص و ہوس، تمام تر بے عملی اور بے حسی کے باوجود خود کو رحمت الٰہی کا واحد امیدوار تصور کرنا، مسلمانوں کی بجائے کافروں کا اسلامی دستور پر عمل کر کے کامیابی حاصل کرنا اور خود ان کا دنیا کی نعمتوں سے محروم رہ جانا، مسلمانوں کا خود کو خاندانوں قبیلوں، فرقوں اور ذاتوں میں تقسیم کرنا اور نبی، دین، حرم پاک، ایمان باللہ اور قرآن پر اتفاق

---

(1) برداشت

ہونے کے باوجود انتشار کا شکار ہونا، مسلمانوں کی مصلحت پسندی اور ابن الوقتی تہذیب وتمدن میں غیروں کی تقلید اور اپنے بزرگوں کی سنت پر چلنے سے بیزاری، دل کا سوز سے خالی ہونا اور روح کا احساس سے محروم ہونا، غربا کی اسلام سے محبت اور امرا کی اس سے چشم پوشی، دینی امور میں وعظ ونصیحت کی بے اثری اور دنیاوی معاملات میں علم وذہانت کی کمی فکر وفلسفہ پر زور لیکن حرارت ایمانی کا فقدان وغیرہ۔

چوتھا حصہ:

آٹھ بندوں پر مشتمل ہے یہ اٹھارویں بند سے شروع ہوتا ہے اور پچیسویں بند پر ختم ہوتا ہے اس حصے میں خدا نے سچے مسلمان کی صفات گنوائی ہیں اور موجودہ مسلمانوں پر واضح کیا ہے کہ ان صفات کے فقدان کی وجہ سے وہ زوال آشنا ہوئے ہیں اس سلسلے میں صداقت، عدل، حیا اور شجاعت کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے آگے چل کر موجودہ دور کے مسلمانوں کا ان کے اسلاف سے موازنہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کردار کی جن خصوصیات کو آج کا مسلمان اپنی طرف منسوب کر رہا ہے وہ دراصل ان کے بزرگوں میں پائی جاتی تھیں۔ موت سے بے خوف ہونا، خدا سے ڈرنا، آپس میں باہمی محبت سے پیش آنا، غیرت وحمیت (۱) اور قلب سلیم (۲) کا مالک ہونا، اخوت وخودداری اور صداقت پسندی کا خوگر ہونا اور دین کی خاطر ہجرت کرنا یہ وہ خوبیاں ہیں جن سے قرون اولیٰ کے مسلمان مالا مال تھے لیکن آج کے مسلمان ان سے محروم ہیں خدا آخر میں کہتا ہے اگر آج بھی مسلمانوں میں حضرت ابراہیمؑ جیسا ایمان پیدا ہو جائے تو آگ پھر ان کے لئے گلزار بن سکتی ہے۔

پانچواں حصہ:

سات بندوں پر مشتمل ہے یہ چھبیسویں بند سے شروع ہو کر بتیسویں بند پر ختم ہوتا ہے اس حصے میں خدا مسلمانوں کو برے حالات کا مقابلہ کرنے اور اچھے دنوں کی توقع رکھنے کی تلقین کرتا ہے اس حصے تک پہنچتے پہنچتے مایوسی کی سیاہی چھٹ جاتی ہے جوابی الزام تراشی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کو امید کا پیغام دیا جاتا ہے مخدوش (۳) حالات کے باوجود اس کی ڈھارس بندھائی (۴) جاتی ہے۔ ایران کی خودمختاری ختم ہونے، تاتاریوں

---

(۱) عزت (۲) قرآن کی اصطلاح میں وہ دل جس میں تقویٰ، ایمان اور عرفان تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ (۳) نازک حالات (۴) ہمت بڑھانا

کی بلغار اور بلغاریہ کے ترکی پر حملے کی مثالیں دے کر واضح کیا گیا ہے کہ یہ سب، مسلمانوں کے لئے آزمائش کے سامان ہیں۔ اس حصے کے آخری بند میں خدا مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ عشق الٰہی کے جذبے سے سرشار ہو کر تمام معاشرتی ناہمواریوں کو دور کر دیں اور دنیا میں اپنے پیغمبرؐ کا نام روشن کریں۔

چھٹا حصہ:

آخری چار بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ تینتیسویں بند سے شروع ہوتا ہے اور چھتیسویں بند پر ختم ہوتا ہے اس حصے کا آغاز بھی نعتیہ اشعار سے ہوتا ہے اور اختتام بھی حضور اکرمؐ کی نعت پر ہوتا ہے۔ اقبال کی دعوت عمل کا مرکزی نقطہ چونکہ حب رسولؐ ہے اس لئے ''جواب شکوہ'' کے آخری حصے میں سرشاری اور والہانہ پن کی بڑی دل آویز کیفیت موجود ہے یہاں خدا کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز حضور پاکؐ کے لئے تخلیق کی گئی ہے انہی کے مقدس نام کی برکت سے آسمان کا خیمہ کھڑا ہے اور انہی کی خاطر کرہ ارض پر زندگی کا قافلہ رواں دواں ہے جب تک یہ دنیا موجود ہے ساری قومیں خود دیکھیں گی کہ خدا نے اپنے محبوب پیغمبر حضرت محمدؐ کا ذکر کیسے اب تک زندہ رکھا ہے آخر میں خدا مسلمانوں سے کہتا ہے کہ اگر وہ محمدؐ کی اطاعت کریں گے تو وہ انہیں نہ صرف اس کا بلکہ ساری کائنات کا مالک بنا دے گا۔

یہ سارے حصے، اقبال نے اس ہنرمندی کے ساتھ باہم پیوست کیے ہیں کہ ''جواب شکوہ'' بھی ''شکوہ'' کی طرح ایک حسین شعری تخلیق بن گئی ہے فکری خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ نظم فنی محاسن [1] سے بھی مالا مال ہے اس کا انداز، لب ولہجہ، نغمہ وآہنگ، ڈرامائی کیفیت، حسن بیان، علامات، تشبیہات واستعارات، لفظی پیکر تراشی، ترکیب سازی اور صنائع بدائع کا برمحل استعمال اس سے بھی اقبال کی دیگر عظیم نظموں کی طرح ایک معجزہ فن بنا دیتا ہے حکیمانہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ نظم سوز وگداز اور سچے دردمندانہ جذبات واحساسات سے بھی لبریز ہے اور اس کا نادر، رواں اور جادو اثر اسلوب اسے مقبول بنانے میں بے حد کامیاب رہا ہے۔

---

(۱) خوبیاں

۴.۲۔تشریحات

(جوابِ شکوہ کے منتخب بندوں کی تشریح)

عزیز طلباء و طالبات! نظم پر اس بحث کے بعد آیئے اب ایک ایک بند لے کر پہلے اس کے مشکل الفاظ کے معنی سمجھیں اور پھر اشعار کی تشریح کریں، تا کہ علامہ اقبال کے افکار سے آگاہی ہو سکے۔

پہلا بند:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں ، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

معانی:

طاقت پرواز: اُڑنے کی قوت۔قدسی الاصل: اصلیت کے لحاظ سے پاکیزہ۔رفعت: بلندی۔گردوں: آسمان۔گزر رکھنا: پہنچنا۔فتنہ گر: فتنے پیدا کرنے والا۔سرکش: باغی۔نالہ بے باک: نڈر فریاد۔بے روک ٹوک کی جانے والی آہ وزاری۔

تشریح:

"شکوہ" کی طرح "جواب شکوہ" کے پہلے بند کا آغاز بھی بڑے مؤثر انداز میں ہوتا ہے یہ بند ایک طرح کی خود کلامی ہے شاعر کہتا ہے کہ جو بات دل کی گہرائیوں سے نکلے، وہ بڑی مؤثر ہوا کرتی ہے چاہے اس کے پر نہ ہوں، لیکن اس میں اڑنے کی قوت ہوتی ہے اور ہر طرف پھیل جاتی ہے ایسی بات چونکہ اپنی اصلیت میں پاکیزہ ہوتی ہے اس لئے وہ بلندی کی طرف جاتی ہے وہ زمین سے اُٹھتی ہے اور آسمان پر پہنچ جاتی ہے شاعر کہتا

ہے کہ میرا عشق فتنہ پیدا کرنے والا، باغی اور چالاک تھا۔ اسے کوئی چیز نہ ڈرا سکتی تھی نہ دبا سکتی تھی۔ اسی لئے میرے دل سے نکلنے والی فریاد آسمان چیر کر آگے نکل گئی۔

آسان لفظوں میں ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے خدا سے جو شکوہ کیا تھا، وہ چونکہ خلوص دل سے کیا تھا۔ اس لئے اس میں بڑی تاثیر پوشیدہ تھی اسی لئے وہ بلا روک ٹوک آسمان پر پہنچ گیا۔ عشق چونکہ کسی قسم کی پابندی قبول نہیں کرتا اس لئے کوئی چیز اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ خدا سے شکایت کے باوجود مجھے اس ذات سے عشق تھا اس لئے اس کے حضور مجھے اپنی فریاد پہنچانے سے کوئی شے نہ روک سکی، میرے عشق نے زمین پر تو ہنگامہ برپا کیا ہی تھا، آسمان پر بھی ہل چل مچا دی۔

دوسرا بند:

پیر گردوں نے کہا سن کے، کہیں ہے کوئی
بولے سیارے، سر عرش بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا، نہیں! اہل زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی، پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

معانی:

پیر گردوں: بوڑھا آسماں۔ سیارہ: گردش کرنے والا ستارہ۔ سر عرش بریں: سب سے اونچے آسمان پر۔ کہکشاں: ستاروں کا جھرمٹ، جو سڑک کی شکل میں آسمان پر دکھائی دیتا ہے۔ پوشیدہ: چھپا ہوا۔ شکوہ: شکایت رضواں: بہشت کا داروغہ۔

تشریح:

انسان کہتا ہے کہ جونہی میری فریاد اوپر پہنچی تو سب سے پہلے بوڑھے آسمان نے کہا کہ یہ فریاد یہیں کہیں میرے آس پاس سنائی دے رہی ہے سیارے کہنے لگے کہ یہ آواز تو اونچے آسمانوں تک آ پہنچی ہے چاند کا یہ خیال تھا کہ یہ صدا زمین کے کسی رہنے والے کی ہے اور کہکشاں نے کہا کہ اگر یہ پکار انسان کی ہے تو پھر سمجھ لو کہ وہ یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہے آسمان، سیارے، چاند اور کہکشاں تو قیاس آرائیوں میں مشغول تھے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے شکوے کو صرف داروغہ جنت، رضوان ہی سمجھ سکا۔ اس نے میری دردمندانہ فریاد سنتے ہی اندازہ لگا لیا کہ ہو نہ ہو یہ تو وہی بہشت سے نکالا ہوا آدمی ہے جسے خدا نے اس کی پہلی خطا کی پاداش میں زمین پر بھیج دیا تھا۔

تیسرا بند:

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا
عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا!
تا سرِ عرش بھی انسان کی تگ و تاز ہے کیا!
آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا
غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!

معانی:

عرش والے: فرشتے جو آسمان پر رہتے ہیں۔ کھلتا نہیں: ظاہر نہیں ہوتا۔ تا سرِ عرش: آسمان کی بلندیوں تک۔ تگ و تاز: بھاگ دوڑ، کوشش۔ خاک کی چٹکی: مراد ہے انسان۔ سکانِ زمین: زمین کے رہنے والے سکان، ساکن کی جمع ہے، یعنی سکونت اختیار کرنے والے یا باشندے۔ پستی کے مکین: زمین کے رہنے والے، آسمان کے مقابلے میں ان کو پست قرار دیا گیا ہے۔

تشریح:

فرشتے بھی اس بات پر حیران ہو رہے تھے کہ یہ آواز کس کی ہے؟ عرش والوں پر بھی یہ واضح نہ ہو سکا کہ آخر یہ بھید کیا ہے؟ انہیں اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ کیا انسان کی رسائی آسمان کی بلندیوں تک بھی ہوگئی ہے اور بستی کے یہ باشندے شوخی اور گستاخی میں تمام حدود پار کر گئے ہیں دراصل فرشتے انسان کے شکوے کے گستاخانہ لب ولہجہ پر حیران تھے۔

چوتھا بند:

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجود ملائک، یہ وہی آدم ہے!
عالم کیف ہے، دانائے رموز کم ہے
ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے
ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

معانی:

شوخ: گستاخ۔ برہم: ناراض۔ مسجود ملائک: جسے فرشتوں نے سجدہ کیا یعنی آدم علیہ السلام۔ عالم کیف: اشیاء کی کیفیتوں کو جاننے والا۔ دانائے رموز کم: چیزوں کی مقدار سے واقف۔ کیف وکم: چیزوں کی کیفیت اور مقدار کیف وکم کا عالم اور دانا اسے کہا جائے گا جو جسمانی وعقلی اور مادی و روحانی حقیقتوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ عجز: انکسار۔ اسرار: بھید۔ نامحرم: ناواقف۔ ناز: فخر وغرور۔ طاقت گفتار: قوت تقریر، بات کرنے کی صلاحیت۔

۱۸ **تشریح:**

فرشتے کہنے لگے کہ یہ انسان اس قدر گستاخ ہے کہ اپنے خدا سے بھی خفا ہے کیا یہ وہی آدم ہے جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا؟ ہم نے مانا کہ انسان کائنات کی مادی اور روحانی حقیقتوں سے بخوبی آگاہ ہے لیکن یہ بھی طے ہے کہ وہ حقیقی عاجزی اور بندگی کے بھیدوں سے بھی ناواقف ہے یوں انسانوں کو اپنی زبان پر بڑا ناز ہے لیکن ان ناسمجھوں کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ فرشتے اس بات پر بڑے برہم تھے کہ خدا نے تو انسان کو فرشتوں سے سجدہ کروایا لیکن یہ نادان خدا سے ہی ناراض دکھائی دیتا ہے یوں تو وہ منطق وفلسفہ، علم و ہنر اور زبان دانی میں کسی کو اپنا مدِ مقابل نہیں سمجھتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بات کرنے کے سلیقے سے ناواقف ہے۔

پانچواں بند:

آئی آواز ، غم انگیز ہے افسانہ ترا
اشکِ بے تاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرہ مستانہ ترا
کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

معانی:

غم انگیز: دردناک۔ افسانہ: کہانی۔ اشک بے تاب: امنڈنے کے لئے بے قرار آنسو۔ لبریز: بھرا ہوا۔ پیمانہ یہاں مراد ہے آنکھیں۔ آسمان گیر: آسمان تک پہنچنے والا۔ آسمان کو اپنی گرفت میں لینے والا۔ نعرہ مستانہ: جوشیلا نعرہ۔ شکر: شکرانہ۔ حسن ادا: بات کرنے کا اچھا انداز۔ ہم سخن: ہم کلام، بات چیت کرنے والا۔

تشریح:

جب فرشتے آپس میں انسان کی شوخی گستاخی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے خدا نے بڑے ہمدردانہ طریقے سے کہا کہ میں نے تیرا شکوہ سن لیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ تیری کہانی بڑی دردناک ہے اور اسے سن کر واقعی رنج ہوتا ہے۔ تیری آنکھوں کا پیالہ آنسوؤں سے بھرا ہوا ہے اور چھلکنے کے لئے بے قرار ہے تیرے جوشیلے نعرے کی وجہ سے آسمان بھی گونج اٹھا ہے اور تیرے دیوانے دل کی شوخ زبان پر حیرت ہوتی ہے تاہم تو نے اس خوبصورتی سے اپنی شکایت مجھ تک پہنچائی ہے کہ وہ شکایت نہیں لگتی۔ اظہار شکر محسوس ہوتی ہے یہ بھی اچھا ہوا کہ اس طرح مجھے اپنے بندوں سے بات کرنے کا موقع مل گیا ہے اے انسان، لے اب اپنے شکوے کا جواب ہم سے سن۔

چھٹا بند:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی، یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

معانی:

مائل بہ کرم: بخشش پر آمادہ۔ سائل: سوالی۔ رہرو: مسافر، جوہر قابل: اصلاح یا تربیت قبول کرنے والا۔ گل: مٹی۔ شان کئی: اونچے درجہ کے شہنشاہوں کی شان، ایران کے قدیم بادشاہوں میں ایک خاندان تھا جس کے ہر بادشاہ کے نام سے پہلے کے کا لفظ آتا تھا مثلاً کیخسرو، کیکاؤس، کیقباد وغیرہ "کے" کی نسبت سے شان کئی کہا گیا ہے۔ نئی دنیا: امریکہ جسے کولمبس نے دریافت کیا تھا۔

تشریح:

خدا کہتا ہے کہ میں تو ہر وقت بخشش پر آمادہ رہتا ہوں لیکن کوئی سوال کرنے والا ہی نہیں جب منزل پر پہنچنے کا خواہش مند کوئی مسافر ہی موجود نہ ہو تو کسے راستہ دکھایا جائے؟ میں نے تو تربیت کو عام کر رکھا ہے لیکن کوئی اصلاح قبول کرنے والا شخص ہی نہیں۔

میرا خیال ہے کہ جس مٹی سے آدم کی تخلیق ہو سکتی ہے یہ وہ مٹی ہی نہیں، کوئی شخص فی الواقع اگر قابلیت رکھتا ہو تو میں اسے اونچے درجے کے بادشاہوں کی شان عطا کرتا ہوں اور جو شخص تلاش کے لئے نکلے، اسے امریکہ جیسی نئی دنیا تک پہنچا دیتا ہوں۔ آخری مصرعے میں کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس وقت تک امریکہ کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ گویا شاعر، خدا کی زبان سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی حاجت روائی کے لئے خدا کی طرف رجوع ہی نہیں کیا، ورنہ کوئی بعید نہ تھا کہ انہیں وہ سب کچھ ملتا، جس کی انہیں خواہش تھی۔

ساتواں بند:

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں
بُت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

معانی:

ہاتھ بے زور ہیں: سیاسی قوت سے محروم ہیں۔ الحاد: خدا کا انکار، خوگر: عادی۔ اُمتی: قوم کے فرد، نبی اکرم کے پیروکار۔ پیغمبر: حضور اکرمؐ۔ بت شکن: بتوں کو توڑنے والے۔ بت گر: بت تراشنے والے بت بنانے والے۔ ابراہیم: حضرت ابراہیم، خدا کے برگزیدہ پیغمبر جنہوں نے اپنے بت پرست باپ کے سامنے عقیدۂ توحید کا اظہار کیا تھا اور اسے بھی بتوں کی پوجا سے منع کیا تھا۔ پدر: باپ۔ پسر: بیٹا۔ آزر: حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام جو بت تراش بھی تھا اور بت پرست بھی۔ بادہ آشام: شراب پینے والے بادہ، شراب خم: شراب کے مٹکے۔ حرم کعبہ: خانہ کعبہ۔

تشریح:

خدا کہتا ہے کہ اے مسلمانو: تمہاری حالت اب کیا ہو چکی ہے؟ تمہارے ہاتھوں میں طاقت نہیں اور تمہارے دل میرے انکار کے عادی ہو چکے ہیں نہ تمہارے پاس سیاسی قوت اور اقتدار ہے اور نہ تمہارے دلوں میں دین کا خیال ہے تم اسلام سے پھر چکے ہو اور تمہارے طور طریقے بالکل کافروں جیسے ہو چکے ہیں تم اپنے پیغمبر کی تعلیم سے بیگانہ ہو چکے ہو یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ نبی کے پیروکار ہو، تمہارا وجود تمہارے پیشوا کے لئے باعث ننگ(۱) ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ تم میں جو بتوں کو توڑنے والے تھے، وہ تو رخصت ہو چکے ہیں، جو باقی رہ گئے ہیں وہ بت بنانے والے اور بت پوجنے والے ہیں پہلے تو باپ آزر ہوتا تھا اور بیٹا ابراہیم یعنی باپ بت تراش ہوتا تھا اور بیٹا بت شکن، لیکن اب الٹی گنگا بہہ رہی ہے تمہارے آباؤ اجداد بت شکن تھے اور تم بت تراش ہو یہ علیحدہ بات ہے کہ اب ان بتوں کی شکل وصورت بدل گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اس دور میں شراب پینے والے بھی نئے ہیں شراب بھی نئی ہے اور شراب کے مٹکے بھی نئے ہیں اب تمہارا خانہ کعبہ بھی نیا ہے، بت بھی نئے ہیں اور تم بھی نئے ہو۔

---

(۱) رسوائی

سادہ لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانو: اب تم شریعت اسلامیہ پر قائم نہیں رہے تم میں اسلامی غیرت اور کردار نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے اور تم نے اسلامی تعلیمات کو یکسر فراموش کر دیا ہے تمہاری معاشرت کا پورا ڈھانچہ ہی بدل گیا ہے۔ اب نہ تو تمہاری عادتیں اسلامی ہیں نہ تمہارے طور طریقے: تمہاری زندگی کا نصب العین بھی بدل چکا ہے۔ اب تم عہدے، دولت، جاگیروں اور خطابوں کے پیچھے بھاگتے ہو جو عہد حاضر کے نئے بت ہیں اب تمہارا حرم کعبہ، نام نہاد نظریہ وطنیت ہے جسے تم دل و جان سے پوجتے ہو۔ چنانچہ اب اگر کوئی تمہیں دیکھے تو مشکل ہی سے پہچان سکے گا کہ تم مسلمان ہو۔

آٹھواں بند:

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایہ رعنائی تھا
نازش موسم گل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا اللہ کا سودائی تھا
کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا
کسی یکجائی سے اب عہد غلامی کر لو
ملت احمد مرسلؐ کو مقامی کر لو!

معانی:

مایہ رعنائی: باعث فخر۔ نازش: باعث ناز۔ موسم گل: بہار کا موسم۔ لالہ صحرائی: صحرا میں کھلنے والا لالہ کا پھول، یہاں مراد ہے اسلام۔ سودائی: عاشق۔ ہرجائی: بے وفا۔ یکجائی: ہرجائی کی ضد وہ شخص (محبوب) جو کسی خاص مقام یا جگہ تک محدود ہو۔ عہد غلامی: وفاداری اور اطاعت کا قول و قرار۔ ملت احمد مرسلؐ: خدا کے رسولؐ حضرت محمدؐ (جن کا نام احمد بھی ہے) کی نام لیوا قوم، مقامی کرلو: آفاقی اور عالمگیر نہ رہنے دو۔ محدود کرلو۔

تشریح:

خدا کہتا ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا جب یہی اسلام تم سب کے لئے باعث فخر تھا وہ ہر اچھائی کا سرچشمہ تصور کیا جاتا تھا صحرا میں کھلنے والا یہ لالے کا پھول موسم بہار کے لئے باعث ناز تھا۔ یعنی اسلام جس نے صحرائے عرب میں جنم لیا دنیا کا بہترین مذہب تسلیم کیا گیا تھا اور اچھے اخلاق و عادات اور اعلیٰ کردار کی بدولت مسلمان دنیا بھر کے لئے بہترین نمونہ بن گئے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ہر مسلمان میرا عاشق تھا اور میری راہ میں جان دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اے مرد مسلمان! تم نے ''شکوہ'' میں مجھے ''ہرجائی'' ہونے کا طعنہ دیا تھا؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ کبھی یہی ہرجائی تمہاری محبت کا مرکز تھا؟ اچھا چلو، اگر میں ہرجائی ہوں تو جاؤ تم کسی ایسے آقا کی غلامی قبول کرلو جو ہرجائی نہ ہو بلکہ یکجائی ہو اور میرے بھیجے ہوئے رسولؐ کی ملت کو آفاقی اور عالمگیر نہ رہنے دو بلکہ اسے وطنیت کے دائرے میں قید کر کے کسی نہ کسی مقام سے وابستہ کرلو۔ یہ بند ''شکوہ'' کے اس شعر کے جواب میں لکھا گیا ہے کہ۔

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

نواں بند:

کس قدر تم پہ گراں، صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبع آزاد پہ قید رمضان بھاری ہے
تمھی کہہ دو، یہی آئین وفاداری ہے!
قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں

معانی:

گراں: بوجھ۔ صبح کی بیداری: نماز کے لئے صبح کے وقت جاگنا۔ طبع آزاد: کوئی پابندی قبول نہ کرنے والی طبیعت۔ قیدِ رمضان: ماہِ رمضان کے روزے رکھنے کی پابندی۔ آئینِ وفاداری: اطاعت کا طریقہ۔ جذب باہم: آپس کی کشش اور محبت۔ محفل انجم: ستاروں کی مجلس۔

تشریح:

اے مسلمانو! تمہارا حال تو یہ ہے کہ صبح کے وقت اٹھ کر نماز پڑھنا ہی تمہیں اپنے اوپر بوجھ محسوس ہوتا ہے یوں لگتا ہے کہ تمہیں مجھ سے لگاؤ نہیں نیند اچھی لگتی ہے تم نے اپنی طبیعتیں اتنی آزاد کر لی ہیں کہ وہ کوئی پابندی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں رمضان کے روزے تمہیں مصیبت نظر آتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی احکام کے متعلق تمہارا یہ حال ہے، تو تم ہی بتاؤ کہ اطاعت و بندگی کسے کہتے ہیں؟ کیا وفاداری کے یہی طور طریقے ہوا کرتے ہیں؟ یاد رکھو! ملت اسلامیہ کا وجود مذہب کے بغیر ختم ہو جائیگا اگر ستاروں پر باہمی کشش نہ رہے تو ان کی محفل بھی قائم نہیں رہتی شاعر نے خدا کی زبان سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جس طرح ستاروں کا نظام، کشش باہم کی بنا پر قائم ہے، اسی طرح قوم کے افراد مذہب کے نظام اخوت کی بنا پر ہی ایک دوسرے سے پیوست رہ سکتے ہیں جو قوم مذہب کو چھوڑ دیتی ہے اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

دسواں بند:

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن، تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

معانی:

فن : ہنر، پروائے نشیمن : ٹھکانے کا خیال۔ آسودہ: آرام کرنا، خرمن : کھلیان۔ اناج کا ڈھیر......
اسلاف: باپ دادا بزرگ۔ مدفن: قبر۔ دفن کرنے کی جگہ، نکونام: نیک نام، صنم: بت۔

تشریح:

اے مسلمانو: تم نہ دنیا کا کوئی ہنر جانتے ہو اور نہ فن، تم تحقیق، علم اور ایجاد سے بیگانہ ہو چکے ہو تم ایسی قوم ہو جسے اپنے ٹھکانے کی بھی پرواہ نہیں یعنی تمہیں اپنے وطن کا بھی کچھ خیال نہیں کہ وہ آزاد رہتا ہے یا غلام؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم اناج کا ایک ایسا ڈھیر ہو جس کے اندر بجلیاں آرام کر رہی ہیں گویا اگر کوئی شخص تمہارے دلوں میں عشق رسولؐ کی آگ جلانا چاہے تو وہ بھی ٹھنڈی ہو کر رہ جائے گی تم تو اپنے بزرگوں کے قبرستان بھی فروخت کر کے کھا جانے والی قوم ہو۔ اگر تم اپنے اسلاف کے قبرستان بیچ کر بھی نیک نام ہی رہتے ہو تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم پتھر کے بت بنا کر نہیں بیچو گے؟ یہاں بڑے لطیف انداز میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ لاہور میں بعض قبرستانوں پر مسلمانوں نے قبضہ کر کے ان پر مکانات تعمیر کرنے شروع کر دیئے تھے یہاں خدا نے "شکوہ" میں شاعر کے اس فخریہ خیال کا بھی طنزیہ انداز میں جواب دیا ہے کہ۔

قوم اپنی جو زر و مال جہاں پہ مرتی
بُت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

اور واضح طور پر کہا ہے کہ جس قوم کو اپنے آباؤ اجداد کی مقدس قبریں فروخت کرنے میں عار (۱) نہیں ہے۔ اسے بت فروشی میں بھلا کیا تامل ہو سکتا ہے بزرگوں کی قبروں پر نذر و نیاز ملنے سے گزر اوقات کرنا بھی بت فروشی ہے۔

---

(۱) شرم

بارھواں بند:

کیا کہا! بہر مسلماں ہے فقط وعدہ حور
شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوہ طور تو موجود ہے، موسیٰؑ ہی نہیں

معانی:

بہر مسلماں: مسلمان کے لئے۔ شکوہ بے جا: غلط شکایت۔ شعور: عقل۔ فاطرِ ہستی: زندگی اور کائنات کا پیدا کرنے والا، یعنی خدا۔ مسلم آئیں ہوا: جس نے اسلامی اصولِ زندگی اختیار کر لیا۔ کافر: خدا کا انکار کرنے والا۔ حور و قصور: جنت کی خوبصورت عورتیں اور خوبصورت سجے سجائے محلات۔ جلوہ طور: صحرائے سینا جو مصر میں واقع ہے، کے ایک سلسلہ کوہ کا نام طور ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا جلوہ دکھائی دیا تھا اور وہ اس سے ہم کلام ہوئے تھے۔

تشریح:

خدا کہتا ہے کہ اے مسلمانو: تم نے یہ کہا کہ میں نے تمہیں صرف جنت میں حوریں عطا کرنے کا وعدہ کر کے ٹرخا دیا ہے؟ سیدھی سی بات ہے کہ اگر کوئی شخص غلط شکایت بھی کر رہا ہو تو اسے عقل سے کام لینا چاہیے کائنات کا خالق خدا ہے اور وہ ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لیتا ہے۔ حقیقت میں تم میں حوروں کی خواہش رکھنے والا ہی کوئی نہیں۔ کوہ طور پر خدا اب بھی اپنا جلوہ دکھا سکتا ہے لیکن اسکے لئے کوئی موسیٰ بھی ہونا چاہیے

خدا کہتا ہے کہ میں تو اب بھی تم پر اپنی رحمتیں نازل کر سکتا ہوں۔لیکن تم میں سے کوئی ان کا مستحق تو ہو۔یاد رکھو! خدا کبھی ناانصافی سے کام نہیں لیتا اس کے اصول متعین اور مقرر ہیں جو ان پر عمل کرتا ہے وہ خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جو ان پر عمل نہیں کرتا ہے وہ نعمتوں سے محروم رہتا ہے اس میں ''شکوہ'' کے اس شعر کا جواب دیا گیا ہے۔

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

تیرھواں بند:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

معانی:

منفعت: نفع۔حرم پاک: خانہ کعبہ۔فرقہ بندی: اختلاف مذہب کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جانا۔پنپنا: ترقی کرنا فروغ پانا۔

تشریح:

اس بند میں خدا نے مسلمان قوم کی مشترک خصوصیات گنوائی ہیں اوراس بات پر ملامت کی ہے کہ باوجوداتنی چیزوں پراتفاق ہونے کے وہ گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔خدا کہتا ہے کہ مسلمان قوم کے تمام افراد کا نفع نقصان مشترک ہوتا ہے۔ فائدہ ہوتو سب کو فائدہ پہنچتا ہےاور نقصان ہوتو سب آپس میں نقصان برداشت کرتے ہیں۔مسلمان قوم ایک جسم کی طرح ہےاورافرادقوم،اس کے اعضاء میں جس طرح ایک عضوکوتکلیف ہوتو باقی اعضاء اس تکلیف کومحسوس کرتے ہیں۔اسی طرح اگر جسم کا کوئی حصہ راحت محسوس کرے تو سارے جسم کو راحت پہنچتی ہے اب جب کہ اس قوم کا نبیؐ ایک ہے یعنی حضرت محمدﷺ، دین بھی ایک ہے یعنی اسلام اورعقیدہ توحید بھی ایک ہے پھر کعبہ،اللہ اورقرآن بھی ایک ہے۔یعنی مسلمانوں کے تمام گروہوں کاان پراتفاق ہے اس صورت میں یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ تمام مسلمان بھی ایک قوم میں ڈھل جاتے لیکن صورت حال یہ ہے کہ کہیں تو معمولی معمولی مذہبی اختلافات کی بناپر تم مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہو اور کہیں ذات برادری کی وجہ سے تم نے خودکوچھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرلیا ہےاب تم ہی بتاؤ کیادنیامیں ترقی کرنے والوں کے یہی لچھن(1) ہوتے ہیں؟

---

(1) کرتوت،اعمال،طورطریقے

چودھواں بند:

کون ہے تارک آئین رسول مختارؐ؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار؟
ہو گئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

معانی:

تارک آئین: اسلامی شریعت کو چھوڑنے ولا۔ رسول مختارؐ: پسندیدہ نبی، چنا ہوا رسول (حضرت محمدؐ)۔ مصلحت: یعنی جس بات میں فائدہ نظر آئے، اسے اختیار کرنا چاہیے وہ حق وصداقت کے خلاف ہو۔ شعار اغیار: غیر مسلموں کا طریقہ، تہذیب وتمدن اور معاشرت۔ طرز سلف: بزرگوں کا طریقہ۔ سوز وجلن: مراد ہے عشق کی حرارت۔

تشریح:

اے مسلمانو! تم ہی بتاؤ کہ وہ کون ہے جس نے ہمارے پسندیدہ اور چنے ہوئے رسول یعنی حضرت محمدﷺ کی شریعت کو چھوڑ دیا ہے؟ وہ کون ہے جس نے سچائی کے راستے کو ترک کر کے صرف وقتی مصلحتوں کا سہارا لیا ہے اور جس بات میں اسے اپنا فائدہ نظر آیا ہے اسی کو اپنے کردار اور اعمال کا معیار بنا لیا؟ وہ کون ہے جس نے غیر مسلموں کے طور طریقوں، تہذیب وتمدن اور معاشرت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا ہے اور اسے پسند کیا ہے؟ وہ کون ہے، جس کی نگاہیں اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں سے بیزار ہو گئی ہیں یقیناً اے مسلمانو! وہ تم ہو۔ تمہارے

دلوں میں عشق کی حرارت نہیں اور تمہاری روحیں لطیف احساسات سے خالی ہو چکی ہیں تمہیں ذرا بھی اس بات کا خیال نہیں کہ تمہارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے تمہیں کیا پیغام دیا تھا اور تم کیا کر رہے ہو؟ گویا نہ تو تمہارے دل میں اسلام کی محبت موجود ہے اور نہ تمہاری نظروں میں اپنے رسولؐ کے ارشادات کی کوئی قدر و قیمت ہے۔

پندرھواں بند:

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا، تو غریب
زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا، تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا، تو غریب
اُمرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا، غرباء کے دم سے

معانی:

صف آرا: نماز کے لئے صفیں باندھنا، قطار میں کھڑا ہونا۔ زحمت روزہ: روزہ رکھنے کی مشقت برداشت کرنا۔

ملت بیضا: مسلمان قوم۔

تشریح:

اے مسلمانو! آج صورت حالات کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ اگر مسجدوں میں نماز کے لئے کوئی جاتا نظر آتا ہے تو صرف غریب! اگر کوئی روزہ رکھنے کی تکلیف برداشت کرتا ہے تو بھی غریب! اگر کسی کے لب پر ہمارا نام

آتا ہے تو وہ بھی غریب! اگر کوئی تمہاری لاج (۱) رکھتا ہے تو بھی غریب! یعنی آج اسلام کے نام لیوا صرف غریب نر بارہ گئے ہیں، رہے امیر لوگ تو وہ دولت کے نشے میں بدمست ہو کر اپنے رب کو بھلا بیٹھے ہیں بس اب تو ملت اسلامیہ کا نام اگر زندہ ہے تو وہ محض غریبوں کی وجہ سے ہے۔

سترھواں بند:

شور ہے، ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود!
وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!

معانی:

نابود: مٹ جانا۔ وضع: لباس۔ نصاریٰ: عیسائی۔ تمدن: معاشرت، رہن سہن۔ ہنود: ہندو کی جمع۔

تشریح:

خدا کہتا ہے کہ ہر طرف شور مچا ہوا ہے کہ دنیا سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹ گیا ہے ذرا یہ تو بتاؤ کہ جن مسلمانوں کے مٹ جانے کی اتنی شکایت کی جا رہی ہے وہ تھے کہاں؟ کیا وہ مسلمان تم ہو؟ ذرا اپنی وضع قطع، لباس اور چال ڈھال تو دیکھو۔ لباس میں تم نے عیسائیوں کی پیروی کر رکھی ہے اور رہن سہن میں ہندوؤں کی۔ تمہارے معاملات اتنے پست ہیں کہ یہودیوں سے بھی بدتر ہیں تم خود کو سید، مرزا، خان اور افغان کہلا کر خوش ہوتے ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہیں بھی اپنے مسلمان ہونے پر بھی فخر ہوا ہے؟ حقیقت میں تم نے اسلام کو ترک کر دیا ہے اور ایک مسلمان کی صفات کا تم میں نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔

---

(۱) عزت

انیسواں بند:

ہر مسلمان رگ باطل کے لئے نشتر تھا
اس کے آئینہ ہستی میں عمل جو ہر تھا
جو بھروسہ تھا اسے قوت بازو پر تھا
ہے تمہیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیوں کر ہو!

معانی:

رگ باطل: کفر کی شہ رگ۔ نشتر: زخم چیرنے کا نوک دار آلہ۔ آئینہ ہستی: زندگی کا آئینہ۔ جوہر: چمک، آب وتاب۔ خوبی: خاصیت، کمال، لیاقت۔ قوت بازو: بازوؤں کی طاقت، سیاسی اقتدار۔ ازبر: یاد۔ پسر: بیٹا۔ میراث پدر: باپ کا ورثہ، باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد۔

تشریح:

خدا کہتا ہے کہ جن مسلمانوں کا میں ذکر رہا ہوں، ان میں سے ہر مسلمان، کفر کی شہ رگ کو نشتر کی طرح کاٹ کر رکھ دیتا تھا اس کی زندگی سراپا عمل تھی اور یہی عمل، اس کی زندگی کے آئینے کی چمک تھا یعنی اس کی زندگی جدوجہد، حرکت اور عمل کا دوسرا نام تھی۔ وہ دوسروں کا محتاج نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے خود اپنے بازوؤں کی طاقت پر بھروسہ ہوتا تھا اور اسی اعتماد کے سہارے وہ دنیا میں زندگی گزارتا تھا وہ صرف اپنے خدا سے ڈرتا تھا، لیکن تم موت کے خوف سے ہر وقت تھر تھر کانپتے ہو۔ بھلا تمہارا اور اس کا کیا مقابلہ؟ یوں تو تم ان مسلمانوں کے وارث بنتے ہو اور خود کو ان کی اولاد کہتے ہو لیکن جو بیٹا اپنے باپ کا صحیح جانشین ثابت نہ ہو وہ باپ کے ورثے پر کیسے اپنا حق جتا سکتا ہے؟ اپ کا ورثہ پانے کے لئے بیٹے کو وہ علم بھی حاصل کرنا چاہئے جو اسے باپ کی میراث کا صحیح حقدار بنائے سادہ لفظوں میں خدا یہ کہہ رہا ہے کہ جب تمہارے اندر اپنے آباؤ اجداد کی صفات ہی موجود نہیں تو تم وہ عظمت اور مقام ومرتبہ کیسے حاصل کر سکتے ہو جو انہیں حاصل تھا۔

اکیسواں بند:

تم ہو آپس میں غضب ناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم
تخت فغفور بھی ان کا تھا، سریر کے بھی
یونہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

معانی:

غضب ناک: خفا، برہم، لڑائی جھگڑے میں مصروف۔ رحیم: رحم، محبت اور شفقت سے پیش آنے والا۔ خطا کار: غلطیاں کرنے والا۔ خطا بیں: نقص نکالنے والے، غلطیاں دیکھنے والے۔ خطا پوش: غلطی پر پردہ ڈالنے والے غلطی کو نظر انداز کرنیوالے۔ کریم: مہربانی کرنے والے۔ اوج ثریا کی بلندی: لفظ ثریا سے مراد وہ سات ستارے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے قریب نظر آتے ہیں یہاں مراد ہے عروج حاصل کرنا۔ مقیم: رہنا۔ قلب سلیم: قرآن کی اصطلاح میں، وہ دل میں جس میں تقویٰ، ایمان اور عرفان، تینوں چیزیں پائی جائیں۔ فغفور: چین کے بادشاہوں کا پرانا لقب۔ سریر کے: ایران کے بادشوں کا تخت۔ حمیت: غیرت، شرم۔

تشریح:

اے مسلمانو! تمہارا اپنے آباؤ اجداد سے کیا مقابلہ ہے؟ تم ہمیشہ آپس میں لڑائی جھگڑا کرتے رہتے ہو لیکن تمہارے بزرگ ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور رحم سے پیش آتے تھے وہ قرآن کی اس آیت کی زندہ تصویر تھے کہ مومن کفار کے مقابلے میں سخت ہیں لیکن آپس میں ایک دوسرے کے لئے رحیم ہیں۔ تم غلطیاں کرنے والے اور ایک دوسرے کے نقص نکالنے والے ہو لیکن تمہارے بزرگ دوسروں کی غلطیوں کو نظر انداز کرتے تھے اور باہمی مہر و محبت اور لطف و کرم سے پیش آتے تھے۔ یہ درست ہے کہ سبھی لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ دنیا میں ترقی کریں اور خود

تمہاری بھی یہی آرزو معلوم ہوتی ہے کہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح ستاروں کو چھو لو۔ لیکن اس خواہش کی تکمیل کے لئے پہلے اپنے بزرگوں جیسا پاکیزہ دل تو پیدا کرو۔ کیا تمہارے دلوں میں تقویٰ، ایمان اور عرفان (۱) کی اعلیٰ صفات پائی جاتی ہیں جو قلب سلیم کے لئے لازمی ہیں؟ تمہارے اسلاف کے دل میں اسلام کی سربلندی کی خواہش تھی اور اس کیلئے اپنی زندگی تک قربان کردیتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہیں شاہ چین کا تخت وتاج بھی نصیب ہوا اور شاہان ایران کا بھی۔ ذرا تم اپنا ان سے مقابلہ کر کے تو دیکھو! کیا تم میں بھی اسلام کی خاطر اپنا سر کٹا دینے کی ہمت موجود ہے؟ کیا تم میں بھی اپنے بزرگوں جیسی اسلامی غیرت موجود ہے۔

تیئسواں بند:

مثل انجم افق قوم پہ روشن بھی ہوئے
بت ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
شوق پرواز میں مہجور نشیمن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں، دین سے بدظن بھی ہوئے
ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

معانی:

مثل انجم: ستاروں کی طرح۔ افق: وہ فرضی لکیر جہاں زمین اور آسمان ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔
بت ہندی: ہندوستانی محبوب۔ برہمن: ہندوؤں میں سب سے اونچی ذات کا آدمی۔ شوق پرواز: اڑنے کا شوق۔

---

(۱) خدا کی پہچان

مہجور نشیمن: گھر یا آشیانے سے دور ہو جانے والے بچھڑے ہوئے، گھر بار یا وطن چھوڑ دینے والے۔ بدظن: بدگمان۔ تہذیب: معاشرے کے اصول اور رسم و رواج، انسانیت اور خوش اخلاقی۔ یہاں مراد ہے مغربی تہذیب دشمن۔ [illegible] پابندی، بندھن، قید۔ کعبہ: مکہ میں موجود خدا کا گھر۔ صنم خانہ: بت خانہ۔

تشریح:

اس بند میں خدا نوجوان طبقے کی اسلامی طرزِ حیات سے بیزاری کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہی نوجوان کبھی قوم کے افق پر ستاروں کی طرح چمکتے تھے اور اب یہی نوجوان ہندوستانی محبوبوں کی محبت میں مبتلا ہو کر برہموں جیسے طور طریقے اپنا رہے ہیں یعنی انہوں نے اسلام کو ترک کر کے کفر کی راہ پر چلنا شروع کر دیا ہے اور غیر اسلامی تہذیب پر فریفتہ (۱) ہو گئے ہیں جب ان کے دل میں اڑنے کی خواہش پیدا ہوئی تو اپنے گھونسلے کا بھی خیال نہ رہا۔ یعنی دنیاوی ترقی کے شوق میں اپنی دینی اور قومی روایات کو بھی بھول گئے ہیں یہ نوجوان بے عملی کا تو پہلے شکار تھے لیکن اب دین سے بھی بیزار ہو گئے ہیں یوں لگتا ہے کہ مغربی تہذیب نے انہیں اسلام کی ہر پابندی سے آزاد کر دیا ہے اور کعبے سے اٹھا کر بت خانے میں لا بٹھایا ہے۔

پچیسواں بند:

عہد نو برق ہے، آتش زن ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوام کہن ایندھن ہے
ملت ختم رسل ؐ شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیم ؑ کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

---

(۱) عاشق، دلدادہ

معانی:

عہد نو: نیا زمانہ، یہاں مغربی تہذیب مراد ہے۔ آتش زن: جلانے والی۔ خرمن: اناج کا ڈھیر، کھلیان۔ ایمن: محفوظ، صحرا یا بیابان۔ گلشن: باغ۔ اقوام کہن: پرانی قومیں۔ ملت ختم رسل: آخری نبی (حضرت محمد ﷺ) کی امت، شعلہ بہ پیراہن: لباس جل رہا ہے۔ مراد ہے تباہی ہو رہی ہے انداز گلستان: باغ کا رنگ ڈھنگ، مراد ہے آگ، باغ میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

تشریح:

اس بند میں مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا گیا ہے خدا کہتا ہے کہ نیا زمانہ بجلی بن کر ہر کھیت کھلیان پر گر رہا ہے اور اس سے نہ کوئی بیابان محفوظ ہے اور نہ کوئی باغ۔ یعنی مغربی تہذیب وتمدن اور مادی اقدار نے ہر قوم کا وجود خطرے میں ڈال دیا ہے اور اس کے افراد کو اخلاقی طور پر تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے یہ وہ آگ ہے جو پرانی قوموں اور پرانی تہذیبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے اور اسی آگ نے اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی امت کا لباس بھی جلا دیا ہے گویا نیا دور ایک بجلی ہے جس نے قوموں کی سابقہ روایات اور حسن کے عقائد کو نیست و نابود کر دیا ہے اور اب ملت اسلامیہ کے دامن تک بھی اس آگ کے شعلے پہنچ رہے ہیں تاہم اس آگ سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور یہ کہ مسلمان اپنے اندر حضرت ابراہیمؑ جیسا پختہ ایمان پیدا کر لیں اگر انہیں بھی توحید الٰہی پر اتنا ہی یقین ہو جتنا کہ حضرت ابراہیمؑ کو تھا تو آج بھی آگ ان کے لئے گلزار میں ڈھل سکتی ہے۔

چھبیسواں بند:

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی !
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی اُفق تابی ہے

معانی:

رنگ چمن: باغ کی حالت، کوکب غنچہ: غنچوں کے ستارے ستاروں کی طرح چمکنے والے شگوفے، خس و خاشاک: گھاس پھونس، گل برانداز: پھول برسانا۔ لالی: سرخی۔ خون شہدا: شہیدوں کا لہو، گردوں: آسمان۔ عنابی: سرخی مائل رنگ جس میں ذراسیاہی بھی ملی ہوئی ہو۔ اُفق تابی: روشن کرنا۔

تشریح:

اس بند سے نظم کا انداز بدلتا اور امید کا پیغام شروع ہوتا ہے خدا مسلمان قوم کو آنے والے اچھے دنوں کی بشارت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے عروج کا وقت پھر آ گیا ہے کیونکہ حالات سے اس کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں یہ خدا کہتا ہے کہ اے قوم کے رہنماؤ! تم اپنی قوم کے باغ کو اجڑا ہوا دیکھ کر غمگین نہ ہو جاؤ کیونکہ شاخوں پر شگوفوں کے ستارے جگمگانے والے ہیں موسم بہار آ رہا ہے اور ٹہنیوں پر کلیاں پھوٹنے والی ہیں۔ جو ستاروں کی طرح پورے باغ کو روشن کر دیں گی عنقریب کوڑا کرکٹ اور گھاس پھونس سے باغ صاف کر دیا جائے گا شہیدوں کے لہو کی سرخی ہر طرف پھول برسا رہی ہے یعنی قوم نے جو قربانیاں دی

ہیں وہ رنگ لانے والی ہیں، اللہ کے راستے میں جن لوگوں نے جان کا نذرانہ پیش کیا تھا ان کا خون رائیگاں (۱) نہیں جائیگا بلکہ وہ آزادی کی منزل کو قریب تر لائے گا۔ دیکھو! ان شہیدوں کے خون کی وجہ سے آسمان کا رنگ سرخی مائل ہو رہا ہے۔ سورج کے طلوع ہونے کا وقت نزدیک آ گیا ہے تھوڑی دیر میں آفتاب نکل آئے گا اور سارا افق اس کی روشنی سے چمک اٹھے گا مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے مصائب (۲) کی سیاہ رات ختم ہونے والی ہے اور اب ان کی عظمت کا سورج ابھرنے والا ہے لہذا انہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

انتیسواں بند:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشہ ے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصر نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

معانی:

نشہ ے: شراب کا نشہ۔ پیانہ: شراب کا پیالہ۔ عیاں: ظاہر۔ یورش تاتار: تاتاریوں کا حملہ۔ یہاں اشارہ چنگیز خان اور اس کی اولاد کی طرف ہے جنہوں نے اسلامی دنیا پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کیا اور بعد میں مسلمان ہو گئے۔ پاسبان: محافظ، نگہبان۔ صنم خانہ: بت خانہ۔ کشتی حق: سچائی کی کشتی۔ عصر نو: نیا زمانہ، موجودہ دور۔

---

(۱) ضائع (۲) مصیبت کی جمع

تشریح:

اس بند میں تاریخی واقعات کا حوالہ دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ اسلامی ملکوں کی تباہی و بربادی کے باوجود مسلمان دنیا سے نہ مٹ سکے اور نہ ہی اسلام کو ختم کیا جا سکا۔ اس لئے کسی ایک ملک کے زوال سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کہتا ہے کہ اے مسلمانو! اگر ایران پر روسی فوجیں قابض ہوگئی ہیں اور انہوں نے اس ملک کو پامال کر دیا ہے تو تمہیں دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جس طرح شراب کا نشہ، پیالے کا محتاج نہیں ہوتا۔ اسی طرح کسی ایک ملک کے چھن جانے سے تمہارا وجود نہیں مٹ جائیگا۔ اگر تم تاریخ کے واقعات پر نظر ڈالو۔ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ چنگیز خان اور اس کی اولاد نے سلطنت عباسیہ کو تباہ کر دیا اور تمام اسلامی ممالک کو زیروزبر کر کے رکھ دیا۔ لیکن ہم نے اس کی نسل کو ہدایت دی اور اسلام قبول کرنے کی سعادت بخشی۔ چنانچہ اسلامی دنیا کو غارت کرنے والے بعد میں اس کے محافظ بن کر ابھرے۔ گویا کعبے کو بت خانے سے اپنے نگہبان مل گئے اے مسلمان! اس وقت صداقت کی کشتی، کفر کے سمندروں میں ڈول رہی ہے تیرے پاس اسلام کی صورت میں ابدی سچائی کا پیغام موجود ہے جب کہ دوسرے مذہب کی تعلیمات مسخ ہو چکی ہیں اس لئے اب دنیا کی نظریں تیری طرف ہی اٹھتی ہیں تو سچ کی کشتی کو کھینچ کر کنارے تک پہنچا سکتا ہے اور گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو ساحل مراد تک لے جا سکتا ہے تیرا وجود زمانے کی اندھیری رات میں مدہم مدہم چمکنے والے ستاروں کی طرح ہے جو پوری دنیا کو چاہے منور نہ کر سکے لیکن جہاں اسکی روشنی پہنچے گی، وہاں سے تاریکی غائب ہو جائے گی۔

تیسواں بند:۔

ہے جو ہنگامہ بپا یورش بلغاری کا
غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا ، خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیل فرس اعدا سے
نور حق بجھ نہ سکے گا نفس اعدا سے

معانی:

ہنگامہ: بغاوت، یورش بلغاری: ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں بلقانی ریاستوں کی بغاوت اور ترکی مقبوضات پر بلغاریہ کے حملہ کی طرف اشارہ ہے اسے جنگ بلقان بھی کہا جاتا ہے۔ دل آزاری: دل دکھانا۔ ایثار: قربانی۔ خودداری: غیرت، ہراساں: پریشان۔ صہیل فرس: گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز۔ اعدا: عدد کی جمع دشمن۔ نور حق: اللہ کا نور، مراد ہے اسلام۔ نفس اعدا: دشمنوں کی پھونکیں۔ نفس کے معنی سانس کے ہیں۔

تشریح:

اے مسلمانو! یہ جو ریاست ہائے بلقان نے ترکی کے خلاف بغاوت کر کے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور اسے اپنے مقبوضات سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا ہے اس سے پریشان نہ ہو جاؤ یہ حملہ تو خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے لئے جاگنے کا پیغام ہے دراصل قدرت تمہارا امتحان لینا چاہتی ہے مگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ تمہارا دل دکھانے کے سامان مہیا ہو رہے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ تم راہ حق میں کس قدر قربانی دے سکتے ہو اور اسلام کے معاملے میں کتنے غیرت مند ثابت ہو سکتے ہو۔ اے مسلمانو! آج اگر دشمن کے گھوڑے میدان جنگ میں ہنہنا رہے ہیں تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ خدا کا نور، دشمن کی پھونکوں سے کبھی نہیں بجھ سکے گا۔ دیکھو! دشمن کی طاقت سے کبھی خوفزدہ نہ ہونا کیونکہ وہ چاہے کتنی ہی کوشش کرے، اسلام نہیں مٹ سکتا۔

بتیسواں بند:

مثل بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ، تو ذرے سے بیاباں ہو جا
نغمہ موج سے ہنگامہ طوفاں ہو جا!
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

معانی:

مثل بو: خوشبو کی طرح۔ غنچہ: ادھ کھلا پھول، شگوفہ: پھلنا۔ رخت بر دوش: سامان اپنے کاندھے پر رکھ لے۔ ہوائے چمنستان: چمن کی ہوا۔ تنک مایہ: حقیر۔ کم حیثیت۔ نغمہ موج: لہروں کا گیت۔ ہنگامہ طوفان: طوفان کا جوش وخروش۔ پست: نیچے گرا ہوا۔ بالا: اوپر، بلند۔ دہر: زمانہ، دنیا۔ اسم محمدؐ: حضرت محمدﷺ کا نام، اجالا: روشنی۔

تشریح:

اس بند میں خدا مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ تم خوشبو کی طرح ادھ کھلے پھول کے اندر کیوں قید ہو؟ کلی میں کیوں بند پڑے ہو؟ تم باہر نکل کر کیوں نہیں پھیل جاتے؟ تم باغ کی ہوا کے کندھے پر اپنا سامان رکھ کر سفر کے لئے کیوں روانہ نہیں ہو جاتے؟ مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! اپنے وطن سے نکلو یا وطن پرستی کے محدود دائرے سے نکلو اور اسلام کا پیغام لے کر دنیا میں پھیل جاؤ اے مسلمان اگر تیرا وجود ذرے کی طرح حقیر ہے تو پرواہ نہ کر اس لئے کہ تو جدوجہد کر کے ذرے سے صحرا بن سکتا ہے تو اگر لہروں کا گیت ہے تو یہ گیت،

طوفان کی لے میں ڈھل سکتا ہے تمہاری کمزوری طاقت میں تبدیل ہو سکتی ہے اور قلت، کثرت میں بدل سکتی ہے بشرطیکہ تیرے دل میں عشق کی قوت موجود ہو یہ وہ جذبہ ہے جو کمتر کو بالا بنا سکتا اور پستی کو بلندی میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اٹھ اور دنیا میں حضور اکرم ﷺ کے پاک نام کی روشنی پھیلا دے: حقیقت یہ ہے کہ صرف عشق الٰہی اور عشق رسولؐ میں ہی یہ طاقت ہے کہ وہ ذرے کو بیابان اور لہر کو طوفان میں تبدیل کر سکتی ہے تمہارا فرض ہے کہ جس پیغمبرؐ کی برکت سے تمہیں ایمان نصیب ہوا ہے اس کا پیغام ساری دنیا تک پہنچا دو۔

تینتیسواں بند:

ہو نہ یہ پھول ، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھرے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

معانی:

ترنم: گنگناہٹ، گانا، گیت۔ چمن دہر: دنیا کا باغ۔ تبسم: مسکراہٹ۔ ساقی: شراب پلانے والا۔ مے: شراب۔ شراب۔ خم: شراب کا مٹکا۔ بزم توحید: خدا کو ایک ماننے والوں کی مجلس۔ افلاک: فلک کی جمع آسمان، استادہ: کھڑا، قائم۔ نبض ہستی: زندگی کی نبض، تپش آمادہ: گرمی کی طرف مائل، یہاں مراد۔ ہے تحرک۔

تشریح:

یہاں سے نعت شروع ہوتی ہے حضور ﷺ کی محبت میں سرشار ہو کر علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! یاد رکھو! دنیا میں اگر حضور ﷺ جیسا پھول نہ ہو تو بلبل گیت گانا چھوڑ دے اور دنیا کے باغ میں کلیوں

کی مسکراہٹ بھی نہ رہے اگر حضور پاکؐ جیسا ساقی نہ ہوتو پھر شراب توحید رہے اور نہ اس شراب کے مٹکے رہیں۔ دنیا، خدا کو ایک ماننے والے بندوں سے خالی ہو جائے اور تمہارا وجود بھی بے معنی ہو کر رہ جائے۔ حقیقت میں آسمانوں کا خیمہ، جس پاک نام کی برکت سے اب تک کھڑا ہے وہ انہی کا نام ہے اور زندگی کی نبض اگر تمہیں چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، تو وہ بھی آنحضرت ﷺ کے بابرکت نام کی بدولت ہے۔ ان نعتیہ اشعار میں اس حقیقت کا اعتراف کیا جارہا ہے کہ یہ کائنات حضور ﷺ کے لئے بنائی گئی اور انہی کے وجود کی برکت سے اب تک قائم ہے زندگی کی نبض میں گرمی اور جان انہی کی بدولت ہے اور انہی کا نام ہے جو کائنات کے رگ و پے میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔

چونتیسواں بند:

دشت میں، دامن کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمانؐ کے ایمان میں ہے
چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ، دیکھے

معانی:

دشت: صحرا، جنگل۔ دامن کہسار: پہاڑ کی وادی، بحر: سمندر، موج: لہر۔ آغوش: گود، بیابان: ویرانہ۔ چشم اقوام: قوموں کی آنکھ۔ ابد تک: قیامت تک، رفعت: بلندی، رفعنا لک ذکرک: سورۃ الم نشرح کی آیت کا ٹکڑا اس کا مطلب ہے کہ اے پیغمبرؐ! ہم نے تیرا ذکر بلند کر دیا۔

تشریح:

خدا کہتا ہے کہ جس پاک ہستی کا اب ذکر کیا جارہا ہے یعنی حضرت محمد ﷺ وہ کہاں نہیں ہیں؟ اس ذات پاک کے جلوے صحراؤں میں ہیں۔ پہاڑوں کی وادیوں میں ہیں، میدانوں میں ہیں۔ اسکا جلوہ و جلال سمندر میں ہے۔ لہروں میں ہے، طوفان میں ہے غرضیکہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ کیونکہ دنیا کا کوئی گوشہ اس کے

چاہنے والوں سے خالی نہیں ہے چین کے گنجان آباد شہروں سے لے کر مراکش کے ویرانوں تک ہر جگہ اس کا ذکر پاک ہوتا ہے مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ حضورؐ کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز نہ رکھے۔ ہم نے قرآن میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اے پیغمبر ہم نے تیرا ذکر بلند کر دیا چنانچہ جب تک یہ دنیا قائم ہے، تو میں خود اپنی آنکھ سے دیکھیں گی کہ ہمارا قول کتنا سچا ہے انشاء اللہ آپ کا نام تا قیامت اسی طرح بلند رہے گا۔

پینتیسواں بند:

مردمِ چشم زمین ، یعنی وہ کالی دنیا
وہ تمہارے شہداء پالنے والی دنیا
گرمئ مہر کی پروردہ ، ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے، آنکھ کے تارے کی طرح

معانی:

مردم چشم: آنکھ کی پتلی جو سیاہ ہوتی ہے۔ کالی دنیا: مراد ہے افریقہ (بالخصوص حبشہ) شہدا: شہید کی جمع، شہدا پالنے والی دنیا: اشارہ ہے ابتدائی دور کے مسلمانوں کی ہجرت حبشہ کی طرف، جب وہ کفار مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آ کر نجاشی کے دربار میں پہنچے تھے اور اس سے پناہ طلب کی تھی۔ گرمی مہر: سورج کی تپش۔ پروردہ: پالی ہوئی گرمی مہر کی پروردہ سے مراد ہے کہ وہاں گرمی شدید پڑتی ہے ہلالی دنیا: وہ علاقہ جہاں ہلالی پرچم (چاند کا نشان رکھنے والا) لہرا رہا ہے۔ بلالی دنیا: حضرت بلال کے آباء کا وطن۔ تپش اندوز: تپش حاصل کرنے والی، اپنے اندر گرمی جذب کرنے والی: غوطہ زن: ڈبکی لگانے والی۔

تشریح:

حضرت بلالؓ کی وجہ سے ملک حبشہ (جو افریقہ میں واقع ہے) کو جو عزت ملی ہے اس بند میں اس کا ذکر کیا گیا ہے خدا کہتا ہے کہ یہ سیاہ فام لوگوں کے رہنے کی جگہ (افریقہ آنکھ کی سیاہ پتلی کی طرح ہے، یعنی جس طرح آنکھ کی پتلی کی مدد سے انسان دیکھ سکتا ہے اسی طرح افریقہ کی سیاہ فام آبادی تبلیغ اسلام کی بدولت، اسلام کے نور سے روشن ہوتی جاتی ہے اور صاحب بصیرت لوگوں کا مسکن بنی ہوئی ہے یہی وجہ ہے جہاں مسلمانوں نے کفار مکہ کے ظلم وستم سے عاجز آکر پناہ طلب کی تھی اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے انہیں نہایت عزت واحترام سے اپنے ملک مین جگہ دی تھی ان ہجرت کرنیوالوں میں سے کئی بعد کے غزوات میں اللہ کی راہ میں شہید ہوئے مثلاً حضرت جعفر طیارؓ وغیرہ اس لئے حبشہ کو بھی بجا طور پر شہیدوں کو خوش آمدید کہنے والی سرزمین کہا جا سکتا ہے اسے سورج کی گرمی نے پالا ہے اور اس کی فضاؤں میں اسلام کا ہلالی پرچم لہلہاتا ہے دین کے عاشقوں نے حضرت بلالؓ کا وطن ہونے کی وجہ سے اس کا نام بلالی دنیا رکھ دیا ہے۔ یہ دنیا بھی حضورؐ کے پاک نام کی وجہ سے پارے کی طرح متحرک اور بے قرار ہے اور انہی کے بابرکت نام کے طفیل آنکھ کے تارے کی طرح نور کے دریا میں غوطے لگا رہی ہے مراد یہ ہے کہ گرمی سے تپتی ہوئی اس دنیا میں بھی حضرت محمد ﷺ کے نام لیوا موجود ہیں اور اس تاریک براعظم کے دور دراز گوشوں میں بھی حضورؐ کا نام بلند ہو رہا ہے۔ یہ لوگ حضورؐ کی سیرت مقدسہ سے حرارت ایمان حاصل کرتے ہیں اور اسلام پھیلانے کیلئے پارے کی طرح بے قرار رہتے ہیں یوں وہ خود بھی نور ایمان سے اپنے دل منور کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی تاریکیوں میں روشنی دکھاتے ہیں اس بند میں حضرت بلالؓ کے عشق رسولؐ کی طرف بھی اشارہ ہے۔

چھتیسواں بند:

عقل ہے تیری سپر ، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہاں گیر تری
ماسوائے اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا ، لوح و قلم تیرے ہیں

معانی:

سپر: ڈھال۔ شمشیر: تلوار۔ خلافت: حکومت، جو اللہ کے احکامات کے ماتحت کی جائے، جہاں گیر: سارے زمانے پر چھائی ہوئی ماسوائے: اللہ کے سوا۔ تکبیر: خدا کی بڑائی۔ تقدیر: مقدر قسمت، تدبیر۔ کوشش، سوچ بچار۔ لوح و قلم: تختی اور قلم، لوح تقدیر، جس پر انسانی مقدر لکھ دیا گیا ہے یہاں مراد ہے ساری کائنات۔

تشریح:

اس آخری بند میں مسلمانوں کو ان کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کرتے ہوئے حضور اکرمؐ سے عشق برقرار رکھنے اور ان کی تعلیمات پر سچے دل سے عمل کرنے کا سبق دیا گیا ہے خدا کہتا ہے کہ اے مسلمان! تجھے دونوں خوبیوں سے نوازا گیا ہے تیرے پاس عشق کی طاقت بھی ہے اور عقل کی دولت بھی ہے۔ عقل تیری ڈھال ہے اور عشق تیری تلوار ہے۔ اس عشق سے کام لیکر تو دنیا کو تسخیر کر سکتا ہے اور عشق کی مدد سے راہ کی مشکلات کو دور کر سکتا ہے تیرا مقصد زندگی یہ ہونا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام دنیا میں بلند ہو۔ اے اللہ کے درویش! اگر تو نے اسلام پر عمل کیا تو تیری حکومت سارے جہان پر چھا جائے گی۔ اگر تیرا ایمان پختہ ہوا تو ذات باری کے سوا جو کچھ بھی دنیا میں موجود ہے اسے تیرا نعرہ تکبیر آگ کی طرح جلا کر راکھ کر دے گا، زر، زن اور زمین جیسی دنیاوی چیزیں

تیرے رستے میں حائل نہیں ہونگی اور نہ تجھے خدا کی یاد سے غافل کریں گی اگر تو سچا مسلمان بن گیا تو تیری تدبیر ہی خدا کی تقدیر بن جائے گی۔ تو جو کچھ چاہے گا۔ وہی تجھے ملے گا۔ تو اپنی قسمت کا آپ مالک بن جائے گا اگر تو نے حضرت محمد ﷺ سے وفاداری کا حق ادا کیا ان کی سچے دل سے اطاعت کی اور ان کی تعلیمات پر خود بھی عمل کیا اور دوسروں کو بھی ان پر عمل کرنے کی تلقین کی تو یقین رکھ اس ایک دنیا کی کیا حقیقت ہے؟ تجھے ساری کائنات کا مالک بنا دیا جائے گا۔

۴.۲۔ نظم پر تبصرہ

عزیز طالب علمو! نظم ''جواب شکوہ'' کی اس تشریح سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ علامہ اقبال نے ''شکوہ'' کے اعتراضات کا جواب کس خوبصورتی سے خدا کی زبان سے دیا ہے کس طرح ملت اسلامیہ کے زوال کے حقیقی اسباب گنوائے ہیں اور کس طرح انہیں دور کرنے کے لئے مناسب لائحہ عمل تجویز کیا ہے ''جواب شکوہ'' بھی علامہ اقبال کی اکثر نظموں کی طرح دور حاضر کے مسلمانوں کو عمل کی دعوت دیتی ہے اور اپنی کمزوریوں کے ساتھ ان کا علاج کرنے کی تلقین بھی کرتی ہے ''شکوہ'' میں شاعر نے مسلمانوں کی عام پستی اور بدحالی کا رونا رویا تھا اور خدا سے گلہ کیا تھا کہ اس نے اپنے نام لیواؤں کو ذلیل کر رکھا ہے۔ حالانکہ انہوں نے خدا کے دین کے فروغ کی خاطر ہر طرح کی سختیاں برداشت کیں۔ گھر سے بے گھر ہوئے۔ خشکیوں، بیابانوں صحراؤں اور سمندروں میں جنگیں لڑیں اور خدا کے پیغام کو زمین کے آخری کونے تک پہنچایا۔ شاعر کو اس بات کا بھی رنج تھا کہ مسلمان قوم تو افلاس اور ناداری کے گڑھے میں گری ہوئی ہے اور غیر مسلم اقوام زندگی کے مزے لوٹ رہی ہے۔ ''جواب شکوہ'' میں خدا نے ان تمام گلوں شکووں کا جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ تمام کارنامے جو ایک ایک کر کے ''شکوہ'' میں گنوائے گئے ہیں اور موجودہ دور کے مسلمانوں نے اپنے نام منسوب کر لئے ہیں دراصل ان کے آباؤ اجداد کے جوش جہاد کا نتیجہ تھے۔ ان معرکوں سے دورِ حاضر کے نام نہاد مسلمانوں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کے اسلاف نے اسلامی تعلیمات پر عمل کیا تھا اسی لئے وہ لڑائیوں میں بھی فتح یاب ہوئے اور دنیوی مال و دولت اور حاکمانہ شان و شوکت سے بھی نوازے گئے لیکن آج کے مسلمان اپنے بزرگوں کی [illegible] بندگی کے طور طریقوں کو

بھول چکے ہیں انہوں نے قرآنی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے اور غیر مسلم اقوام کی تہذیب وتمدن کی نقالی شروع کردی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ نہ دین کے رہے ہیں نہ دنیا کے اسی لئے وہ خدا کی نگاہوں سے بھی گر گئے ہیں اور دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوئے تاہم اگر وہ دوبارہ عظمت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اللہ کی رحمت کے دروازے ان پر بند نہیں ہوئے اگر آج بھی مسلمان ذات برادری اور رنگ ونسل کی پابندی سے باہر نکل آئیں اور خود کو ایک واحد امت کے طور پر متحد ومنظم کریں اور خدا اور رسول کی محبت اپنے دل میں بسا کر جدو جہد کریں تو وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو(۱) ہو سکتے ہیں۔

یوں ''جواب شکوہ'' میں علامہ اقبال نے دور حاضر کے مسلمانوں کو اپنا احتساب کرنے کی ترغیب دی ہے اور انہیں بتایا ہے کہ اسلام پر چلنے میں ہی ان کی نجات ہے انہوں نے مسلمانوں کی غیرت ابھار کر اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے، مغربی تہذیب کی تقلید ترک کرنے اور اسلامی تہذیب کی طرف لوٹنے کی دعوت دی ہے۔ انہیں جذبہ ایمان، عشق رسولؐ حق وصداقت، شرم وحیا، عدالت وشجاعت، نیکی وپارسائی اور اخلاق وکردار کا پیغام دیا ہے، انہیں ذات پات، رنگ ونسل اور مذہبی، معاشی اور سماجی گروہ بندیاں چھوڑنے اور باہمی اتحاد، اتفاق اور محبت و اخوت(۲) کے ساتھ رہنے کی تلقین کی ہے نظم کے آخر میں انہیں بہتر مستقبل کی خوشخبری بھی دی ہے اور گذشتہ مسلمانوں کی پوشیدہ خوبیوں کا ذکر کر کے انہیں جدو جہد کرنے پر بھی ابھارا ہے مختصراً ''جواب شکوہ'' ملت اسلامیہ کے لئے اعلیٰ پائے کی دعوت فکر ونظر اور تحریک عمل ہے اور اس کے ذریعے سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے اور ان میں صحیح اسلامی روح پھونکنے کا کام لیا گیا ہے۔

---

(۱) کامیاب (۲) بھائی چارہ

خودآزمائی کے سوالات

عزیز طلباء وطالبات! آپ نے نظم "جواب شکوہ" کے نفس مضمون، فکری پس منظر ور مرکزی خیال سے واقفیت حاصل کرلی ہے اس کے منتخب بندوں کی تشریح سے پوری نظم کی فکری کائنات تک آپ کی رسائی ہو چکی ہے آیئے اب آپ اپنا امتحان لیں اور دیکھیں کہ آپ نے "جواب شکوہ" کے مفہوم و مدعا کو کس حد تک سمجھا ہے؟

۳۔خود آزمائی

۱۔ ان سوالوں کے جواب لکھیے۔

۱۔ ''جوابِ شکوہ'' میں مخاطب کون ہے؟

۲۔ ''جوابِ شکوہ'' میں کس نے خطاب کیا ہے؟

۳۔ ''جوابِ شکوہ'' کس نظم کے جواب میں لکھی گئی ہے؟

۴۔ ''شکوہ'' میں مسلمانوں کی پستی کا ذمہ دار کسے ٹھہرایا گیا تھا؟

۵۔ ''جوابِ شکوہ'' میں مسلمانوں کے زوال کا سبب کسے ٹھہرایا گیا؟

۶۔ ''جوابِ شکوہ'' کب لکھی گئی؟

۷۔ اس نظم کے لکھنے کا بڑا محرک کیا تھا؟

۸۔ ملّتِ اسلامیہ کے زوال کے بڑے بڑے اسباب کیا ہیں؟

۹۔ زوال کے یہ اسباب کس طرح دور کیے جا سکتے ہیں؟

۱۰۔ زوال کے ان اسباب کو کن چیزوں نے تیز تر کیا؟

۲۔ مندرجہ ذیل میں صرف صحیح فقرات پر نشان (✓) لگائیے۔

۱۔ ''جوابِ شکوہ'' میں کوئی تاریخی حوالہ نہیں آتا۔

۲۔ ''جوابِ شکوہ'' کا خاتمہ امید پر ہوتا ہے۔

۳۔ اقبال نے مسلمانوں کے لئے عقل اور عشق کو لازمی قرار دیا ہے۔

۴۔ خدا سے شکایت کرتے وقت انسان کا رویہ گستاخانہ نہیں تھا۔

۵۔ ''جوابِ شکوہ'' کے ذریعے اقبال نے مسلمانوں کو دعوتِ عمل دی ہے۔

۳۔ دیئے ہوئے الفاظ میں سے صحیح لفظ منتخب کر کے خالی جگہ پر کیجئے۔

۱۔ ''جوابِ شکوہ'' کا آخری حصہ............ پر مشتمل ہے۔ (نعتیہ، حمدیہ، مدحیہ)

۲۔ اقبال کی شاعری میں .... ہے۔ (مایوسی، رجائیت، توہم پرستی)

۳۔ ''جوابِ شکوہ'' میں اقبال نے ملّتِ اسلامیہ کے زوال کے .... اسباب گنوائے ہیں۔

(فرضی، حقیقی، ادھورے)

۴۔ "جواب شکوہ" کے آخری بند میں..................سے وفاداری کا درس دیا گیا ہے
(خدا سے، مالک سے، حضرت محمدؐ سے)

۵۔ اقبال نے "جواب شکوہ" میں..................کو بلالی دنیا قرار دیا ہے۔
(امریکہ، افریقہ، ہندوستان)

۴۔ جوابات

۱۔ (۱) موجودہ دور کے بے عمل مسلمان (۲) خدا نے (۳) شکوہ کے جواب میں جو انہوں نے دو سال پہلے لکھی تھی۔ (۴) خدا کو (۵) خود مسلمان کو (۶) ۱۹۱۳ء میں

(۷) ملت اسلامیہ کا زوال (۸) بے عملی، تقدیر پرستی، بے حسی انتشار، قومی نااتفاقی، مذہبی تعصب، ذات برادری اور نسل و رنگ کی بناء پر گروہ بندی، مغربی تہذیب و تمدن اور نظریہ وطنیت کی پیروی، معاشی اور طبقاتی ناہمواری اور غربت و افلاس وغیرہ (۹) عقیدۂ توحید و رسالت پر صحیح عمل کرنے سے، جذبہ اخوت بیدار کرنے سے، جوش جہاد سے، قومی اتحاد پیدا کرنے سے، صحیح نصب العین پیش نظر رکھنے سے اور اسلامی تہذیب اختیار کرنے سے

(۱۰) مغربی اقوام کی سامراجی حکمتِ عملی نے، ان کی ہوس ملک گیری نے، کمزور اقوام کو غلام بنانے کی کوششوں نے۔

۲۔ صحیح فقرے (۲)، (۳)، (۵)

۳۔ (۱) نعتیہ اشعار (۲) رجائیت (۳) حقیقی (۴) حضرت محمد ﷺ

(۵) افریقہ

یونٹ......۱۶

غزلیاتِ اقبال

تحریر:
نظیر صدیقی

فہرست

	تعارف	518
	مقاصد	518
ا۔	اردو شاعری میں اقبال کی غزلوں کی اہمیت	519
۲۔	تشریحات	524
۲.۱۔	غزل نمبر ا	524
۲.۲۔	غزل نمبر ۲	526
۲.۳۔	غزل نمبر ۳	531
۲.۴۔	غزل نمبر ۴	535
۲.۵۔	غزل نمبر ۵	539
۳۔	خود آزمائی	543
۴۔	جوابات	546

تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

اس یونٹ میں آپ علامہ اقبال کی پانچ غزلوں کا مطالعہ کریں گے۔ان غزلوں کے مطالعے سے آپ کو پتہ چلے گا کہ علامہ اقبال کی غزلیں دوسرے اردو شعراء کی غزلوں سے کس طرح مختلف اور ممتاز ہیں، اور کیا نیا پن لئے ہوئے ہیں۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ کو اس قابل ہونا چاہیے کہ:

۱۔ اردو غزل میں اقبال کی اہمیت واضح کر سکیں۔

۲۔ اردو غزل میں اقبال کی غزلوں کے ذریعے سے جس نئے رنگ کا اضافہ ہوا، اس پر بحث کر سکیں۔

۳۔ اقبال کی غزلوں کے اشعار کی تشریح کر سکیں۔

ا۔ اردو شاعری میں اقبال کی غزلوں کی اہمیت

جس طرح نثری ادب کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً داستان، ناول، مختصر افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ وغیرہ اسی طرح شاعری کی بھی مختلف قسمیں یا صنفیں ہوتی ہیں مثلاً قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ۔ یوں تو ہر شاعر شاعری کی کئی قسموں کو اختیار کرتا ہے لیکن عام طور پر اس کی شہرت اور اسکا کمال شاعری کی کسی ایک صنف تک محدود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے۔ قصیدے میں سودا اور ذوق، غزل میں میر اور غالب، مثنوی میں میر حسن اور نسیم اور مرثیے میں انیس اور دبیر سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں اور سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔

عہدِ حاضر میں اردو شاعری کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ غزل اور نظم، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ بھی نظم ہی کی قسمیں ہیں لیکن پرانے زمانے میں نظم نگار کو صرف نظم نگار کہنے کی بجائے قصیدہ گو، مثنوی گو اور مرثیہ گو کہتے تھے۔ عہد حاضر کا اردو نظم نگار جو قصیدہ، مثنوی اور مرثیے وغیرہ کی شکلوں میں نظمیں نہیں کہتا بلکہ دوسری نئی شکلوں میں نظمیں کہتا ہے صرف نظم نگار کہلاتا ہے۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ غزل اور نظم کا بنیادی فرق کیا ہے۔ دراصل بنیادی فرق دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ نظم کسی ایک موضوع پر لکھی جاتی ہے جبکہ غزل کسی ایک موضوع پر نہیں لکھی جاتی۔ غزل میں ہر شعر کا موضوع الگ الگ ہوتا ہے البتہ غزلِ مسلسل کسی ایک موضوع پر ہوتی ہے لیکن اردو میں غزلِ مسلسل کم لکھی جاتی ہے۔

غزل اور نظم کا دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ غزل کی شکل ایک ہوتی ہے جبکہ نظم کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ اردو کے کئی شاعر صرف نظم نگاری کے لئے شہرت اور اہمیت رکھتے ہیں گو ان میں سے بیشتر نے غزلیں بھی کہی ہیں مثلاً نظیر اکبر آبادی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، اسرار الحق مجاز، میراجی، ن۔ م راشد وغیرہ۔ اسی طرح اردو کے کئی شاعر ایسے ہیں جو صرف غزل گوئی کے لئے شہرت اور اہمیت رکھتے ہیں گو ان میں سے بیشتر نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً فراق گھورکھپوری، ناصر کاظمی وغیرہ لیکن اردو میں کچھ شعراء ایسے بھی ہیں جن کا مرتبہ نظم و غزل دونوں میں بہت اونچا ہے۔ اقبال اردو کے ایسے ہی شاعروں میں سے ہیں۔ اقبال کے بعد ایسے شاعروں میں

جو نام آسانی سے ذہن میں آتا ہے وہ فیض احمد فیض کا ہے۔ اقبال اور فیض بیک وقت نہایت اعلیٰ درجے کے نظم نگار بھی ہیں اور غزل گو بھی۔

اردو کے شعراء عام طور پر غزل سے اپنی شاعری کا آغاز کرتے ہیں۔ اقبال نے بھی ایسا ہی کیا تھا جس زمانے میں اقبال نے شاعری شروع کی۔ رواج یہ تھا کہ شاعر اپنے زمانے کے کسی اچھے اور مشہور شاعر کا شاگرد ہو جاتا تھا تاکہ وہ اپنی غزلوں پر اصلاح لے سکے۔ چنانچہ اقبال اپنے زمانے کے سب سے مشہور اور مقبول شاعر داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے تھے۔ داغ نے بہت جلد یہ کہہ کر اقبال کو اصلاح سے فارغ کر دیا کہ اب آپ کے کلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ شروع شروع میں اقبال نے داغ ہی کے رنگ میں غزلیں کہیں مثلاً

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آواز اذاں سے

اقبال نہ صرف داغ دہلوی کی اصلاح سے جلد فارغ ہو گئے بلکہ انہوں نے داغ کے رنگ میں غزل کہنا بھی جلد ہی ترک کر دیا۔ قدرت کو اقبال سے کوئی اور ہی کام لینا منظور تھا۔ اقبال نظم و غزل دونوں میں اردو کے تمام شاعروں سے مختلف قسم کے شاعر ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی میں نظمیں بھی لکھنا شروع کیں۔ ان کی ابتدائی نظموں کا موضوع یا تو قدرت کے مناظر ہیں یا ملک و قوم کے مسائل۔ منظر نگاری سے متعلق اقبال کی ابتدائی نظموں میں بھی زندگی اور کائنات کے بارے میں فلسفیانہ سوالات ملتے ہیں۔ اقبال آگے چل کر فلسفی شاعر بنے۔ ان کی شاعری میں شروع ہی سے ملک و قوم کا درد موجود تھا اس وجہ سے وہ قومی اور اسلامی شاعر کی حیثیت سے بھی پہچانے گئے۔ انہیں اسلامی شاعر کہنے کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا اس کی بنیاد اسلام پر ہے۔

اقبال اردو کے دوسرے شاعروں سے خاص طور پر اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان کی شاعری ان کے ذاتی معاملات اور مسائل کی شاعری نہیں بلکہ قومی اور بین الاقوامی مسائل کی شاعری ہے چونکہ وہ مسلمان تھے اور اپنی قوم سے انہیں بچی محبت تھی۔ اس لئے وہ دنیا کے سارے مسلمانوں کی بدحالی اور غلامی سے پریشان تھے۔ پھر چونکہ وہ اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں سے بھی محبت رکھتے تھے اس لئے وہ تمام دنیا کے انسانوں کی بہتری کے بارے میں بھی فکرمند رہتے تھے۔ ان کی شاعری اگر ایک طرف اپنی قوم کے زوال کی تصویر ہے تو دوسری طرف تمام نوع انسانی کے حال زار کا بیان بھی لیکن ان کی شاعری رونے دھونے کی شاعری نہیں ہے۔ اس میں اپنی قوم اور نوع انسان دونوں کے لئے انقلاب و ارتقاء تبدیلی اور ترقی کا پیغام بھی ہے۔ ان کی شاعری میں مسائل کا ذکر بھی ہے اور مسائل کا حل بھی۔ ان کی شاعری محرومی اور مایوسی کی شاعری نہیں ہے بلکہ امید اور حوصلے کی شاعری ہے۔ ان کے شعر پڑھ کر دلوں میں حوصلہ اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اقبال اور اردو کے دوسرے شاعروں میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ جہاں اردو کے دوسرے شعر کا لہجہ مایوسانہ ہے وہاں اقبال کا لہجہ امید پر ہے۔

خیالات اور نظریات کے اعتبار سے اقبال کی پوری شاعری کی فضا ایک ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں بھی وہی باتیں کہتے نظر آتے ہیں جو انہوں نے اپنی نظموں میں لکھی ہیں۔ غزل کا سب سے محبوب موضوع عشق و محبت ہے اقبال کی غزلوں میں عشق و محبت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کے یہاں عشق کا ذکر ہے بھی تو وہ عشق اپنا ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔ اقبال کے یہاں عشق کا مطلب کسی بڑے مقصد سے گہرے لگاؤ کا نام ہے۔ انہی معنوں میں انہوں نے کہا ہے کہ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

غرضکہ اقبال کی شاعری یا غزلوں کا موضوع مرد و عورت کی رومانی محبت نہیں ہے۔

نہایت گہرے، سنجیدہ اور فلسفیانہ خیالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنانے کے باوجود ایک اچھے اور بڑے شاعر کی حیثیت سے اقبال نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ نظم اور غزل کی زبان اور انداز بیان یکساں نہ ہونے پائے۔

غزل نظم سے زیادہ نرم زبان چاہتی ہے۔ نظم کی زبان میں اگر شان وشوکت ہو تو اس سے نظم کو نقصان نہیں پہنچتا لیکن شان وشوکت والی زبان غزل کے لئے مناسب نہیں ہوتی۔ اقبال نے اپنی کئی غزلوں میں سادہ زبان اور نرم انداز بیان کی بجائے فارسی ترکیبوں سے سجی ہوئی رنگین زبان اور پرجوش انداز بیان اختیار کرنے کے باوجود غزل کے حسن اور دلکشی کو برقرار رکھا ہے۔ اقبال کی نظموں میں بھی غزلیت (غزل کا حسن) پائی جاتی ہے۔ اردو شاعری میں یہ عجیب بات ہے کہ اگر نظموں میں غزلیت آجائے تو نظمیں چمک اٹھتی ہیں لیکن اگر غزلوں میں نظمیت (نظم کا انداز بیاں اور نظم کا حسن) آجائے تو غزلیں پھیکی پڑ جاتی ہیں۔

اقبال کی نظموں کی طرح ان کی غزلیں بھی اردو کے دوسرے شاعروں کی غزلوں سے بہت مختلف ہیں۔ ایک تو موضوع کے اعتبار سے دوسرے زبان و بیان کے اعتبار سے، تیسرے لہجے کے اعتبار سے۔

موضوع کے اعتبار سے اردو غزلوں کے عام موضوعات حسن وعشق سے متعلق مضامین، ذاتی زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں کا بیان، اپنے معاشرے اور ماحول کی خرابیاں، فلسفہ وتصوف سے تعلق رکھنے والے چند مسائل، انسانی فطرت کی نزاکتیں اور پیچیدگیاں وغیرہ ہیں۔

ان کے برعکس اقبال کی غزلوں کا موضوع یا تو ان کا خاص فلسفہ زندگی اور اس فلسفے سے تعلق رکھنے والے اجزاء مثلاً خودی، عشق، عقل، عمل، فقر، تقدیر، شاہین وغیرہ سے متعلق خیالات ہیں یا قوموں کے عروج و زوال، مشرق ومغرب کے فرق، قومی اور بین الاقوامی حالات پر تبصرے، تاریخ اسلام اور تاریخ انسانی پر تنقید، فلسفہ وحکمت کے متعلق باریک باتیں غرض کہ موضوعات کے اعتبار سے اقبال کی غزلوں کی دنیا اردو کے دوسرے شعراء کی دنیا سے بڑی حد تک مختلف ہے۔

اسی طرح غزلوں میں جس زبان و بیان سے اقبال نے کام لیا ہے وہ بھی دوسرے غزل گو شاعروں کی زبان و بیان سے مختلف ہے۔ ایسا ہونا ضروری بھی تھا اور فطری بھی ہے کیونکہ زبان اور انداز بیاں موضوعات اور خیالات کے مطابق اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ہلکی پھلکی باتوں کے لئے ہلکا پھلکا اور سیدھا سادھا انداز بیاں مناسب ہوتا ہے۔ گہرے خیالات ونظریات کے لئے زبان و بیاں میں وہ تبدیلیاں لانی پڑتی ہیں جو غالب اور اقبال لائے۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے غالب، اقبال اور دوسرے شاعروں کا مطالعہ ضروری ہے۔ زبان

کے معاملے میں اقبال کا ایک انقلابی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بعض پرانے الفاظ کے معنی بدل دیے جیسے خودی، بیخودی اور عشق وغیرہ اور کئی جگہ نئے الفاظ یا نئی علامتوں سے کام لیا مثلاً شاہین، لالہ وغیرہ۔ اقبال کی غزلوں کا لہجہ بھی اردو کے دوسرے تمام شاعروں کے لہجے سے مختلف ہے۔ عام طور پر اردو غزل کے لہجے میں افسردگی اور مایوسی پائی جاتی ہے جس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے کہ اردو غزل میں زیادہ تر افسردگی اور مایوسی کے مضامین ہوتے ہیں، زندگی اور زمانے کے ظلم وستم کا ذکر ہوتا ہے قدرت یا قسمت کی ستم ظریفیوں (ہنسی ہنسی میں ظلم ہونا کے شکوے ہوتے ہیں لیکن اقبال کی غزلوں کا لہجہ وہی ہے جو امید اور حوصلے کی باتوں میں ہوتا ہے۔ جس طرح آدمی کے لہجے سے پہچانا جاتا ہے کہ آدمی خوش ہے یا غمگین۔ اسی طرح شعر کے لفظوں اور لفظوں کی آوازوں سے سمجھا جاسکتا ہے کہ کس شاعر کا لہجہ کیسا ہے۔ عام طور پر اردو شاعروں کے لہجے میں یاسیت پرستی پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اقبال کے لہجے میں رجائیت (امید پسندی) ملتی ہے ان کے لہجے میں اُمنگ اور ترنگ (موج، لہر، جوش) کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کے مصائب اور مشکلات کا احساس ضرور ملتا ہے لیکن مصائب اور مشکلات کی طرف ان کا رویہ فاتحانہ اور مجاہدانہ ہے۔ ان کی شاعری شکست خوردہ انسان کی شاعری نہیں ہے غرض کہ اقبال کی غزلوں کے ذریعے اردو غزل ایک نئے رنگ سے آشنا ہوتی ہے۔

اب آیئے ان کی چند غزلوں کا مطالعہ کریں اور ان میں ان خصوصیات اور خوبیوں کو پہچانیں جن کا ذکر ابھی کیا گیا اقبال کی یہ غزلیں "بانگِ درا" سے لی گئی ہیں۔

۲۔تشریحات

۲.۱۔غزل نمبرا

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستیٔ ناپائدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ
کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہ گزر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

پہلا شعر: گلزار	:	باغ
گلزار ہست و بود	:	دنیا
بیگانہ وار	:	غیر کی طرح، اجنبی کی طرح
بیگانہ وار دیکھنا	:	بے دلی سے دیکھنا

اقبال دنیا کے بارے میں کہتے ہیں کہ دنیا کے باغ کو بے دلی سے نہ دیکھو۔ دنیا کو باغ سے تشبیہ دیکر اس کے حسن و رنگ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہ حسین و رنگین دنیا دیکھنے کی چیز ہے اسے بار بار دیکھ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون ہے جو دنیا کو نہیں دیکھتا اور جب سبھی لوگ دنیا کو دیکھتے ہیں یعنی اس سے دلچسپی لیتے ہیں تو پھر اقبال کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے کہ اے لوگو! دنیا کو بے دلی سے نہ دیکھو۔ اسے غور سے دیکھو اور بار بار دیکھو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب اور تصوف کے اثر سے اہلِ مشرق میں دنیا

کو حقارت اور نفرت سے دیکھنے کا رُجحان پیدا ہو گیا۔ ہمارے یہاں ایک تاثر یہ ہے کہ دنیا بری چیز ہے اس سے دل نہیں لگانا چاہیے لیکن اقبال ان لوگوں میں سے تھے۔ جو مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ترک دنیا کے رُجحان کو غلط سمجھتے تھے۔ سچا اسلام رہبانیت (ترک دنیا) نہیں سکھاتا۔ دنیا انسان کے لئے ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ نعمت انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اسے ٹھکرانا اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر آدمی دنیا کی حسین ورنگین چیزوں کو غور سے دیکھے تو اس پر خدا کی حکمت اور قدرت روشن ہوتی ہے اور اس طرح وہ خدا سے قریب تر ہو جاتا ہے۔

دوسرا شعر:

شرار	:	چنگاری، شرر
مثل شرار	:	چنگاری کی مانند
دم دے جانا	:	فریب دے جانا، دھوکا دے جانا
ناپائدار	:	کمزور، جو مضبوط نہ ہو

شاعر انسان سے کہتا ہے کہ تو دنیا میں چنگاری کی مانند آیا ہے یعنی چنگاری کی مانند تیری زندگی بھی مختصر اور اچانک ختم ہو جانے والی ہے۔ اس لئے ایسی ناپائیدار اور غیر یقینی زندگی پر بھروسا نہ کرو ورنہ ممکن ہے یہ زندگی تجھے دھوکہ دے جائے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جو کچھ کرنا ہے جلد سے جلد کر لے۔ یہ نہ سوچ کہ ابھی بہت وقت ہے اور ابھی عمر ہی کیا ہے۔ عمر کچھ بھی ہو زندگی کی چنگاری کسی وقت بھی بجھ سکتی ہے۔

تیسرا شعر:

دید	:	دیدار، دیکھنا
شوق	:	عشق

شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ اگرچہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تو مجھے دیکھے لیکن مجھے تجھ سے جو محبت ہے اور اس محبت کی بناء پر میں جس شدت سے تیرا انتظار کر رہا ہوں وہ یقیناً تیرے دیکھنے کے لائق ہے۔

چوتھا شعر:

ذوقِ دید	:	دیکھنے کا شوق
رہگزر	:	راستہ، سڑک
نقش کف پائے یار	:	محبوب کے پاؤں کے تلوے کے نشان

شاعر کہتا ہے کہ اگر ذوق دید نے تیری آنکھیں کھولی ہیں تو تجھے چاہیے کہ دنیا کے ہر راستے میں محبوب کے پاؤں کے تلوے کا نشان دیکھے یعنی صحیح معنوں میں دیکھنے کی چیز ایک ہی ہے محبوب کا نقش پا۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا بہترین مصرف محبوب کی تلاش اور اس کا دیدار ہے لہٰذا اگر آدمی کے پاس آنکھیں ہوں تو وہ محبوب کو اس نقش پا کی مدد سے ڈھونڈے۔

اس شعر کو اگر عشق حقیقی کی روشنی میں دیکھا جائے تو شعر کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ انسانی زندگی کا بہترین مصرف خدا کی تلاش ہے۔

اقبال کی یہ غزل ان کی ابتدائی غزلوں میں سے ہے۔ اسی لئے اس میں نہ تو اقبال کے خاص مضامین ہیں نہ ان کا خاص انداز بیاں۔ زیادہ سے زیادہ پہلے شعر میں اس اقبال کی جھلک ملتی ہے جو ترکِ دنیا کے مخالف ہیں اور جو ترکِ دنیا کے رجحان کو مذہب اور تصوف کا غلط اثر قرار دیتے ہیں۔

۲.۲۔ غزل نمبر ۲

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ! کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

لطفِ کلام کیا جو نہ ہو دل میں دردِ عشق
بسمل نہیں ہے تو، تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

پہلا شعر: صحرا : جنگل، دشت

نظارہ : دیدار، جلوہ، دیکھنا

ہوس : خواہش، خبط، جنون، لالچ، حرص

مجنوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ لیلیٰ کے عشق میں جنگل جنگل مارا پھرتا تھا گویا اس نے شہر چھوڑ دیا تھا اور صحرا کو اپنا گھر بنا لیا تھا اقبال کہتے ہیں کہ مجنوں نے تو صرف شہر کو خیر باد کہہ دیا تھا تو صحرا کو بھی خیر باد کہہ دے اور اگر تیرے دل میں لیلیٰ کا جلوہ دیکھنے کی آرزو حد سے گذر چکی ہے تو خود لیلیٰ کو بھی چھوڑ دے۔ یہاں یہ بات بڑی عجیب ہی نہیں بے معنی سی ہو جاتی ہے۔ دراصل اقبال کا مطلب یہ ہے کہ عشق اپنے کمال کو پہنچے گا تو لیلیٰ کا جلوہ لیلیٰ کے بغیر بھی تجھے اپنی خلوتوں (تنہائیوں) میں جو شہر اور جنگل دونوں سے الگ ہوں گی۔ میسر آنے لگے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تو اپنے عشق میں پختگی پیدا کرے۔

دوسرا شعر: واعظ : واعظ کرنے والا، منبر یا اسٹیج سے مذہبی تقریر کرنے والا

یاں : یاں، یہاں پرانی زبان ہے یہ لفظ عموماً شاعری میں استعمال کیا جاتا ہے

کمال ترک : ترک کو کمال تک پہنچا دینا یہاں تک کہ ترک کرنے کے لئے کچھ باقی نہ رہے

مراد : مقصد، مدعا، مطلب

عقبیٰ : آخرت، مرنے کے بعد کی دنیا

واعظ اردو شاعری کا ایک دلچسپ کردار ہے، یہ کردار دو چیزوں کی علامت ہے ظاہر داری یا ریا کاری اور جنت کے لالچ میں خود غرضانہ عبادت کی علامت ہے واعظ جتنی اچھی باتوں کی تعلیم و تلقین دوسروں کو کرتا ہے اتنی باتوں پر خود عمل نہیں کرتا۔ یہ اس کی ظاہر کاری اور ریا کاری ہوئی۔ ریاکاری نام ہے دو رنگی کا یعنی ظاہر میں کچھ، باطن میں کچھ۔

واعظ کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ اس کی عبادت بے غرض اور پر خلوص نہیں ہوتی۔ خدا کی پرستش جنت اور اس کی نعمتوں کے لئے نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن واعظ کی نظر حور و جنت پر رہا کرتی ہے واعظوں میں اچھے لوگ

بھی ہوتے ہیں۔لیکن چونکہ ان کی اکثریت مذکورہ بالا کمزوریوں کا شکار ہے اس لئے فارسی اور اردو شاعری میں واعظ یا واعظوں کے طبقے پر نکتہ چینی ہوتی رہی ہے۔

اقبال واعظ کے اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے واعظ! دنیا میں مراد اس وقت پوری ہوتی ہے جب آدمی پورے طور پر مراد کو ترک کر دیتا ہے۔تو نے اپنی مراد کے لئے دنیا چھوڑ دی ہے اب عقبیٰ بھی چھوڑ دے۔جب تیری عبادت بے لوث (بے غرض) ہوگی تو تجھے جنت بھی مل جائے گی اور جنت کی ساری نعمتیں بھی۔لیکن جب تک تو ان چیزوں کے لالچ میں سجدہ ریزی (سجدہ کرنا) اور جبیں سائی (پیشانی گھسنا) کرتا رہے گا تجھے کچھ حاصل نہ ہوگا۔آخرت کا انعام ان لوگوں کیلئے ہے جو کمال ترک کا ثبوت دیتے ہیں۔

تیسرا شعر: تقلید : پیروی، نقل، کسی کے قدم بہ قدم چلنا

روش : طرز، طور، طریق

خضر : ایک پیغمبر جو روایت کے مطابق بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں، مراد راہنما ہے۔

سودا : عشق، خیال، دھن

اخلاقی خوبیوں میں کسی کی پیروی کرنا برا نہیں، لیکن کسی فن یا ہنر میں دوسروں کی نقالی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ نقالی کرنے والا اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر بیٹھتا ہے۔اس لئے اقبال بھی کہتے ہیں کہ تقلید کے راستے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی خودکشی کرے کیونکہ تقلید بھی ایک قسم کی ذہنی خودکشی ہے جو جسمانی خودکشی سے بھی بدتر ہوتی ہے جس آدمی کے اندر کوئی جوہر ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے جوہر کو کمال تک پہنچانے کا راستہ خود ڈھونڈ لے اور اس معاملے میں کسی راہ نما کے نقش قدم پر چلنے کا خیال ترک کر دے۔اپنا راہ نما خود کسی ہنر میں جتنا نیاپن ہوگا وہ اتنا ہی اہم سمجھا جائے گا۔جو ہنر دوسروں کے ہنر سے جتنا ملتا جلتا ہوگا۔اس کی قدر و قیمت اتنی ہی کم ہوگی۔اس لئے دوسروں کی تقلید نہ کرو۔

چوتھا شعر: لطف کلام : شعر کا مزا

بسمل : گھائل، زخمی یعنی عاشق مراد تڑپنے والا، بے قرار

اس شعر میں اقبال فن شعر (شاعری کا فن) کے بارے میں ایک اہم نکتہ بیان کر رہے ہیں، شاعری میں اگر لذت اور تاثیر نہ ہو تو شاعری بیکار ہے۔

لیکن شعر میں لطف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شعر کہنے والے کے دل میں عشق کا درد ہو، خواہ وہ عشق خدا سے ہو یا انسانی محبوب یا قوم سے یا انسانیت (نوع انسان) سے جھوٹ موٹ کا عاشق بن کر کوئی شاعر اپنے کلام میں لذت اور تاثیر پیدا نہیں کر سکتا۔ جھوٹے عاشقوں سے اقبال کہتے ہیں کہ تم اگر سچ مچ عشق کے زخمی نہیں ہو تو شاعری میں جھوٹ موٹ کی تڑپ اور بے قراری کا اظہار ترک کر دو۔ سچی اور اچھی شاعری سچے تجربے سے پیدا ہوتی ہے۔ شاعر کی ذات میں اگر سچائی نہیں ہے تو شعر بھی جھوٹے ہونگے اور جھوٹے شعروں میں کوئی لطف نہیں ہو سکتا۔

پانچواں شعر: سوداگری : کاروبار

جزا : صلہ، بدلہ، ثواب

اس شعر میں اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سچی پر خلوص عبادت میں ثواب کا لالچ نہیں ہوتا، سچی عبادت جنت کے لئے نہیں ہوتی۔ خدا کے لئے ہوتی ہے۔ خدا کی عبادت اور سوداگری میں فرق ہے۔ سوداگری لین دین کا معاملہ ہے اس میں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والی بات ہوتی ہے۔

آدمی پیسے دیتا ہے اور چیزیں لیتا ہے لیکن عبادت کوئی کاروبار نہیں۔ اس لئے عبادت کے معاملے میں جنت کا نہیں خدا کی خوشنودی (خوشی، رضامندی) کا خیال ہونا چاہیے۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ جزا یا ثواب کے خیال کو ترک کر کے خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔

چھٹا شعر: پاسبان : محافظ

پاسبان عقل : عقل کا پاسبان، یہاں عقل کو پاسبان سے تشبیہ دی گئی یعنی عقل کو پاسبان کہا

اقبال کی شاعری کا ایک نہایت اہم موضوع عقل اور عشق ہے۔ عقل کا تعلق دماغ سے مانا جاتا ہے اور عشق کا تعلق دل سے ہے۔ اقبال کے نزدیک عقل اور عشق دونوں انسان کی صلاحیتیں اور قوتیں ہیں۔ اقبال ان دو صلاحیتوں میں عقل کو عشق سے کمتر درجے کی صلاحیت اور قوت قرار دیتے ہیں، وہ عمل کی ضرورت اور افادیت (فائدہ) سے انکار نہیں کرتے لیکن زندگی کی بلند ترین روحانی منزل تک پہنچنے کے لئے عقل کی رہنمائی کو کافی نہیں سمجھتے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ:

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اقبال کا یہ مصرع کہ ؎ اچھا ہے "دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل" اقبال کی ابتدائی غزلوں میں ایک غزل کا مصرع ہے اور غالباً اس زمانے کا مصرع ہے جب اقبال نے عقل و عشق کے بارے میں بہت سنجیدگی سے سوچنا شروع نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اس شعر سے اتنا ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اقبال عقل کی افادیت اور اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود دل کو ہمیشہ عقل کی حفاظت میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دل کے ساتھ عقل کے پاسبان کا رہنا اچھا تو ضرور ہے لیکن کبھی کبھی دل کو تنہا بھی چھوڑ دے یعنی زندگی ہمیشہ عقل کے مطابق نہیں کبھی کبھی جذبے کے مطابق بھی بسر کرنی چاہیے۔ عقل انسان کو احتیاط سکھاتی ہے۔ عافیت اور خطرے کے معاملہ میں خطرے سے بچنا سکھاتی ہے۔ فائدہ اور نقصان کے معاملے میں فائدے کو ترجیح دینا سکھاتی ہے۔ اس کے برعکس جذبہ (عشق) انسان کو مہم جو (خطرہ مول لینے والا) بناتا ہے۔ فائدہ اور نقصان سے بے نیاز ہونا سکھاتا ہے۔ صرف دوسروں سے قربانی کا مطالبہ کرنا نہیں خود قربان ہو جانا سکھاتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ سچی اور اعلیٰ زندگی صرف زندگی کی حفاظت کا نام نہیں بلکہ کسی بلند مقصد کے لئے اسے قربان کر دینا بھی زندگی ہے۔

اقبال ہی کا شعر ہے:

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

۲.۳۔غزل نمبر۳

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی
شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زناریٔ بت خانہ ایام ابھی
عذر پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوش انجام ابھی

پہلا شعر:

نالہ	:	فریاد، گریہ وزاری، رونا دھونا
شوریدہ	:	پریشان، دیوانہ، عاشق
خام	:	کچا

بلبل پھول کی عاشق مانی جاتی ہے درد عشق اسے بھی نالہ وفریاد پر مجبور کرتا ہے جس چیز کو دنیا بلبل کا چہکنا کہتی ہے دراصل وہ بلبل کی آہ وزاری ہے۔ شاعر بلبل کے نالے کو پھولوں پر اثر انداز نہ دیکھ کر کہتا ہے کہ اے پریشان بلبل۔ تیرا نالہ ابھی کچا ہے۔ اسے اپنے سینے میں کچھ دیر اور رکھ۔ جب تیرے نالے میں پختگی آجائے گی تو وہ ہر سننے والے کے دل کو پگھلا دے گی یہاں تک کہ پھول جو تیرا محبوب ہے وہ بھی تیرے نالے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

جو بات اس شعر میں بلبل شوریدہ سے کہی گئی ہے وہ کسی بھی ایسے فنکار سے کہی جا سکتی ہے۔ جس کے فن میں پختگی اور گہرائی پیدا نہیں ہوئی بلبل شوریدہ سے اقبال کا اشارہ اپنی طرف بھی ہو سکتا ہے۔

دوسرا شعر: پختہ : پکا ہوا، تجربہ کار، مضبوط

مصلحت اندیش : بھلائی سوچنے والی (والا)، اپنا فائدہ سوچنے والا

اقبال عقل اور عشق کا فرق بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو بات عقل کی خوبی ہے وہی بات عشق کی خامی ہے عقل کی خوبی یہ ہے کہ مصلحت اندیش ہو اور ہر معاملے میں بھلائی اور فائدے پر نظر رکھے۔ اس کے برعکس اگر عشق میں مصلحت اندیشی اور فائدہ پرستی ہو تو اسے عشق نہیں کہا جا سکتا یا زیادہ سے زیادہ اسے عشق کی خامی ضرور کہا جائے گا۔ اس اعتبار سے عقل اور عشق ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں تضاد کا تعلق ہے۔

تیسرا شعر: بے خطر : خطرے کی پروا کیے بغیر، بغیر کسی خوف کے

آتش نمرود : جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانے کے بادشاہ نمرود کو خدا ماننے سے انکار کیا تو اس نے حضرت ابراہیم کو اپنے بنوائے ہوئے آتش کدے میں یہ کہہ کر پھینکوا دیا کہ اگر تمہارا کوئی خدا ہے تو دیکھنا ہے کہ وہ تمہیں بچاتا ہے یا نہیں۔ جب حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے تو وہ آتش کدہ باغ بن گیا۔

محو تماشائے لب بام : کوٹھے کے کنارے کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے میں گم یا حیران

عقل پر عشق کی برتری ظاہر کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات میں عشق (جو عشق الٰہی تھا) کی آزمائش کا وقت آیا تو اس وقت عشق کامیاب ثابت ہوا۔ حضرت ابراہیم جو عشق الٰہی کی حیثیت رکھتے تھے بغیر کسی خوف کے آتش نمرود میں کود پڑے۔ جو لوگ صرف صاحب عقل تھے۔ وہ اس تماشا کو دیکھ کر حیران رہ گئے، جو قوت عمل عشق میں ہے وہ عقل میں نہیں۔ عقل صرف تماشا دیکھتی ہے۔ عشق مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتا ہے۔

چوتھا شعر:
فرمودۂ قاصد — قاصد کا کہا ہوا یعنی قاصد کا پیغام
سبک گام عمل — عمل کرنے میں تیز

جب کسی جملے یا شعر میں کسی مشہور واقعے یا روایت کی طرف اشارہ ہوتا ہے تو اسے تلمیح کہتے ہیں۔ اس شعر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ان کو خواب میں خدا کا یہ پیغام ملا کہ تم اپنی عزیز ترین پونجی کو خدا کی راہ میں قربان کرو تو وہ فوراً اپنی عزیز ترین پونجی اپنے بیٹے کی قربانی دینے پر آمادہ ہو گئے اور جب ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے باپ (یہاں باپ کی حیثیت قاصد کی ہے) کی زبانی یہ پیغام سنا کہ خدا ان کی قربانی چاہتا ہے تو وہ بھی قربان ہو جانے پر فوراً تیار ہو گئے اور ذبح ہونے کیلئے لیٹ گئے انہوں نے خدا کے پیغام پر عمل درآمد (کاربند ہونے، عمل کرنے) میں بڑی سبک گامی (تیز قدمی، تیز رفتاری) کا ثبوت دیا۔ دوسری طرف عقل یا عقل والوں کا حال یہ تھا کہ وہ حضرات ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے نام خدائی پیغام کے معنی بھی نہ سمجھ سکے اور سوچتے رہ گئے کہ کیا حضرت ابراہیم کے خواب کے معنی یا خواب کے ذریعے آنے والے پیغام کے معنی یہی ہیں کہ حضرت اسماعیل کو قربان کر دیا جائے۔ تو یہ ہے فرق عشق اور عقل کا۔ عقل پیغام کے معنی تک نہیں سمجھ پاتی عشق اس پیغام پر عمل کر گزرتا ہے۔

پانچواں شعر: عشق طریقہ	:	شیوہ عشق
دہر آشوبی	:	زمانے کو پریشان کرنا
زناری	:	پجاری، گرفتار
بت خانہ ایام	:	زمانے کا بت خانہ یعنی زمانہ

عشق کی خوبی اور عقل کے مقابلے میں اسکی برتری بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ عشق (مراد صاحب عشق سے ہے) کا آزاد رہنا اور اپنے عمل سے دنیا والوں کو حیران و پریشان کر دیتا ہے جب کہ تم جو بندہ عقل (عقل کے غلام) ہو زمانے کے بت خانے کے پجاری ہو۔ تمہیں شام و سحر کی قید سے آزاد رہنا نصیب نہیں اور تمہارے اندر کوئی ایسا کام کرنے کی صلاحیت نہیں جو زمانے کو پریشان کر دے۔

چھٹا شعر: عذر پرہیز	:	پرہیز کا عذر، یہ بہانہ کہ مجھے فلاں چیز سے پرہیز ہے۔
کاوش انجام	:	انجام کی فکر

جب میں ساقی سے کہتا ہوں کہ میں شراب نہیں پی سکتا۔ کیونکہ مجھے شراب سے پرہیز ہے تو وہ میرے اس عذر پر خفا ہو کر کہتا ہے کہ ابھی تک تیری عقل میں زنجیر کی وہی فکر موجود ہے۔ جو پہلے تھی۔ گویا تو ابھی تک عقل کی زنجیر سے آزاد نہ ہو سکا۔ ہر معاملے میں انجام کی فکر انہی لوگوں کو زیادہ رہا کرتی ہے جو عقل کے غلام ہیں۔ ان کے مقابلے میں عشق والے انجام سے بے پرواہ ہوتے ہیں۔

اس شعر میں اقبال انسان کو ہمیشہ محتاط زندگی بسر کرنے کی بجائے مہم جو اور خطر پسند ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں انسان مہم جو اسی وقت بن سکتا ہے جب وہ عقل سے زیادہ عشق کو اپنائے یا عشق کی راہ نمائی اختیار کرے۔

۲.۴۔ غزل نمبر ۴

پھر یاد بہار آئی اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو
تو خاک کی مٹی ہے اجزا کی حرارت سے
برہم ہو، پریشان ہو، وسعت میں بیاباں ہو
تو جنس محبت ہے، قیمت ہے گراں تیری
کم مایہ ہیں سوداگر، اس دیس میں ارزاں ہو
کیوں ساز کے پردے میں مستور ہوے تیری
تو نغمہ رنگیں ہے، ہر گوش پہ عریاں ہو
اے رہرو فرزانہ! رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو
ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل، غارت گر ساماں ہو

پہلا شعر: باد بہار : موسم بہار کی ہوا جو نشاط انگیز اور ولولہ خیز ہوتی ہے

غزل خواں ہونا : لفظی معنی غزل پڑھنا، مراد ہے، نغمہ سنجی، خوشی سے گانا

بہار کا موسم عام انسانوں کے لئے تو خوشی کا موسم ہوتا ہی ہے لیکن شاعروں پر اس موسم کے خوش گوار اثرات کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں اس لئے اقبال اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ اے اقبال! بہار کا موسم آ گیا ہے۔ پھر باد بہار چل رہی ہے اس حسین و رنگین موسم کا تقاضا یہ ہے کہ تو اپنی غزل چھیڑ اور اگر تو غنچہ ہے تو پھول بن جا اور اگر پھول ہے تو گلستان بن جا مطلب یہ ہے کہ بہار کا موسم روئیدگی (اگنا) اور فراوانی: (کثرت، زیادتی، وفور کا موسم ہے تو بھی اس موسم کا اثر قبول کر کے کچھ سے کچھ ہو جا۔ جس طرح غنچہ پھول بنتا ہے اور پھولوں سے گلستان

وجود میں آتا ہے اسی طرح تو بھی اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو فروغ دے کر نہ صرف خود ارتقاء (ترقی) کی منزلیں طے کر بلکہ پوری انسانیت کے لئے مسرت اور افادیت کا سبب بن جا اپنے قلب و روح کی شادابیوں کو پوری دنیا میں بکھیر دے۔

دوسرا شعر:	اجزاء	:	جز کی جمع حصہ
	حرارت	:	گرمی
	برہم ہونا	:	منتشر ہونا، تتر بتر ہونا
	پریشان ہونا	:	بکھر جانا
	وسعت	:	چوڑائی
	بیاباں	:	جنگل

اقبال اپنے آپ سے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اقبال! تو ایک مشتِ خاک ہے، تو جن اجزاء کے ملنے سے بنا ہے ان کی حرارت سے گرم ہو جا، بکھر جا اور اپنی وسعت میں بیاباں بن جا۔ فصل گل یا باد بہار شاعر کے دل میں عجیب قسم کی امنگیں پیدا کرتی ہے۔ حد نظر تک عالم فطرت کی طراوت اور شادابی کو دیکھ کر اقبال کے دل میں عجیب و غریب آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں جس طرح فطرت کا حسن ہر طرف بکھرا پڑا ہے اقبال چاہتے ہیں کہ ہر طرف پھیل جائیں اور وسعت میں بیابان کے برابر ہو جائیں عقل کے اعتبار سے یہ خواہشات بے معنی سہی لیکن سرور اور خوشی کے عالم میں ایسی مستانہ خواہشیں بھی انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ دریا میں چاند کا عکس دیکھ کر کون نہیں چاہتا کہ چاند کو پکڑے۔ کیا یہ خواہش بے معنی نہیں؟

تیسرا شعر:	جنس محبت	:	محبت کی چیز مراد یہ ہے کہ تو سراپا محبت ہے
	گراں	:	بھاری، مہنگا
	کم مایہ	:	معمولی پونجی والا، کم قیمت
	ارزاں	:	سستا، کم قیمت

اے اقبال! تو جنس محبت ہے اور اس لحاظ سے تو ایک بیش قیمت جنس ہے۔ لیکن تیرے خریدار کم حیثیت ہیں ان کے پاس اتنا سرمایا نہیں کہ وہ محبت جیسی بیش قیمت چیز کی صحیح قیمت ادا کر سکیں۔ اس لئے تو اس ملک میں جہاں کے سوداگر کم مایہ ہیں ارزاں ہو جا۔ مطلب یہ ہے کہ اے اقبال تو اپنی محبت کو عام کر دے اور لوگوں سے اس کا صلہ نہ مانگ کیونکہ لوگ اس کا صلہ نہیں دے سکتے۔ محبت جیسی انمول چیز لوگوں کو بلا قیمت بھی دی جا سکتی ہے کوئی محبت کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔

چوتھا شعر: ساز	:	باجا
مستور	:	پوشیدہ
لے	:	سر
نغمۂ رنگیں	:	دل کش گیت
گوش	:	کان، مراد سماعت ہے
عریاں ہونا	:	ظاہر ہونا

کہتے ہیں کہ اے اقبال تیری لے ساز کے پردے میں کیوں پوشیدہ رہے؟ تو ایک دل کش نغمہ ہے۔ تجھے چاہیے کہ ہر آدمی کی سماعت پر ظاہر ہو۔ یہ بہار کا موسم ہے جس طرح اس موسم میں ہر چیز کی اندرونی صلاحیتیں باہر آجاتی ہیں۔ زمین پر سبزے اگنے لگتے ہیں۔ درختوں کی شاخوں پر کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، اس طرح تو بھی اپنی موسیقارانہ صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع دے۔ اپنی دلکش آواز سے لوگوں کو محظوظ ہونے دے۔

پانچواں شعر: رہرو	:	مسافر، راستہ چلنے والا
فرزانہ	:	عقل مند

بہار کا موسم اقبال کا نہ صرف شاعرانہ جذبات کو انگیخت کر رہا ہے (بیدار کر رہا ہے) بلکہ ان کے اندر مفکرانہ خیالات کو بھی متحرک کر رہا ہے۔ اقبال کا ایک محبوب خیال ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے ماحول یا حالات کے تقاضے کے مطابق نرمی یا سختی اختیار کرے۔ یہاں رہرو فرزانہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے عقل مند مسافر! اگر تیرے راستے میں گلشن آجائے تو شبنم کی طرح نرم ہو جا اور اگر صحرا آپڑے تو طوفان کی طرح تیز و تند ہو جا۔ اسی خیال کو انہوں نے اپنی ایک مشہور نظم "طلوعِ اسلام" میں یوں بھی ظاہر کیا ہے۔

گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

چھٹا شعر: مظہر : پوشیدہ

تن آسانی : آرام طلبی، جسمانی تکلیف سے بچنا، سہل انگاری

غارت گر : برباد کرنے والا

اقبال کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی چیزوں (سامان) سے جو محبت ہوتی ہے اس میں اس کی آرام طلبی اور سہل انگاری کو دخل ہوتا ہے۔ آدمی چونکہ فطرتاً آرام طلب واقع ہوا ہے اور سامان آرام فراہم کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں اس لئے ہر آدمی کو اپنے سامان زیست سے محبت ہوتی ہے لیکن اگر زندگی کے بلند مقاصد کو حاصل کرنا ہے تو اس کے لئے سامان حیات سے اپنی محبت کو ختم کرنا پڑے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ سامان حیات کو ضائع کرنا پڑے گا۔ جب تک چیزیں رہیں گی ان کی محبت بھی رہے گی۔ جب چیزیں ختم ہو جائیں گی تو آدمی پوری توجہ کے ساتھ اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اپنے مقصد کے حصول میں لگا دے گا۔ اس شعر کو لفظی طور پر قبول کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اس شعر کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آدمی اپنے گھر کو آگ لگا دے جبھی وہ کسی بلند مقصد میں کامیاب ہوگا۔ دراصل اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے دنیوی مفادات سے اپنی محبت کو کم نہ کرے گا اسے کسی بلند مقصد کے حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

اقبال کی یہ غزل اگرچہ ان کی شاعری کے ابتدائی دور کی غزلوں میں سے ہے پھر بھی اس میں شاعر اور مفکر دونوں قسم کے اقبال کی جھلک ملتی ہے۔ پہلے چار شعر شاعرانہ جذبات کا اظہار ہیں اور آخری دو شعر فلسفیانہ خیالات کا۔

2.5۔غزل نمبر ۵

کبھی اے حقیقت منتظر! نظر آلباس مجاز نہیں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، تیرا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

پہلا شعر:

منتظر	:	جس کا انتظار کیا گیا۔
حقیقت منتظر	:	وہ حقیقت جس کا انتظار کیا گیا۔ مراد خدا ہے
لباس مجاز	:	مراد ہے ایسا لباس جو نظر آئے
جبین نیاز	:	نیاز مند کی پیشانی۔ وہ پیشانی جو خدا کو دیکھنے کی آرزومند ہے

خدا حقیقت منتظر کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان اسے دیکھنے کا آرزومند بھی رہا ہے لیکن خدا آج تک کسی کو نظر نہ آیا اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ اے خدا تو کبھی ایسے لباس میں سامنے آ جسے ہماری آنکھیں دیکھ سکیں۔

ہماری پیشانی جو تیری آرزومند واقع ہوئی ہے اور جو تیرے حضور میں ہمیشہ سجدے کرتی رہتی ہے اس میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں اگر تو کبھی نظر آ جائے تو ہم تیرے قدموں پر ہزاروں سجدے نچھاور کر دیں۔

اس شعر میں انسان کی ایک آفاقی تڑپ کا بیان ہے۔ دنیا کا ہر انسان خدا کو اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے مگر نہیں دیکھ پاتا۔ اس لئے اس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کاش خدا خود ہی کسی ظاہری لباس میں ہمارے سامنے آجاتا تاکہ سارے سجدے جو اس کے تصور میں ادا ہوتے ہیں اس کے قدموں پر ادا ہوسکیں۔

دوسرا شعر: آئینہ : آئینہ، شعر میں آئینہ کی جگہ آئنہ بھی استعمال کرتے ہیں۔

شکستہ : ٹوٹا ہوا

عزیز تر : زیادہ عزیز

آئنہ ساز : آئینہ بنانے والا

شاعری میں دل کو عام طور پر آئینے سے تشبیہ دیتے ہیں ظاہر ہے کہ آئینہ شیشے کا ہوتا ہے اقبال کہتے ہیں کہ اپنے دل کو شیشے کی طرح بچا بچا کے نہ رکھو۔ شیشے کو ٹوٹنے سے بچانا تو ضروری ہے لیکن دل کا شیشہ وہ شیشہ ہے کہ ٹوٹ جائے تو وہ بنانے والے (اشارہ خدا کی طرف) کی نظر میں اور زیادہ عزیز ہوجاتا ہے۔ خدا ٹوٹے ہوئے دلوں کو زیادہ عزیز رکھتا ہے کیونکہ ٹوٹے ہوئے دل نرمی اور انسانیت کا ثبوت ہوتے ہیں جو آدمی سنگ دل واقع ہوا ہے اس کے دل کا شیشہ کیونکر ٹوٹے گا خدا خودغرض اور سنگ دل لوگوں کو عزیز نہیں رکھتا۔

تیسرا شعر: امان پناہ

جرم خانہ خراب وہ جرم جسے چھپنے کے لئے کوئی جگہ نہ ملتی ہو اور وہ آوارہ پھر رہا ہو

عفو معافی

عفو بندہ نواز بندے پر مہربانی کرنے والی معافی

خدا کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ ستار و غفار ہے یعنی وہ انسان کے گناہوں کو چھپانے والا اور بخش دینے والا ہے اقبال خدا کی اس صفت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے خدا میں نے جب کوئی جرم کیا یا جب کوئی جرم مجھ سے سرزرد ہوا تو اسے دنیا میں کہیں پناہ نہ مل سکی۔ دنیا میں اگر میرے اس جرم کو جو پناہ کے لئے بھاگا پھرتا رہا کہیں پناہ ملی تو صرف تیری اس معافی میں جو بندوں کو نوازتی ہے مطلب یہ ہے کہ انسان تو انسان کے جرم کو معاف نہیں کرتا لیکن خدا تو معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ غفار ہے اور بندہ نواز بھی۔

چوتھا شعر: گرمیاں : جذبے کی شدت

غزنوی : محمود غزنوی ایک مشہور مسلمان بادشاہ تھا جس نے ہندوستان پر کئی حملے کئے۔

ایاز : محمود غزنوی کا مشہور غلام جسے اس کی خوبیوں کی بنا پر محمود بہت عزیز رکھتا تھا شاعری میں محمود اور ایاز عاشق اور محبوب کی حیثیت رکھتے ہیں محمود عشق کی نمائندگی کرتا ہے اور ایاز حسن کی۔ زلف ایاز کے معنی ایاز کی زلف ہے لیکن یہاں اس سے مراد ایاز کی دلکشی ہے۔

خم : ٹیڑھا، جھکاؤ، ترچھاپن

اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عہد حاضر کے عشق و حسن میں پہلی سی بات نہیں رہی اب نہ تو عشق کے جذبات میں پہلی سی شدتیں ہیں اور نہ حسن کے مزاج میں پہلی سی شوخیاں۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ اب نہ تو غزنوی (یعنی آج کل کے عاشق) میں پہلی سی تڑپ رہ گئی ہے اور نہ زلف ایاز (آج کل کے معشوق کی زلفوں میں وہ پہلا سا خم (پہلی سی دلکشی)

اس شعر سے اقبال کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگرچہ حسن و عشق آفاقی اور ابدی ہیں لیکن بدلتے ہوئے زمانے کا اثر ان پر بھی پڑ رہا ہے حسن آج بھی موجود ہے لیکن اب اس کی زلفوں میں پہلی سی دلکشی نہیں رہ گئی کیونکہ آج کے حسن کی آرائش اور زیبائش کا طریقہ ہی بدل چکا ہے اسی طرح دلوں میں عشق کا جذبہ اب بھی ہے لیکن اب جذبہ عشق میں وہ پہلی سی دیوانگی نہیں ہے جو مثال کے طور پر مجنوں اور فرہاد میں نظر آتی ہے۔ یا وہ تڑپ نہیں ہے جو ایاز کے لئے محمود غزنوی کے دل میں تھی۔

پانچواں شعر: سر بہ سجدہ ہونا : سجدہ کرنا

صنم آشنا : بتوں سے آشنائی رکھنے والا، صنم کے معنی ہیں، بت، مراد معشوق انسانی معشوق۔

اس شعر میں عہد حاضر کے مسلمانوں کی ایک سچی تصویر پیش کی گئی ہے آج کا مسلمان اول تو نماز پڑھنے کا عادی نہیں رہا لیکن اگر کبھی نماز پڑھتا بھی ہے تو اس نماز میں خلوص نہیں ہوتا کیونکہ اس کا دل خدا کا پرستار نہیں، انسانی محبوب کا پجاری ہے۔ اقبال اپنے آپ کو اس قومی کمزوری کا نمائندہ بنا کر کہتے ہیں کہ اگر میں نے کبھی خدا کے حضور میں سجدے کیے بھی تو زمین سے آواز آنے لگی کہ اے سجدہ کرنے والے! تیرا دل تو صنم آشنا ہے، تجھے نماز پڑھنے سے کیا ملے گا۔ نماز کا فائدہ تو صرف اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو خلوص دل کے ساتھ نماز پڑھے جو خود خدا کو اپنا محبوب سمجھتا ہو نہ کہ کسی انسان کے حسن کا شیدائی ہو۔ زمین سے صدا کا آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک گناہگار کا ضمیر اس کو ملامت کر رہا ہے اور اسے ایسا لگ رہا ہے جیسے ملامت کے الفاظ اس زمین سے سنائی دے رہے ہیں جس پر وہ اپنے جھوٹے سجدے ادا کر رہا ہے۔

۴۔ خود آزمائی

۱۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جوابات لکھیں۔

(۱) غزل اور مثنوی میں اردو کے سب سے مشہور شعراء کون ہیں؟

(۲) عہد حاضر میں اردو شاعری کو کون سی دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے؟

(۳) غزل اور نظم کا بنیادی فرق کیا ہے؟

(۴) اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز نظم سے کیا یا غزل سے؟

(۵) اقبال کی ابتدائی نظموں کے موضوعات کیا ہیں؟

(۶) اقبال کو صرف اپنی قوم کا غم ہے یا تمام انسانیت کا؟

(۷) اقبال کے یہاں عشق کا مفہوم کیا ہے؟

(۸) غزل اور نظم کی زبان میں کیا فرق ہوتا ہے؟

(۹) اردو غزل کے عام موضوعات کیا ہیں؟

(۱۰) اقبال کی غزل کے عام موضوعات کیا ہیں؟

۲۔ اس یونٹ کی روشنی میں صرف صحیح جملوں پر نشان (✓) لگائیں۔

(۱) علامہ اقبال اردو کے ایسے شاعر ہیں جن کا مرتبہ نظم وغزل دونوں میں بہت اونچا ہے۔

(۲) اقبال نے ذوق دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔

(۳) اقبال نظم وغزل میں اردو کے تمام شاعروں سے مختلف ہیں۔

(۴) اقبال کی شاعری ان کے ذاتی معاملات ومسائل کی شاعری ہے۔

(۵) اقبال کی شاعری میں مسائل کا ذکر بھی ہے اور مسائل کا حل بھی۔

(۶) اقبال نے جو باتیں اپنی غزلوں میں کہیں وہ باتیں اپنی نظموں میں نہیں کہیں۔

(۷) اقبال کی نظم اور غزل کا انداز بیان یکساں ہے۔

(۸) اقبال کی شاعری شکست خوردہ انسان کی شاعری نہیں ہے۔

(۹) دوسری غزل میں اقبال نے کہا ہے کہ صحرا اور لیلیٰ دونوں کا خیال چھوڑ دو

(۱۰) اقبال نے عشق کو مصلحت اندیش قرار دیا ہے۔

۳۔ دیئے ہوئے صحیح الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پر کیجئے۔

(۱) ''بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق'' .... کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام)

(۲) پہلی غزل میں اقبال نے گلزار ہست و بود .... کو کہا ہے۔

(آخرت، زندگی، دنیا)

(۳) اقبال کا لہجہ .... ہے۔

(یاس پرستانہ، رجائی، تلخ)

(۴) شاعری میں دل کو .... سے تشبیہ دیتے ہیں۔

(پھول، آئینہ، درخت)

(۵) گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے

گلستان راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اقبال کا یہ شعر ان کی نظم .... میں ہے۔

(شمع و شاعر، شکوہ، طلوع اسلام)

(۴) مندرجہ ذیل میں سے صحیح فقرات پر نشان (✓) لگائیے۔

(ا) خودی کے مسئلے پر اقبال کا مسلمان صوفیوں سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔

(۲) اقبال نے تربیت خودی کے تین مرحلے مقرر کیے ہیں۔

(۳) اقبال نے فقر کی مذمت کی ہے۔

(۴) اقبال کی شاعری میں ذوق طلب سے مراد آرزو اور تمنا ہے۔

(۵) اقبال نے ہندوستان کے مسائل کا کوئی حل تجویز نہیں کیا۔

۴۔ جوابات

۱۔ (۱) غزل میں میر اور مثنوی میں میرحسن اردو کے سب سے مشہور شاعر ہیں۔
(۲) غزل اور نظم میں
(۳) غزل اور نظم میں دو بنیادی فرق ہیں (۱) نظم کسی ایک موضوع پر لکھی جاتی ہے جبکہ غزل کسی ایک موضوع پر نہیں لکھی جاتی۔ غزل میں ہر شعر کا موضوع الگ الگ ہوتا ہے (۲) غزل کی شکل ایک ہوتی ہے جبکہ نظم کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔
(۴) اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔
(۵) اقبال کی ابتدائی نظموں کا موضوع یا تو قدرت کے مناظر ہیں یا ملک وقوم کے مسائل۔
(۶) نہ صرف اپنی قوم کا بلکہ تمام انسانیت۔
(۷) اقبال کے یہاں عشق سے مراد کسی بڑے مقصد یا نصب العین سے لگاؤ ہے۔
(۸) غزل نظم سے زیادہ نرم زبان چاہتی ہے شان وشوکت والی زبان نظم کے لئے مناسب ہوسکتی ہے لیکن غزل کے لئے نہیں۔
(۹) حسن وعشق، ذاتی محرومیاں اور مایوسیاں، معاشرے اور ماحول کی خرابیاں، فلسفہ وتصوف کے مسائل، انسانی فطرت کی نزاکتیں و پیچیدگیاں وغیرہ۔
(۱۰) فلسفہ، خودی وبیخودی، عشق، عقل، عمل، فقر، شاہین، قوموں کا عروج وزوال، مشرق ومغرب کا فرق، قومی اور بین الاقوامی حالات، تاریخ اسلام اور تاریخ انسانی، فلسفہ وحکمت۔

۲۔ صحیح جملے
(۱)، (۳)، (۵)، (۸)، (۹)

۳۔ (۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام (۲) دنیا کا (۳) رجائی (۴) آئینہ
(۵) طلوع اسلام ۴۔ (۲۰)، (۴)

یونٹ......۱۷، ۱۸

افکارِ اقبال

تحریر:
نظیر صدیقی

فہرست

تعارف	550
مقاصد	550
۱۔ اقبال بحیثیت مفکر	551
۲۔ اقبال کا فلسفۂ خودی	555
۳۔ اقبال کا فلسفۂ بے خودی	567
۴۔ خود آزمائی	571
۵۔ جوابات	573

تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

علامہ اقبال کے فکر کا محور ان کا تصور خودی و بیخودی ہے۔ اس یونٹ میں انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تعلق اور ان میں توازن پیدا کرنے والے انہی تصورات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

مقاصد

یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ کو اس قابل ہو جانا چاہیے کہ آپ

۱۔ اس بات کی وضاحت کر سکیں کہ علامہ اقبال محض ایک شاعر نہ تھے بلکہ ایک مفکر بھی تھے۔

۲۔ بیان کر سکیں کہ ایک مفکر کی حیثیت سے علامہ اقبال کے بنیادی نظریات و خیالات کیا تھے؟

۳۔ یہ واضح کر سکیں کہ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے علامہ اقبال کے نظریات و خیالات سے کیا تعلق ہے؟

۴۔ علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفے کے باہمی رشتے کی تشریح کر سکیں۔

ا۔اقبال بہ حیثیت مفکر

جب کبھی اقبال کا نام ہمارے سامنے آتا ہے تو سب سے پہلے ہمارے ذہن میں کیا خیال آتا ہے؟ یہی تو کہ وہ ایک بہت بڑے شاعر تھے۔اردو کے دو تین سب سے بڑے شاعروں میں سے ایک شاعر۔ہم انہیں اپنا قومی شاعر بھی کہتے اور سمجھتے ہیں کیونکہ ان کی شاعری کا زیادہ تر حصہ مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں ہے۔

لیکن اقبال صرف شاعر نہیں تھے۔ان کے بارے میں دوسری بات جو فوراً ہمارے ذہن میں آتی ہے کہ شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے اور مفکّر کسے کہتے ہیں یہ بڑے گہرے سوالات ہیں اور ان سوالوں کا جواب بڑی تفصیل چاہتا ہے۔

لیکن شاعر اور مفکر کے بارے میں کچھ عام تصورات یقیناً ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں۔

شاعر تو ہم اسے سمجھتے ہیں جو شعر کہتا ہے، شاعر کا ایک عام تصور یہ ہے کہ وہ غزلیں اور نظمیں کہتا ہے۔شاعر غزلوں میں عام طور پر عاشقانہ جذبات اور خیالات کا اظہار کرتا ہے اور نظموں میں قدرت کے مناظر سے لے کر قوم کے مسائل تک بیان کرتا ہے۔

فلسفی کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ فلسفی وہ آدمی ہے جو ہر وقت اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا ہے اور اس کا عام آدمی اور عام زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس کا کام صرف سوچتے رہنا ہے اور بس۔شاعر کی طرح فلسفی بھی حقیقی دنیا کی بجائے خیالوں کی دنیا میں رہتا ہے۔

اقبال شاعر بھی تھے، فلسفی بھی لیکن وہ شاعر اور فلسفہ کے اس عام تصور سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے تھے۔

ایک شاعر کی حیثیت سے اقبال نے غزلیں اور نظمیں ضرور کہیں، اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی ابتدائی غزلیں عاشقانہ رنگ کی تھیں اور عاشقانہ رنگ بھی وہ جو ان کے استاد داغ دہلوی کے یہاں پایا جاتا ہے۔
داغ دہلوی کی شاعری زبان و بیان اور الفاظ و محاورات کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن مضامین اور موضوعات کے اعتبار سے اس میں کوئی بلندی یا گہرائی نہیں ہے۔دلکشی ضرور ہے کیونکہ عاشقانہ معاملات شوخ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

داغ دہلوی نے بہت جلد اقبال کو اصلاح سے فارغ قرار دے دیا اور اقبال نے بھی بہت جلد داغ دہلوی کے رنگ میں شعر کہنا ترک کر دیا۔

اقبال کی ابتدائی شاعری کا زمانہ انیسویں صدی کے آخر کا وہ زمانہ ہے، جب سر سید احمد خان، مولانا شبلی، مولانا حالی اور اس زمانے کے دوسرے قومی رہنماؤں، ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک نئی قومی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمان انگریزوں سے شکست کھا کر اپنی حکومت کھو چکے تھے اور سیاسی اعتبار سے انگریزوں کے غلام بن چکے تھے لیکن سر سید اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں سے مسلمانوں میں از سر نو ایک قومی ولولہ پیدا ہو چکا تھا اور مسلمان ایک نئی خود اعتمادی کے ساتھ اپنی حالت کو سنبھالنے اور سنوارنے میں لگ چکے تھے۔

سر سید کے زمانے میں مسلمان رہنماؤں کی دو جماعتیں نظر آتی ہیں ایک تو خود سر سید اور ان کے ساتھی جن میں مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ تھے جو مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دے رہے تھے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ صلح رکھیں، انگریزی زبان سیکھیں اور انگریزی یا مغربی تہذیب کو اپنانے میں برائی محسوس نہ کریں۔

دوسری طرف شبلی نعمانی اور اکبر الہ آبادی جیسے اہل علم تھے جو مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت کا مشورہ تو نہیں دے رہے تھے لیکن مسلمانوں کو یہ احساس ضرور دلا رہے تھے کہ خود ان کی تاریخ اور تہذیب کتنی شاندار ہے اور یہ کہ انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کو اپنانے کے نقصانات کیا ہیں۔

ان قومی حالات کا اثر اردو شاعری اور اردو ادب پر بھی پڑ رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی شاعری میں شاعروں کے سامنے شاعری کا کوئی سماجی مقصد نہیں ہوتا تھا۔

وہ شعر صرف اس لئے کہتے تھے کہ وہ شعر کہہ سکتے تھے۔ اگرچہ وہ اپنے شعروں مین اخلاقی نصیحت اور ہدایت سے متعلق مضامین بھی باندھتے تھے لیکن ان کا ارادہ یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے سے اپنی قوم یا اپنے معاشرے کی اصلاح کریں۔

۱۸۷۴ء میں لاہور میں اردو کے مشہور ادیب اور شاعر محمد حسین آزاد نے جدید شاعری کی تحریک شروع کی اس زمانے میں مولانا حالی بھی لاہور میں ملازمت کرتے تھے چنانچہ انہوں نے بھی اردو شاعری کا رنگ بدلنے میں آزاد کا ساتھ دیا۔

ان دونوں کی کوششوں نے اردو شاعری میں غزل گوئی سے زیادہ نظم نگاری کو رواج دیا اور نظم میں دو طرح کی شاعری پر زور دیا، ایک تو منظر نگاری پر دوسرے اصلاحی اور اخلاقی شاعری پر، حالی، غزل میں بھی عاشقانہ مضامین کی بجائے ناصحانہ خیالات سے کام لینے لگے۔ انہی کے زمانے کے شاعر اکبر الہ آبادی بھی تھے جنہوں نے روایتی انداز کی عشقیہ غزل سے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا لیکن وہ بھی اس رنگ کو چھوڑ کر اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات پر طنزیہ اور مزاحیہ شعر کہنے لگے۔ اگرچہ حالی اور اکبر کے انداز فکر میں بڑا فرق تھا لیکن دونوں کی شاعری مقصدی بھی تھی اور اصلاحی بھی۔ دونوں کا مقصد اپنی قوم کی اصلاح اور بہتری تھی۔

یہ حالات تھے جب اقبال انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئے۔ کوئی شخص کسی شعبے کا ہو اور کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اپنے زمانے کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اقبال کے نوجوان ذہن کی تشکیل و تعمیر میں ان کے زمانے کے حالات کو بڑا دخل رہا۔ پھر چونکہ قدرت نے انہیں غیر معمولی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں اس لئے وہ اپنے زمانے سے پہلے کے شاعروں اور مفکروں سے بہت مختلف ہیں۔

ایک شاعر کی حیثیت سے اقبال میں پہلی نئی بات تو یہی نظر آتی ہے کہ اپنے زمانے کے سب سے مقبول شاعر داغ دہلوی سے اصلاح لینے کے باوجود انہوں نے داغ کے رنگ میں شعر کہنا بہت جلد ترک کر دیا۔ وہ جتنی بڑی صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے اس کے اعتبار سے داغ کے رنگ کی شاعری بہت چھوٹی شاعری تھی۔

ذہنی طور پر وہ شبلی، حالی اور اکبر سے زیادہ متاثر ہوئے، ایسا ہونے میں ان کے گھر کے ماحول اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کو بھی دخل تھا، وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جس کے رگ و پے میں اسلام اور مسلمانوں سے گہری محبت دوڑ رہی تھی۔ وہ اقبال کے والد ہی تھے جنہوں نے اقبال کو قرآن پڑھتے دیکھ کر نصیحت کی تھی کہ بیٹے! قرآن اس طرح پڑھو جیسے قرآن تم پر خود نازل ہو رہا ہے ایسے باپ کے علاوہ انہیں شمس العلماء

میر حسن جیسے استاد بھی نصیب ہوئے جن کا شاگرد ہونے پر اقبال کو تمام عمر فخر رہا۔ بعد میں اقبال کو اور بھی لائق و فائق استاد ملتے چلے گئے۔

ذہین اور حساس اقبال اپنے ہم وطن مسلمانوں کی سیاسی شکست اور اخلاقی زوال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ مسلمانوں کی شکست اور مسلمانوں کا زوال، اسلام کی شکست اور اسلام کا زوال بھی بن جاتا ہے۔ اقبال نے نظر اٹھا کر دنیا کو دیکھا تو مسلمان ہر جگہ شکست خوردہ اور زوال کی زد میں نظر آئے۔

۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک اقبال اپنی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں انگلستان اور یورپ میں رہے۔ قدرت نے انہیں بیک وقت شاعرانہ اور مفکرانہ صلاحیتیں عطا کی تھیں، وہ جس شدت کے ساتھ محسوس کر سکتے تھے اتنی ہی تیزی کے ساتھ سوچ بھی سکتے تھے۔ یورپ کے دوران قیام میں انہوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ بیسویں صدی کے آغاز میں صرف مسلمان ہی نہیں ساری دنیا کی انسانیت ایک بحران اور اضطراب کے عالم میں ہے۔ نہ مسلمانوں کی حالت اچھی ہے نہ غیر مسلمانوں کی۔ نہ مشرق صحیح حالت میں ہے نہ مغرب، مسائل اور مصائب کے اسباب مختلف سہی لیکن مسائل اور مصائب کا انبار ہر جگہ موجود ہے۔

ان احساسات اور مشاہدات نے اقبال کو شروع ہی سے اردو کے تمام شاعروں سے مختلف قسم کا شاعر اور دنیا کے عام مفکروں سے مختلف قسم کا مفکر بننے میں مدد دی۔

اقبال نے حالی اور اکبر کے زیر اثر نہ صرف رسمی اور روایتی انداز کی غزل گوئی ترک کر دی بلکہ وہ مناظر فطرت کو اپنی شاعری میں جگہ دینے لگے اور قومی نظمیں بھی لکھنے لگے۔ لیکن اس میدان میں بھی وہ نہ صرف آزاد، حالی اور اکبر سے مختلف قسم کی شاعری کی بنیادیں ان بزرگوں نے رکھی تھیں اس کو اقبال نے نقطہ عروج تک پہنچا دیا اور نقطہ عروج تک پہنچانے میں اتنی نئی چیزوں کا اضافہ کر دیا جن کا ان بنیادوں میں ہونا ممکن نہ تھا۔

اقبال نے ایک جگہ ملت اسلامیہ کے زوال و انحطاط کے پیش نظر کہا تھا کہ (ع) ''غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا'' لیکن اقبال ملت اسلامیہ کے صرف ماتم گسار یا مرثیہ خوان نہ تھے، وہ مفکر قوم بھی تھے اور مفکر انسانیت بھی، انہوں نے مسلمانوں کے انحطاط (پستی، زوال) اور باقی دنیائے انسانیت کی ابتری (خرابی) کے

بنیادی اسباب کو سمجھنے کی کوشش بھی کی اور اس سلسلے میں وہ جن نتائج تک پہنچے انہیں اپنی شاعری اور نثری تحریروں میں بیان کر دیا۔

لیکن ایک مفکر کی حیثیت سے اقبال کا کارنامہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی قوم اور اپنے زمانے کے مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے بلکہ انہوں نے ان مسائل کا کوئی حل بھی پیش کیا۔ مثلاً انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی اور مذہبی مسائل کا حل ہندوستان کی اس تقسیم کو قرار دیا جس کی بنیاد پر پاکستان بنا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال تصور پاکستان کے خالق کہلاتے ہیں۔ گو انہوں نے پاکستان کا تصور پیش کرتے وقت لفظ "پاکستان" استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ نام چوہدری رحمت علی کا تجویز کیا ہوا ہے۔

ایک مفکر کی حیثیت سے اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ غالباً یہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی کا ایک ایسا فلسفہ پیش کیا ہے جس میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں کی تکمیل کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اقبال کے فلسفہ زندگی میں وہ توازن اور تناسب ہے جو انسانی تاریخ کے بہت سے عظیم مفکروں کے یہاں نہیں پایا جاتا ہے۔ اولیا کے بہت سے فلسفیوں کا فلسفہ یا تو صرف فرد کو اہمیت دیتا ہے یا صرف جماعت کو۔

اس معاملے میں اقبال اس اعتدال کی ترجمانی کرتے ہیں جو اسلام میں پایا جاتا ہے اقبال نے سارے بنیادی خیالات اسلام سے ہی لئے ہیں لیکن انہوں نے ان خیالات کو صرف مسلمانوں کے لئے ساری دنیا کے لئے پیش کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک تمام دنیا کے مسائل کا بہترین حل اسلامی نظام حیات ہے۔

۲۔ اقبال کا فلسفہ خودی

جیسا کہ آپ کو یاد ہے اس یونٹ کا عنوان ہے "افکار اقبال" اور جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے اس یونٹ کا ایک مقصد یہ ہے کہ آپ ایک مفکر کی حیثیت سے علامہ اقبال کے بنیادی نظریات و خیالات سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے بنیادی نظریات و خیالات کیا ہیں؟ ان کا فلسفہ زندگی کن افکار سے عبارت ہے؟

اقبال نے اپنے بنیادی نظریات وخیالات کو دولفظوں یا دو اصطلاحوں میں سمو دیا ہے ان دولفظوں میں سے ایک لفظ تو ہے 'خودی' اور دوسرا لفظ ہے 'بے خودی'۔

اقبال سے پہلے بھی یہ دولفظ اردو شاعری میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔

لیکن اقبال نے ان لفظوں کو ان کے روائتی مفہوم سے ہٹ کر اپنے مقرر کئے ہوئے معنوں میں استعمال کیا ہے، اقبال نے خودی سے متعلق اپنے خیالات اپنی فارسی کتاب ''اسرار خودی'' میں بیان کئے ہیں اور بیخودی سے متعلق اپنے خیالات اپنی فارسی کتاب ''رموز بیخودی'' میں ظاہر کئے ہیں یہ دونوں کتابیں ان کے فارسی کلام کے مجموعے ہیں۔

اقبال نے خودی اور بے خودی کے متعلق اپنے دوسرے فارسی اور اردو کلام میں بھی بہت کچھ کہا ہے لیکن جس تفصیل اور تسلسل کے ساتھ انہوں نے ''اسرار خودی'' میں خودی کے متعلق اور ''رموز بیخودی'' میں بے خودی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی کسی دوسری تصنیف میں نہیں ملتے۔

اقبال سے پہلے اردو شاعری میں لفظ خودی تکبر اور غرور کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں تصوف کے مضامین باندھے گئے ہیں وہاں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ آدمی جب تک اپنی خودی کو مٹا نہ دے اسے خدا نہیں مل سکتا۔

لیکن اقبال نے لفظ خودی کو احساس نفس اور تعین ذات کے معنی میں استعمال کیا ہے اقبال نے اپنی فارسی کتاب ''اسرار خودی'' اور اپنی مشہور اردو نظم ''ساقی نامہ'' میں خودی کی وضاحت کے لئے بہت سی شاعرانہ مثالیں استعمال کی ہیں ایک جگہ نثر میں خودی کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے لفظ خودی کو ''انا'' یا ''میں'' کے ہم معنی لفظ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ پروفیسر محمد عثمان کہتے ہیں کہ اقبال نے خودی کی وضاحت کے سلسلے میں شخصیت کا قدرے (کسی قدر) واضح اور مبہم لفظ کئی جگہ استعمال کیا ہے۔

ان تمام الفاظ واصطلاحات کے باوجود عام پڑھنے والوں پر لفظ خودی کا مفہوم واضح نہیں ہوتا لیکن اگر اقبال کے کچھ اردو شعروں کو سامنے رکھا جائے تو خودی کا مفہوم بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے 'ضرب کلیم' میں ان

کی ایک نظم ہے "افرنگ زدہ" اس میں اقبال اپنے زمانے کے ان نوجوانوں کو جو دہریت (الحاد، خدا کے وجود سے انکار کرنا) کی طرف مائل ہیں مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہر خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

ان اشعار کے ساتھ اگر آپ ان اشعار کو بھی سامنے رکھیں۔

ہر چیز ہے محو خود نمائی
ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت!
تعمیر خودی میں ہے خدائی

تو اس نتیجے تک پہنچنے میں دشواری نہ ہوگی کہ اقبال کے نزدیک خودی کے معنی خودشناسی اور خودآگاہی کے ہیں۔ جب وہ اپنی شاعری میں خودی کی تعلیم دیتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ اپنے اندر خودی پیدا کرو تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو پہچانو، اپنے آپ کو دریافت کرو۔

اپنے آپ کو پہچاننے کی تعلیم صوفیوں کے یہاں بھی ملتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ صوفیوں کا مطلب اقبال کے مطلب سے مختلف ہے، بقول ڈاکٹر عبداللہ صوفی یہ چاہتے ہیں کہ انسان یہ سمجھ لے کہ انسان اپنی اصل میں خدا سے جدا نہیں۔ انسان کی روح خدا کی مقدس ذات سے ملی ہوئی ہے گویا خدا، کائنات اور انسان اصل میں ایک ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اقبال کی اصطلاح خودی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

'آسان لفظوں میں اس کے معنی ہیں خود کا یعنی اپنی ذات کا' اپنی ہستی یا اپنے وجود کا احساس یا اپنی صلاحیتوں کا خود کو علم وغیرہ وغیرہ۔ اس کے معنی اپنے آپ کو پہچاننا بھی ہو سکتے ہیں اس سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شخص یہ جان لے کہ وہ کس کا بیٹا پوتا ہے اور کس شہر کا رہنے والا ہے۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ اسے خدا نے کیا کیا قابلیتیں عطا کی ہیں اور وہ ان سے کام لے سکتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی وضاحت اقبال کے ان شعروں سے بڑی مطابقت رکھتی ہے جو اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ ان شعروں سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا۔ کہ قدرت نے ہر انسان کو مختلف قسم کی صلاحیتیں عطا کی ہیں، انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے۔ اپنے آپ کو پہچاننے سے مراد اپنی صلاحیتوں کی نوعیت کو پہچاننا ہے۔ اقبال کے نظریے کے مطابق انسان کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ دنیا پر اپنی صلاحیتوں یا اپنے جوہر کا اظہار کرے۔ کیونکہ ان کے نزدیک بے ذوق نمود (اظہار کے ذوق کے بغیر) زندگی، زندگی نہیں موت ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اپنے آپ کو ظاہر کرنے میں مصروف ہے انسان کو بھی چاہیے کہ قدرت نے اس کے اندر جو صلاحیتیں رکھی ہیں ان کا اظہار کرے کیونکہ وجود صرف اس دنیا میں موجود ہونے کا نام نہیں بلکہ اپنی شخصیت اور صلاحیت کے مظاہرے کا نام ہے جو شخص اپنی قدر (اہلیت) نہیں جانتا وہ بے سواد (بے ہنر، بے صلاحیت) بھی ہے اور کم نگاہ (کم نظر) بھی۔ اقبال نے اپنی خودی یا اپنی ذات یا اپنی ہستی یا اپنے وجود کے احساس پر جتنا زور دیا ہے اتنا شاید کسی اور چیز پر نہیں دیا۔ ان کا ایک فارسی شعر ہے۔

منکر حق نزد ملا کافر است
منکر خود نزد من کافر تر است

اس شعر کے معنی یہ ہیں کہ ملا کے نزدیک خدا سے انکار کرنے والا کافر ہے میرے نزدیک وہ شخص خدا کے منکر سے بھی بڑا کافر ہے جو اپنے وجود سے انکار کرتا ہے۔

اس شعر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کے نزدیک خودشناسی کس قدر ضروری چیز ہے۔ ہر انسان کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں انفرادی اور اجتماعی یا ذاتی اور جماعتی، ہر انسان بیک وقت فرد بھی ہے اور جماعت کا رکن بھی۔

اقبال نے خودی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کا تعلق فرد سے ہے اور جماعت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کا تعلق بے خودی سے ہے۔

جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے اقبال کے نزدیک انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو یعنی اپنی صلاحیتوں کو پہچانے اور دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اظہار میں لائے اپنے جوہر کو نمایاں کرے۔

اپنے آپ کو یا اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اندازہ کرے کہ وہ کس کام کے لئے بنا ہے۔ ہر آدمی ہر کام تو نہیں کر سکتا۔ بعض لوگ تمام عمر یہ اندازہ نہیں کر پاتے کہ ان کی صلاحیتوں کا بہترین مصرف کیا ہے۔ آیا انہیں ڈاکٹر بننا چاہیے یا انجینئر۔ ان صلاحیتوں کا بہترین اظہار افسانہ نگاری میں ہو سکتا تھا یا ناول نگاری میں۔ یہ خودی کو سمجھنے کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اقبال خودشناسی اور خودآگاہی پر زور دیتے ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے جوہر خودی کا مظاہرہ کرے تو اس میں وہ یہ شرط بھی لگا دیتے ہیں کہ اپنی خودی کے اظہار سے پہلے اپنی خودی کی تربیت کر لینی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں کسی صلاحیت کے اظہار سے پہلے ضروری ہے کہ اس میں مہارت اور کمال پیدا کیا جائے ورنہ اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

اقبال نے خودی کی تربیت کے سلسلے میں بتایا ہے کہ خودی سوال سے کمزور ہوتی ہے اور عشق سے مضبوط۔

خودی اور بیخودی کی طرح اقبال کے یہاں سوال اور عشق کے الفاظ بھی خاص معنی رکھتے ہیں۔

اقبال کا ایک شعر اکثر آپ نے سنا ہوگا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اس شعر کے الفاظ بالکل سادہ ہیں۔ پھر بھی یہ بات سمجھنے میں نہ آئی ہوگی کہ اگر ستاروں کے آگے اور بھی دنیائیں ہیں تو ان کا عشق کے امتحان سے کیا تعلق ہے۔

یہ اور اس طرح کے جو اشعار اقبال کے یہاں ہیں ان کو سمجھنے کے لئے عشق کے اس خاص مفہوم کو نظر میں رکھنا ضروری ہے جو اقبال کے پیش نظر تھا۔

جب آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کو فلاں سے عشق ہو گیا ہے۔ تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ اسکے معنی یہی ہیں کہ فلاں آدمی سے فلاں کو شدید لگاؤ ہے۔ گویا شدید لگاؤ یا لگن کا دوسرا نام عشق ہے۔

- دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں یہ لفظ (عشق) مرد اور عورت کے درمیان محبت کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے اور اسی عشق پر عشقیہ شاعری اور رومانی شاعری کی بنیاد ہے۔

اقبال نے لفظ عشق کے بنیادی یا اصلی مفہوم کو نہیں بدلا البتہ اس کے مرکز کو بدل دیا عام طور پر شاعری میں عشق کا مرکز عورت ہوتی ہے۔ اقبال کے یہاں عشق کا لفظ مرد عورت کی جنسی محبت کے لئے نہیں بلکہ اس محبت یا لگن کے لئے استعمال ہوا ہے جو آدمی کو کسی بلند مقصد کے لئے یا نصب العین سے ہوتی ہے اور جس کی بنا پر وہ اس مقصد یا نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال عشق کو خودی کی، مضبوطی اور پختگی کا سبب قرار دیتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ خودی (یعنی اپنے وجود) کا احساس ہر شخص کے اندر موجود ہے لیکن جب تک آدمی اپنے دل میں بلند مقصد کے حصول کی آرزو پیدا نہیں کرتا اس کی خودی بیدار نہیں ہوتی۔ خودی تخلیق مقاصد (مقاصد کا پیدا کرنا) سے زندہ اور بیدار ہوتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں عظمت اور رفعہ۔ اونچے مقصد اور بلند نصب العین سے آتی ہے۔ جب اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زندگی بے مقصد نہیں گزارنا چاہیے بلکہ زندگی کا کوئی مقصد ہونا چاہیے تو وہ مقصد کے ساتھ ساتھ بلندی کی شرط بھی لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مقصد کو اتنا ہی بلند ہونا چاہیے جتنا کہ ثریا نام کا ستارہ بلند ہے۔

اقبال کی اس شرط سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر چہ روپے کمانا، جائیداد خریدنا، مکان بنانا، بیٹے، بیٹیوں کی دھوم دھام سے شادی کرنا یہ سارے کام بھی زندگی کے مقاصد کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اقبال کی مراد ان مقاصد سے نہیں ہے اقبال کی مراد ایسے کاموں اور کارناموں سے ہے جن سے قوم اور انسانیت کو فائدہ پہنچے اور اس کا وقار بلند ہو۔

اقبال کے فلسفہ حیات میں آرزوؤں اور تمناؤں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں ذوق طلب اور سوز آرزو جیسے الفاظ یا ترکیبیں کثرت سے استعمال کی ہیں اس میں شک نہیں کہ انسانی زندگی میں حرکت اور گرمی ذوق طلب اور سوز آرزو سے ہی پیدا ہوتی ہے اس کے بغیر انسان میں بے دلی اور بے حسی آ جاتی ہے جو فرد اور قوم دونوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ یہاں اقبال کے دو شعر یاد رکھیے۔

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ
متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ انسان سب سے پہلے اپنی خودی یا شخصیت کو پہچانے یعنی یہ سمجھے کہ اس میں قدرت نے کس طرح کی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ پھر ان صلاحیتوں کو نوعیت کے مطابق اپنی زندگی کے اعلیٰ مقاصد مقرر کرے اور ان مقاصد سے اتنی لگن (عشق) پیدا کرے کہ ان کو حاصل کئے بغیر نہ رہ سکے۔

اقبال نے بتایا ہے کہ جس طرح عشق (بلند مقاصد کا عشق) انسان کی خودی کو مستحکم (مضبوط) بناتا ہے اسی طرح اس میں سوال کمزوری پیدا کرتا ہے۔ یہاں سوال سے مراد وہ سوال نہیں جو پوچھا جاتا ہے سوال کے معنی مانگنے کے بھی ہوتے ہیں، اسی سے لفظ سائل بنا ہے۔ جس کے معانی مانگنے والا یا فقیر کے ہیں۔ فقیر روٹی کپڑے کا سوال کرتا ہے۔ اہل حیثیت اسے روٹی کپڑا دیتے ہیں۔ تو سوال کا مطلب ہے دوسروں کا محتاج، دست نگر اور احسان مند ہونا۔ خود اقبال نے اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

ذاتی محنت کے بغیر جو کچھ بھی حاصل ہو وہ "سوال" کے ذیل میں آتا ہے ایک امیر آدمی کا بیٹا جو باپ کی کمائی دولت کو ورثے میں پاتا ہے۔ ایک سوالی (مانگنے والا) ہے۔ یہی حیثیت ہر اس شخص کی ہے جو دوسروں کے

خیالات سوچنا (اپنانا) ہے۔ پس خودی کے استحکام کے لئے ہمیں جذبہ محبت، حرکت وعمل کی قوت ضرور پیدا کرنا چاہیے اور سوال یعنی بے عملی کی ہر نوع سے بچنا چاہیے۔

اوپر دیئے ہوئے اقتباس میں اقبال نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ سوال انسان کو بے عملی کی طرف لے جاتا ہے جب کہ عشق عمل کی طرف۔

اقبال کی شاعری اور ان کے نظام فکر میں عمل کی جتنی اہمیت ملتی ہے، اتنی ہی بے عملی کی مذمت بھی۔ اسلئے یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اقبال کی شاعری اور فلسفے میں عمل کی اہمیت پر اتنا اصرار کیوں ہے۔

ہر عمل کی بنیاد کسی نہ کسی فکر یا خیال پر ہوتی ہے لیکن اقبال سوچنے سے زیادہ کرنے پر زور دیتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ ایسا نہیں ہے کہ اقبال فکر کی اہمیت کے قائل نہیں ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے، اپنی خودی کو دریافت کرے اور اپنی خودی میں مضبوطی اور پختگی پیدا کرنے کے لئے بلند مقاصد کی تخلیق کرے تو یہ سارے مرحلے طے ہو جاتے ہیں تو اس کے بعد زندگی صرف عمل کا کھیل بن کر رہ جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی کرنے کی ودیا ہے۔ یعنی زندگی عمل کر کے دکھانے کی چیز ہے، عمدہ سے عمدہ اور شاندار سے شاندار خیال عمل کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ دنیا عمل کی جولان گاہ (گھوڑ دوڑ کا میدان) ہے عمل ہی سے زندگی اچھی بھی بنتی ہے اور بری بھی۔ بقول اقبال۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اپنے آپ کو پہچاننا، اپنی فطری صلاحیتوں کی نوعیت کو سمجھنا، ان کی نوعیت کے مطابق ان کی تربیت اور ان کو بروئے کار لانا (عمل میں لانا) یہی وہ سلسلہ عمل ہے جسے اقبال اپنی زبان میں خودی کا تحفظ، ترقی اور تکمیل کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خودی کی تکمیل عمل کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

عمل انسان کی زندگی اور خودی کے لئے کئی لحاظ سے ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عمل فطری صلاحیتوں کی کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔ اگر قدرت نے کسی آدمی کے اندر شاعر بننے کی صلاحیت نہیں رکھی ہے تو وہ ہزار کوشش کرے شاعر نہیں بن سکتا، لیکن اگر قدرت نے کسی میں شاعر بننے کی صلاحیت رکھی ہے جب بھی وہ اس وقت تک شاعر یا اچھا شاعر نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنی صلاحیتوں کو عمل میں نہ لائے اسی لئے اقبال نے کہا ہے کہ:

ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خداداد
کوشش سے کہاں مرد ہنر مند ہے آزاد

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانہ فرہاد

کسی آدمی کے اندر قدرت نے کن کن باتوں کے امکانات رکھے ہیں اس کا اندازہ عمل ہی سے ہوتا ہے عمل صرف منزل تک پہنچنے کا ذریعہ بلکہ اپنی ذات اور اپنے امکانات کو سمجھنے کا وسیلہ بھی ہے۔

غرضیکہ عمل زندگی کے لئے نہایت ضروری بھی ہے اور حد درجہ مفید کے زندگی کے انعامات پر صرف ان لوگوں کا حق ہے جو رات دن کسی مقصد کے حصول میں لگے رہتے ہیں جو دن کو دن سمجھتے ہیں نہ رات کو رات۔

زندگی اور عمل کے رشتے کو نہ سمجھنے ہی کی وجہ سے دنیا کی بہت سی قومیں زوال و انحطاط کا شکار ہو چکی ہیں۔ ایسی قوموں میں خود مسلمانوں کا شمار بھی ہے، زوال پذیر قوموں کی ایک خصوصیت تن آسانی (کاہلی) ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ تقدیر کے غلط معنی کو بڑی آسانی سے قبول کر لیتی ہے۔ اقبال نے ایک جگہ صاف لفظوں میں کہا ہے کہ

عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانہ

فلسفیانہ نقطہ نظر سے تقدیر کا مسئلہ نہایت دشوار اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں بعض فلسفی انسان کو بالکل مجبور مانتے ہیں اور بعض مختار (صاحب اختیار) تقدیر کے معاملے میں اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان نہ تو

بالکل مختار ہے نہ بالکل مجبور۔ اس سلسلے میں اقبال نے جو اہم نکتہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی مختاری اور مجبوری کی حدیں مقرر اور مستقل نہیں ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ نے انسان کی خودمختاری اور مجبوری کی ایسی حدیں ہمیشہ کے لئے مقرر کردی ہیں جن میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ عمل کی بدولت اختیارات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کی مجبوریاں محدود تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔

یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تصدیق انسان کی تاریخ سے ہوتی ہے۔ انسان کی مسلسل جدوجہد کے ذریعے زمان ومکان (زمانے اور فضائے بسیط یعنی زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ ہے) پر جو فتوحات حاصل کی ہیں۔ جس طرح برسوں کے سفر کو چند گھنٹوں کا سفر بنادیا ہے۔ جس طرح چاند اور دوسرے سیاروں تک جا پہنچا ہے انسان کی ان کامیابیوں نے اس کے اختیارات میں زبردست اضافے کئے ہیں۔ اب انسان اتنا مجبور نہیں رہا جتنا کہ ہزاروں سال پہلے تھا جب نہ اس کے پاس رہنے کے لئے مکان تھا، نہ کھانے کے لئے غلہ نہ پہننے کے لئے کپڑا۔ یہ سب کچھ عمل کی بدولت ممکن ہوسکا ہے۔ عمل ہی سے تقدیر کے راز بھی کھل جاتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک زندگی کی پہچان عمل ہے اور عمل کا صحیح معیار یہ ہے کہ ہر آنے والا دن ہر گزرے ہوئے دن سے بہتر ہو آدمی کو چاہیے کہ زندگی کے سفر میں کسی منزل پر دم نہ لے۔ چنگاری سے ستارے پیدا کرے اور ستارے سے آفتاب۔ غرضیکہ ہمیشہ آگے بڑھتا چلا جائے۔

تو یہ ہے عشق اور عمل کا تعلق۔ یعنی عشق عمل کا محرک ہے اور عمل زندگی کے قافلے کا منزل رساں۔

سوال آدمی کو صرف بے عملی کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ انسان کے کردار میں خودداری اور استغنا (دنیوی مال ودولت سے بے پروائی) جیسے اعلیٰ اوصاف بھی پیدا نہیں ہونے دیتا۔

آنحضرتؐ کہا کرتے تھے الفقر فخری، یعنی فقر میرا فخر ہے۔ فقر کے لغوی (لغت کے اعتبار سے) معانی مفلسی اور ناداری کے ہیں لیکن اس کے مرادی معانی مفلسی اور ناداری کے باوجود احسان قبول کرنے سے احتراز کرنا ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے جہاں سوال کی مذمت کی ہے وہاں فقر کی تعریف کی ہے اور فقر کو انسانی کردار کی روح قرار دیا ہے۔

اقبال جب عشق کو اچھا اور سوال کو برا قرار دیتے ہیں تو اپنے اس خیال کے ذریعے سے وہ اچھے اور برے (خیر و شر) کی پہچان کے لئے ایک کسوٹی پیش کرتے ہیں۔ اقبال کے نقطہ نظر سے ہر وہ چیز اچھی ہے جو انسان کی خودی کو فائدہ پہنچائے اور ہر وہ چیز بری ہے جس سے انسانی خودی کو نقصان پہنچے۔

اقبال اپنی شاعری اور فلسفے میں علم و فن، موسیقی و مصوری، شعر و ادب اور مذہب و تصوف تمام چیزوں کو اسی کسوٹی پر پرکھتے نظر آتے ہیں مثلاً

ے
ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز

ے
سرود شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ

ے
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ے
یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبال نے خودی کی تربیت کے تین درجے بتائے ہیں۔ اول اطاعت، دوم ضبط نفس، سوم نیابت الہی۔

اطاعت کا مفہوم شریعت کے احکام کی پابندی ہے۔ شریعت کے احکام دو طرح کے ہیں ایک وہ جن کو اوامر کہتے ہیں۔ اوامر امر کی جمع ہے۔ اوامر وہ احکام ہیں جن کی تعمیل ضروری ہے۔ نواہی (نہی کی جمع ہے) نواہی سے مراد وہ باتیں ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔

ضبط نفس کے معنی ان کمزوریوں پر قابو پانے کے ہیں جو فرائض کی تعمیل میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

نیابت الٰہی انسانی ارتقاء (ترقی) کی آخری منزل ہے جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ انسان کامل بن جاتا ہے، وہ عشق و عقل، علم و عمل، زور بازو اور گداز قلب کے امتزاج (آمیزش) کا نہایت عمدہ نمونہ ہوتا ہے لیکن انسانی تاریخ میں حضور اکرمؐ کے سوا کوئی شخصیت اس معیار کی ابھی تک پیدا نہیں ہوئی۔ اسرار خودی میں اقبال نے رسول اللہ صلعم اور حضرت علیؓ کی شخصیتوں کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ آج کی دنیا جن مسائل میں گرفتار اور جن جھگڑوں میں مبتلا ہے ان کو وہی شخص حل کر سکتا ہے جس کی خودی نیابت الٰہی کی منزل تک پہنچ چکی ہے۔ نیابت الٰہی کے درجے پر پہنچنے کے معنی دنیا میں اللہ کے قائم مقام ہونے کے ہیں۔ قرآن کریم میں انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ کہا گیا ہے لیکن ہر انسان زمین پر خدا کا خلیفہ نہیں بن سکتا۔ اقبال کے خیال میں تربیت خودی کی صورت میں یہ ممکن ہے۔ اس بلند مقام تک پہنچنے کے لئے بہترین ذہنی اور روحانی صلاحیتوں اور بلند ترین عقل اور اخلاقی خوبیوں کا مالک ہونا ضروری ہے۔ اقبال کے اپنے فلسفہ خودی میں انسان کے جس مثالی کردار کا تصور پیش کیا ہے ممکن ہے انسان کی آئندہ تاریخ میں مثالی کردار کا یہ تصور ایک حقیقت بن جائے۔

۳۔ اقبال کا فلسفہ بے خودی

اقبال نے جس طرح لفظ (خودی) کو ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے اسی طرح ان کے یہاں لفظ بے خودی کا بھی ایک خاص مفہوم ہے، بے خودی کے لغوی معنی ہیں خود رفتگی، مدہوشی، بے خبری لیکن بے خودی سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ جب فرد اپنی خودی کی تعمیر اور تکمیل کے مرحلے طے کر لے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی خودی یا اپنی تربیت یافتہ صلاحیتوں کو اپنی جماعت کے لئے استعمال کرے جب فرد اپنی جماعت یا اپنی ملت سے اپنا رابطہ استوار کرتا ہے تو وہ وہاں سے وہ بے خودی کی منزل میں آجاتا ہے۔ انسان کی ذمہ داریوں میں اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہی ہے کہ اس دنیا میں اسے تنہا بھی رہنا ہے اور جماعت کے ساتھ بھی چلنا ہے اقبال نے اپنے اس خیال کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ایک فارسی شعر میں یوں ادا کیا ہے۔

زندگی انجمن آرا و نگہبان خود است

اے کہ در قافلہ ای بے ہمہ شو با ہمہ رو

ترجمہ: زندگی اپنی نگہبانی بھی کرتی ہے اور انجمن آرائی بھی اے تو کہ قافلے میں ہے سب سے الگ ہو جا اور سب کے ساتھ چل۔

اقبال کے افکار و خیالات میں فرد اور جماعت کا باہمی رشتہ ایک عظیم مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس مسئلے کو انہوں نے جس طریقے سے حل کیا ہے وہ ان کی اعتدال پسندی اور توازن دوستی کا بہترین ثبوت ہے۔ اس مسئلے کو سلجھانے میں دنیا کے بڑے بڑے مفکر انتہا پسندی کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسی نے فرد کو اتنی اہمیت دی ہے کہ فرد کی آزادی ہر جماعت کو قربان کر دیا ہے اور کسی نے جماعت کو اتنے اختیارات دیے ہیں کہ جماعت میں فرد کی ہستی مشین کا ایک چھوٹا سا پرزہ بن کر رہ گئی ہے۔

اقبال فرد کی آزادی اور حریت کے قائل ہیں لیکن وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ فرد کو اپنی بہترین صلاحتیں صرف اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ اپنی جماعت کے لئے استعمال کرنی چاہئیں۔ اسی میں دونوں کا بھلا ہے۔ اقبال نے اپنی نظم ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' (بانگ درا) میں فرد اور جماعت کے رشتے کو بڑی

خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ فرد اور جماعت کے درمیان وہی رشتہ ہے جو درخت اور ڈالیوں کے درمیان ہے۔ ڈالیوں کی سرسبزی اور شادابی اسی وقت تک ہے جب تک ڈالیاں درخت کا حصہ ہیں۔

ڈالیوں میں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی قوت درخت کی جڑوں سے آتی ہے۔ جو ڈالی ٹوٹ جاتی ہے اسکے لئے بہار کا موسم (جو پھلنے پھولنے کا موسم ہے) بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہی حال فرد کا بھی ہے۔ فرد بھی جماعت یا قوم سے ٹوٹ کر اپنی نشو ونما کے امکانات کھو دیتا ہے۔ اقبال نے فرد اور جماعت کے رشتے کو موج اور دریا کے رشتے سے بھی تشبیہہ دی ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اقبال نے اپنی فارسی کتاب (رموز بے خودی) میں قوم کی اجتماعی زندگی کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، (رموز بے خودی) میں جن موضوعات پر نظمیں لکھی گئی ہے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

ملت (قوم) کا وجود افراد کے باہمی ربط کا نتیجہ ہے یعنی قوم افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ اسلام میں قومیت کے بنیادی ارکان دو ہیں۔ توحید اور نبوت یعنی مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد دوسری قوموں کی طرح رنگ و نسل یا زبان و وطن پر نہیں ہے۔ توحید یعنی ایک خدا پر ایمان لانے سے انسان کو بے شمار فائدے پہنچے ہیں۔ انسان ہزاروں قسم کے جھوٹے خداؤں کی پرستش سے بچ جاتا ہے اور تمام انسانوں کو ایک برادری کے طور پر دیکھتا ہے۔ رنگ نسل، یا زبان کے فرق کی بنا پر دوسرے انسانوں سے نفرت نہیں کرتا۔ ناامیدی، غم اور خوف، تمام برائیوں کے سرچشمے ہیں یہ چیزیں زندگی کو برباد کر دیتی ہیں۔ توحید پر ایمان ان تمام امراض کا علاج ہے۔

اسلامی قومیت کی دوسری بنیاد رسالت ہے۔ یعنی آنحضرتؐ کے رسول ہونے پر ایمان۔ ان کی رسالت کا اصل مقصد آزادی، مساوات اور اخوت (بھائی چارہ) کی بنیاد ڈالنا تھا توحید اور رسالت پر مبنی ہونے کی وجہ سے ملت اسلامیہ (یا اسلامی قومیت) زمان و مکان کی حدبندیوں سے بالاتر ہے اسلام میں قوم کی بنیاد مذہب پر ہے نہ کہ وطن پر۔

قومی نظام کسی آئین کے بغیر وجود میں نہیں آتا اور اہل اسلام کا آئین قرآن کریم ہے۔

جب مسلمان زوال کے دور سے گزر رہے ہوں تو انہیں چاہیے کہ مذہب کے بڑے مسائل میں اجتہاد یعنی نئے فیصلوں سے کام نہ لیں بلکہ تقلید سے کام لیں یعنی جو فیصلے پہلے سے موجود ہیں انہی پر عمل کریں۔

قومی کردار کی خوبیاں آنحضرتؐ کے نقش قدم پر چلنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے رسولؐ کی پیروی کریں قومی زندگی ایک مرکز چاہتی ہے۔تمام مسلمانوں کا مرکز حرم شریف ہے۔ مسلمانوں کا قومی اتحاد ایک قومی نصب العین پر منحصر ہے اور وہ نصب العین نظریہ توحید کی حفاظت اور تبلیغ ہے۔

قومی زندگی کی وسعت ان قوتوں کی تسخیر پر منحصر ہے جو نظام عالم میں کارفرما ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عناصر فطرت کو تسخیر کرنے سے قومی زندگی میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔اقبال اس بات کے قائل نہیں تھے کہ مسلمان محکوم و مسکین کی حیثیت سے تسبیح و مناجات میں لگے رہیں اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان اہل مغرب پر قابو پا کر چاند ستاروں تک جا پہنچیں۔

نسل انسانی کا تسلسل امومت (مادریت) پر ہے، امومت کا تحفظ اور احترام اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے کہ عورت کا جتنا اونچا مرتبہ اسلام میں ہے اتنا کسی اور مذہب میں نہیں ہے۔

اوپر کی سطریں محض ایک خاکہ ہیں اس نظام حیات کا جسے اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان بہ حیثیت قوم اختیار کریں۔اس نظام حیات کی بنیاد قرآن کریم پر ہے۔اقبال کا عقیدہ تھا کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن

نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

ترجمہ: اگر تو مسلمان بن کر جینا چاہتا ہے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تو قرآن کے مطابق زندگی بسر کرے۔

اقبال نے مغرب کے جمہوری اور اشتراکی نظام حیات کو اس لئے رد کر دیا کہ ان میں انہیں بہت سی خرابیاں نظر آئیں انہیں مغربی جمہوریت بادشاہت کی بدلی ہوئی شکل محسوس ہوئی اور اشتراکیت خدا اور روحانیت سے خالی نظر آئی۔اسلامی نظام حیات انہیں سب سے زیادہ اس لئے پسند آیا کہ یہ نظام ذات پات، رنگ و نسل کے فرق کو مٹا دیتا ہے۔اس طرح دنیا کے تمام انسانوں کو ایک برادری کے رشتے میں پرو دیتا ہے اور انسانوں میں

صحیح قسم کی برابری (مساوات) پیدا کرتا ہے۔ انسان کو انسان کی خاطر ایثار اور قربانی کا سبق دیتا ہے اور انسان کو انسان کا احترام کرنا سکھاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک صحیح تہذیب و تمدن وہی ہے جس میں انسان، انسان کا احترام کرے اور یہ سمجھے کہ انسان کا مقام آسمان سے بھی بلند تر ہے۔

برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

ترجمہ: انسان کا مرتبہ آسمان سے بلند تر ہے۔ اصل تہذیب انسان کے احترام میں پوشیدہ ہے۔ یہاں تک اقبال کے جو بنیادی نظریات و خیالات پیش کئے گئے ہیں ان سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اقبال کی شاعری کتنے عظیم نظریات و خیالات پر مبنی ہے اور اس لحاظ سے اردو اور فارسی کے دوسرے شاعروں کی شاعری سے کتنی مختلف ہے۔

لیکن اقبال کی شاعری صرف اس لئے اہم نہیں ہے کہ اس میں بڑے اونچے اور گہرے خیالات پائے جاتے ہیں۔ بڑی شاعری میں اونچے اور گہرے خیالات ضرور ہونے چاہئیں لیکن صرف اونچے اور گہرے خیالات بڑی شاعری پیدا نہیں کر سکتے۔ بڑی شاعری کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اونچے اور گہرے خیالات نہایت فنکارانہ انداز میں ظاہر کئے جائیں۔ اقبال کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اعلیٰ درجے کے فنکار بھی ہیں۔ انہوں نے مشکل سے مشکل اور خشک سے خشک فلسفیانہ خیال کو جس قدر شعریت کے ساتھ شاعرانہ اسلوب میں پیش کیا ہے اس کی مثال دنیا کی شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔ اقبال نے شاعری صرف اس لئے نہیں کی کہ قدرت نے شاعرانہ صلاحیتیں عطا کی تھیں، ان کی شاعری ایک بڑے مقصد کی تابع ہے اس میں ایک دائمی دلکشی ہے۔ خیال اور بیان دونوں کے اعتبار سے۔

۴۔ خود آزمائی

۱۔ ان سوالوں کے مختصر جواب لکھیے۔

۱۔ اقبال کو ہم اپنا قومی شاعر کیوں کہتے ہیں؟

۲۔ حکیم الامت کا مطلب کیا ہے؟

۳۔ اقبال شاعر تھے یا فلسفی؟

۴۔ کیا اقبال کو داغ دہلوی کے رنگ کا شاعر کہا جا سکتا ہے؟

۵۔ سر سید احمد خان اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کو کیا تلقین کی؟

۶۔ شبلی نعمانی اور اکبر الہ آبادی مسلمانوں کو کیا احساس دلا رہے تھے؟

۷۔ اقبال سے پہلے مقصدی شاعری کے سلسلے میں آپ کس شاعر کا نام لے سکتے ہیں؟

۸۔ اقبال نے یورپ کے دوران قیام میں مشرق و مغرب کے بارے میں کیا محسوس کیا؟

۹۔ کیا اقبال صرف زوال ملت کے مرثیہ خواں تھے؟

۱۰۔ اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل کا کیا حل تجویز کیا؟

۲۔ دیئے ہوئے الفاظ میں سے صحیح لفظ منتخب کر کے خالی جگہ پر کیجئے۔

۱۔ اقبال نے اپنے فلسفے میں فرد اور جماعت میں .... کو اہمیت دی ہے۔

(فرد، جماعت، دونوں)

۲۔ اقبال نے اپنا فلسفہ خودی اپنی کتاب .... میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

(رموز بیخودی، پیام مشرق، اسرار خودی)

۳۔ اقبال سے پہلے خودی کا لفظ .... کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔

(خود شناسی، تکبر، مدہوشی)

۴۔ اقبال کے نزدیک فرد کو اپنی بہترین صلاحیتیں .... کے لئے وقف کر دینی چاہئیں۔

(اپنی ذات، اپنی قوم، اپنے ماں باپ)

۵۔ اسلام نے عورت کی .... کی حیثیت پر زیادہ زور دیا ہے۔

(بیوی، بہن، بیٹی، ماں)

۶۔ اقبال نے .... پر زور دیا ہے۔

(فکر، عمل، تصوف)

۷۔ انسان کی خودی .... سے کمزور ہو جاتی ہے۔

(قناعت، صبر، سوال)

۸۔ اقبال کے نزدیک انسان .... ہے۔

(مختار، مجبور، کمزور)

۹۔ دورِ زوال میں .... جائز نہیں۔

(لڑائی، بے عملی، اجتہاد)

۱۰۔ ملت اسلامیہ کا نظام .... کے آئین پر مبنی ہے۔

(حدیث، فقہ، قرآن پاک)

۳۔ ذیل میں درست فقرات پر نشان (✓) لگائیے۔

۱۔ خودی کے مسئلے پر اقبال کا مسلمان صوفیوں سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔

۲۔ اقبال نے تربیت خودی کے تین مرحلے مقرر کیے ہیں۔

۳۔ اقبال نے فقر کی مذمت کی ہے۔

۴۔ اقبال کی شاعری میں ذوق طلب سے مراد آرزو اور تمنا ہے۔

۵۔ اقبال نے ہندوستان کے مسائل کا کوئی حل تجویز نہیں کیا۔

۵۔ جوابات

۱۔ (۱) اس لئے کہ ان کی شاعری کا زیادہ تر حصہ مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں ہے۔

(۲) حکیم الامت کے معنی ہیں قوم کا مفکر۔

(۳) اقبال شاعر تھے اور فلسفی بھی۔

(۴) نہیں

(۵) انہوں نے اس بات کی تلقین کی کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ صلح رکھیں، انگریزی زبان سیکھیں اور انگریزی یا مغربی تہذیب سیکھنے میں برائی محسوس نہ کریں۔

(۶) شبلی نعمانی اور اکبر الہ آبادی مسلمانوں کہ یہ احساس دلا رہے ہیں کہ مسلمانوں کی اپنی تاریخ اور تہذیب کتنی شاندار ہے اور یہ کہ انگریزی زبان اور تہذیب کو اپنانے کے نقصانات کیا ہیں۔

(۷) حالی

(۸) دونوں کی حالت خراب ہے۔

(۹) نہیں

(۱۰) تقسیم ہند

۲۔ (۱) دونوں کو (۲) اسرار خودی (۳) تکبر (۴) اپنی قوم کے لئے

(۵) ماں (۶) عمل (۷) سوال (۸) محتاج

(۹) اجتہاد (۱۰) قرآن پاک

۳۔ صحیح فقرے (۲)، (۴)